بسم اللہ الرحمن الرحیم

ل

لَ - (حرف)

لَ - لِ - حسب ذیل معانی پیدا کرنے کے لئے آتا ہے :-

(۱) اِستحقاق - اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (۱/۱) - حمد کا حق صرف اللہ ہی کو حاصل ہے -

(۲) کسی کے لئے کسی چیز کا مخصوص ہونا - وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُوْنَ (۱۶/۵۸) - خصوصیت سے اپنے لئے وہ چیز چاہتے ہیں کہ جو ان کے نزدیک پسندیدہ ہے -

(۳) اظہار ملکیت کے لئے - لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (۱/۳۴) - کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کی ملکیت ہے -

(۴) فائدہ حاصل کرنے کے لئے - وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ (۳۴/۱۰) - ہم نے اس کے لئے لوہے کو نرم کر دیا - یعنی لوہے کو نرم کر دیا تاکہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے (لامِ ملکیت اور لامِ انتفاع کے فرق کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے) -

(۵) سبب ظاہر کرنا (''تاکہ'' کے معنوں میں) - وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ (۱۶/۴۴) - اور ہم نے تیری طرف یہ قرآن کریم نازل کیا ہے تاکہ تو اسے لوگوں کے فائدے کے لئے ظاہر کر دے -

(۶) نفی کی تاکید کے لئے - مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ (۳/۱۷۸) - اللہ تمہیں غیب پر ہرگز مطلع نہیں کرتا -

(۷) اِلٰی (کیطرف) کے لئے ۔ بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَھَا (۹۹/۵) ۔ کیونکہ تیرے رب نے اسکی طرف وحی کی ہے ۔

تک کے معنوں میں ۔ کُلٌّ یَجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی (۱۳/۲) ۔ ہر ایک وقت مقررہ تک چل رہا ہے ۔ دوسری جگہ اِلٰی اَجَلٍ (۳۱/۲۹) آیا ہے جس کے معنی '' وقت مقررہ تک '' ہیں ۔

(۸) عَلٰی (اوپر) کے معنوں میں ۔ وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ (۳۷/۱۰۳) ۔ اور اس نے اسے پیشانی کے ایک کنارے پر (کے بل) لٹایا ۔

مجازی طور پر عَلٰی اسوقت آتا ہے جب کوئی بات کسی کے خلاف جائے ۔ اور ۔ ل ۔ اس وقت آتا ہے جب وہ بات کسی کے فائدے کے لئے ہو۔ جیسے لَھَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶) ۔ '' جو کچھ کوئی اچھا کام کرے وہ اس کے فائدے کے لئے ہے اور جو کچھ کوئی برا کام کرے وہ اسکے خلاف جائیگا ۔ اس کا نقصان اسے ہوگا '' ۔ لیکن بعض اوقات لَ بھی عَلٰی کے معنوں میں آجاتا ہے ۔ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَھَا (۱۷/۷) ۔ اگر تم برائی کروگے تو اسکا نقصان تمہیں ہی ہوگا ۔ یا وَلَھُمُ اللَّعْنَةُ وَلَھُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (۴۰/۵۲) ۔ ان کے لئے محرومی ہے ۔ ان کے لئے بہت برا گھر ہے ۔

(۹) فِیْ (میں) کے معنوں میں ۔ وَنَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ (۲۱/۴۷) ۔ اور ہم قیامت کے دن (قیامت میں) انصاف کی میزانیں کھڑی کرینگے ۔

(۱۰) عِنْدَ (کے پاس ۔ کے قریب) اور بَعْدَ کے مفہوم کے لئے ۔ جیسا کہ بعض کے نزدیک ۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ (۱۷/۷۸) میں لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ سے مراد ہے دلوک شمس کے قریب ۔ یا دلوک شمس کے بعد ۔ لیکن ۔ ل ۔ بعض اوقات مِنْ (سے) کے معنوں میں بھی آتا ہے ۔ اس لئے اسکے معنی دلوک شمس سے لیکر غسق لیل تک بھی ہو سکتے ہیں ۔

(۱۱) مفعول کو واضح کرنے کے لئے ۔ جیسے لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ (۲/۱۵۴) نہ کہو اس شخص کو جو قتل کر دیا جائے ۔

(۱۲) اِنَّ یا قسم کے بعد تاکید کے لئے ۔ لَعَمْرُکَ اِنَّھُمْ لَفِیْ سَکْرَتِھِمْ یَعْمَھُوْنَ (۱۵/۷۲) ۔ تیری عمر* کی قسم ۔ وہ اپنی بد مستی

*دیکھئے عنوان ع ۔ م ۔ ر ۔

میں اندھے ہو رہے تھے - نیز فَوَرَبِّکَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ (۶۹/۱۹) تیرے رب کی قسم ہم بالضرور انہیں اکٹھا کر لائینگے۔

(۱۳) کبھی زائد بھی ہوتا ہے - قرآن کریم میں اسکی بہت سی مثالیں ہیں - جیسے - هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ (۳۶/۲۳) - یہاں مَا تُوْعَدُوْنَ کا بھی وہی مفہوم ہے -

(۱۴) کبھی یہ ابتدائے کلام کے لئے بھی آتا ہے (کہ، کے معنوں میں)۔ اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ .... (۸/۱۲) - جب انہوں نے کہا کہ یوسف اور اسکا بھائی ....

(۱۵) کبھی یقیناً کے معنوں میں (تاکید کے لئے) آتا ہے - لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى (۱۰۸/۹) - یقیناً وہ مسجد کہ جسکی بنیاد ہی تقویٰ پر رکھی گئی ہو -

لَا (حرف)

لَا - نہی کے لئے آتا ہے - لَا تَضْرِبْ - مت مار - اس کے علاوہ ذیل کے معانی کے لئے بھی آتا ہے -

(۱) نفی جنس کے لئے - یعنی جس چیز کی یہ نفی کرتا ہے اس کی پوری کی پوری جنس کی نفی کرتا ہے - لَا رَيْبَ فِيْهِ (۲/۲) - اس میں کوئی شک و شبہ یا اضطراب کی بات نہیں -

(۲) لَيْسَ (نہیں) کے معنوں میں - لَا اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۶۱/۱۰)- نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی - وہ سب ایک واضح کتاب کے اندر ہیں -

(۳) لَا جَرَمَ - محاورہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے - اس کے معنی ہوتے ہیں - ''حق یہ ہے کہ'' - جیسے (۱۶/۲۳) میں -

(۴) کبھی یہ جملے کے شروع میں اسطرح آتا ہے جیسے کسی کی بات کا جواب دیا جا رہا ہو - مثلاً لَا اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ (۹۰/۱) - نہیں! میں اس شہر کو شہادت میں پیش کرتا ہوں -

(۵) کبھی یہ زائد ہوتا ہے - مثلاً مَا مَنَعَكَ اَلَّا (اَنْ + لَا) تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (۷/۱۲) - جب میں نے تجھے حکم دیا تھا تو پھر وہ کونسی بات تھی جس نے تجھے سجدہ کرنے سے منع کردیا - اگر یہاں ''لا'' نہ ہو جب بھی وہی معنی ہونگے - جیسے (۳۸/۷۵) میں ہے - مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ -

اللّاتُ

اللّاتُ ۔ عہد جاہلیت میں طائف میں قبیلہٴ ثقیف کا بت تھا ۔ یہ مؤنث ہے (۵۳/۱۹) ۔ اسلئے اسے دیوی کہنا چاہئے ۔

لات (حرف)

لاتَ ۔ نہیں کے معنوں میں ۔ قرآن کریم میں ہے وَلَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ (۳۸/۳) ۔ خلاصی کا وقت نہیں رہا تھا ۔ بعض نے کہا ہے کہ لات میں لَا نفی (نہیں) کے لئے ہے اور تَاء (تَ) زائد ہے ۔ مگر یہ زائد تاء حِیْنَ کے ساتھ ہی آتی ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ (لَاتَ) فعل ماضی ہے جس کے معنی نَقَصَ کے ہیں ۔ (جیسا کہ ل ۔ ی ۔ ت کے عنوان میں بیان ہوگا) ۔ بعد میں یہ صرف نفی کے لئے استعمال ہونے لگا ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ لَیْسَ ہے ۔ سین کو تاء اور یاء کو الف سے بدل کر لَاتَ بنا لیا ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ایک مستقل لفظ ہے اور نفی کے لئے آتا ہے* ۔

ل أ ل أ

لَألَأَتِ الْمَرْاَۃُ بِعَیْنَیْھَا ۔ عورت نے اپنی آنکھوں کو چمکایا ۔ لَألَأَتِ النَّارُ ۔ آگ بھڑکی اور روشن ہوگئی** ۔ اَللُّؤْلُؤُ ۔ (جمع لَآلِیُٔ) ۔ موتی ۔ کیونکہ وہ چمکدار ہوتے ہیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چمکدار ہونے کے ہیں ۔

سورۃ حج میں جنتی معاشرہ کے اسبابِ زینت میں لُؤْلُؤٌ (۲۲/۲۳) بھی آیا ہے ۔ سونے کے کڑے ۔ موتی ۔ ریشم کا لباس ۔ یعنی سرداریوں اور سرفرازیوں کے تمام نشان و سامان ۔ یہ ہیں جنتی معاشرہ کے سامانِ زینت و اسبابِ آرائش و زیبائش ۔ یعنی وہ معاشرہ جس میں قوت و سطوت اور آسائش و آرائش کے تمام سامان بافراط موجود ہوں اور ان کی تقسیم اور استعمال قوانینِ خداوندی کے مطابق ہو ۔

لئلّا (حرف)

لِئَلَّا ۔ (لِ + اَنْ + لَا) ایسا نہ ہو کہ ۔ یا ۔ تا کہ نہ ۔ لِئَلَّا یَعْلَمَ اَھْلُ الْکِتٰبِ (۵۷/۲۹) ۔ تا کہ اہل کتاب جان لیں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس مثال میں لا زائد ہے ۔

---

* تاج ۔ ** تاج و راغب و محیط ۔

ل ب ب

أَلَبَّ عَلَى الْأَمْرِ - کسی بات پر پختگی سے جما رہا اور اسے نہ چھوڑا - رَجُلٌ لَبٌّ - وہ شخص جو اپنے کام کاج میں لگا رہے اور اسے چھوڑے نہیں - اَللَّبُّ - کسی امر پر قائم رہنے والا ، اسی لئے اسکے معنی قیام کرنے کے بھی ہوتے ہیں - اَلَبَّ بِالْمَکَانِ - اس نے فلاں مقام پر قیام کیا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) جمع رہنے اور ساتھ لگا رہنے اور (۲) خالص اور عمدہ ہونے کے ہیں -

لَبَّیْکَ - میں آپ کی فرمانبرداری کو اپنے اوپر لازم سمجھتا ہوں - میں آپ کی اطاعت پر قائم ہوں - بعض نے کہا ہے کہ یہ دَارِیْ تَلُبُّ دَارَہٗ سے ماخوذ ہے - یعنی میرا گھر اس کے گھر کے سامنے ہے - لہذا لَبَّیْکَ کے معنی ہیں میرا رخ آپ کی طرف ہے * -

لُبٌّ - ہر چیز کے خالص حصے کو کہتے ہیں - نیز مغز ، گری - لَبَّ اللَّوْزَ - بادام کو توڑ کر اس کا مغز نکال لیا * - اَللَّبَبُ - سینہ کا وہ حصہ جس پر ہار پہنتے ہیں * -

اَللُّبُّ عقل کو کہتے ہیں - اسکی جمع اَلْبَابٌ ہے - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ لفظ سریانی کے لِبُوْ یا عبرانی کے لِبْ سے ماخوذ ہے جن کے معنی دل کے آتے ہیں - عربی میں دل کو اَللُّبُّ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ (بادام کے مغز کی طرح) چربی سے ڈھکا ہوا ہوتا ہے ** - راغب نے کہا ہے کہ لُبٌّ تیز اور خالص عقل کو کہتے ہیں جو آمیزش سے پاک ہو *** - (یعنی جو جذبات کی آمیزش سے پاک ہو - جو جذبات کے تابع نہ چلے) -

قرآن کریم نے اُولِی الْاَلْبَابِ (۳/۱۸۹) کو خاص امتیاز کا حامل قرار دیا ہے اور ان کی بڑی تعریف کی ہے - یہ وہ صاحبانِ عقل و بصیرت ہیں جو عقل کو جذبات کی لونڈی بنانے کے بجائے اُس سے وحی کی روشنی میں کام لیتے ہیں - اسطرح یہ عقل ، عقل خود بیں کے بجائے عقلِ جہاں بین بن جاتی ہے - عقلِ خودبیں انسان کو صرف اس کے انفرادی مفاد کے حصول کی راہیں بتاتی ہے اور عقلِ جہاں بیں اُسے نوع انسانی کی ربوبیت عامہ پر آمادہ کرتی ہے - اسی لئے قرآن کریم نے اُولِی الْاَلْبَابِ کے بعد کہا ہے کہ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ . . . . (۳/۱۹۰-۱۸۹) یعنی وہ صاحبانِ عقل و بصیرت جو اٹھتے ،

---

*تاج - **محیط - ***راغب -

بیٹھتے ، لیٹے ، ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں - وحی کی روشنی میں عقل کی آنکھ سے کام لینا ، یہ ہے مومن کا شعارِ زندگی - ان میں سے اگر ایک چیز کی بھی کمی ہو تو وہ مومن نہیں کہلا سکتا -

ل ب ث

لَبِثَ یَلْبَثُ لَبْثًا وَ لُبْثًا و لَبَثًا - رہنا - ٹھہرنا - رکنا - نیز دیر کرنے اور انتظار کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے - اَلتَّلَبُّثُ - توقف - اقامت - توقف کرنے کے معنوں میں (۳۳/۱۴) میں آیا ہے* - لَبِثَ بِالْمَکَانِ - کسی مقام پر جم کر ٹھہرا - وہاں مستقل رہا** - لَابِثٌ - ٹھہرنے والا - قیام کرنے والا - اس کی جمع لَابِثُوْنَ اور لَابِثِیْنَ ہے (۷۸/۲۳) -

مخالفین عرب، نبی اکرمؐ سے آپ کے دعوائے نبوت کی دلیل مانگتے - یعنی وہ کہتے کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ آپ اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہیں - اس کے جواب میں نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِہٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶) - میں نے (دعوائے نبوت سے) قبل، تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے - کیا تم اس سے اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس قسم کی زندگی ایک سچے انسان کی زندگی ہوتی ہے یا جھوٹے کی؟ تم اگر عقل و خرد سے کام لو تو میری زندگی میری صداقت کی زندہ شہادت بن کر تمہارے سامنے آ جائے - میں تم میں کوئی اجنبی نہیں ہوں کہ تمہیں معلوم نہ ہو کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا -

غور کیجئے کہ کسقدر زبردست ہے یہ شہادت جسے نبی اکرمؐ نے اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کیا ہے - ایسی شہادت کہ اس کے خلاف کوئی ایک حرف بھی نہیں کہہ سکتا - سچے کی نشانی یہ ہے کہ وہ (دوستوں کی محفل میں نہیں بلکہ) مخالفین کے بھرے مجمع میں پوری جرأت سے کہہ سکے کہ میری زندگی میری صداقت کا سب سے بڑا ثبوت ہے -

ل ب د

لَبَدَ بِالْمَکَانِ - کسی جگہ قیام کرنا اور اس جگہ سے چمٹ جانا - لِبْدٌ - نمدہ کو کہتے ہیں جس میں اون کو گتھ گتھ کر جمایا جاتا ہے - اسی سے مَالٌ لُبَدٌ کے معنی ہیں کثیر دولت - بہت زیادہ جمع شدہ مال * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا اوپر تلے جمع

* تاج - ** راغب -

ہوتا ہیں ۔ قرآن کریم میں ہے اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا (۹۰/۶) ۔ میں نے بہت سا جمع کردہ مال ضائع کر دیا ۔ اَللِّبَاسُ لُبَدٌ کے معنی ہیں لوگ یکجا جمع ہیں ۔ اوپر تلے اکٹھے ہیں * ۔ قرآن کریم میں ہے یَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا (۷۲/۱۹) ۔ وہ اس پر ہجوم کرکے ٹوٹ پڑے ۔ لَبِدَ الْقَوْمُ بِالرَّجُلِ ۔ لوگوں نے اس آدمی کو گھیر لیا اور اس کے پاس سے نہ ہٹے**۔

ل ب س

لَبَسَ ۔ يَلْبِسُ ۔ لَبْسًا کے معنی ہیں خلط ملط مت کر دینا ۔ مشتبہ کر دینا * ۔ اس کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں ۔ اسی سے خلط ملط کر دینے اور مشتبہ بنا دینے کا مفہوم آگیا ** ۔ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (۲/۴۲) حق اور باطل کو باہم خلط ملط مت کرو ۔ مشتبہ کرنے کے معنوں میں یہ لفظ (۶/۹) میں آیا ہے ۔ وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلْبِسُوْنَ ۔ ''انہوں نے جس اشتباہ میں اپنے آپ کو ڈال رکھا ہے ، ہمارا (قانون مکافات) انہیں اس اشتباہ میں مبتلا رکھیگا'' ۔ لَبِسَ ۔ يَلْبَسُ ۔ لُبْسًا کے معنی ہیں پہننا ۔ اَللُّبُوسُ ۔ اَللِّبَاسُ ۔ جو کچھ پہنا جائے * ۔ اَللِّبَاسُ ۔ شوہر اور بیوی کو کہتے ہیں * ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۲/۱۸۷) ۔ میاں بیوی کا ایک دوسرے کا ساتھ بدن اور لباس کا ساتھ ہے (کہ ان کے درمیان کوئی تیسری چیز حائل نہیں ہوتی ۔ ان میں گہری راز داری ہوتی ہے) ۔ اَللَّبُوْسُ ۔ زرہ اور ہتیار کو بھی کہتے ہیں * ۔ قرآن کریم میں زرہ بنانے کے لئے صَنْعَةَ لَبُوْسٍ آیا ہے (۲۱/۸۰) ۔ لَبِسَ فُلَانٌ امْرَاَةً ۔ فلاں شخص ایک عرصہ تک عورت سے متمتع ہوتا رہا **۔ (ان کا باہمی اختلاط رہا) ۔

اَمْرٌ مُلْبِسٌ اور مُلْتَبِسٌ ۔ مشتبہ امر * ۔ اَلتَّلْبِيْسُ ۔ حقیقت کی پردہ پوشی کرنا اور اسے خلاف واقعہ بنا کر دکھانا ** ۔

بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (۵۰/۱۵) ۔ یہ لوگ حیات نو (نئی پیدائش) کے بارےمیں شبہے میں ہیں ۔ انہیں اس باب میں کچھ (Confusion) سی ہے ۔

قرآن کریم ہر بات کو نکھار کر سامنے لاتا اور ہر شے کو الگ الگ کر کے دکھاتا ہے تاکہ حقیقت کے سمجھنے میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہ رہ جائے ۔ کہیں ابہام نہ ہو ۔ التباس نہ ہو ۔ ہر بات واضح ، کھلی کھلی اور

* تاج ۔ ** محیط ۔

صاف صاف ہو۔ اسکے نزدیک کیتمان حقیقت (حقیقت کو چھپانا) ہی جرم نہیں بلکہ حق کو باطل کے ساتھ مخلوط کرنا بھی جرم ہے (۲/۴۲)۔ لہذا حق کی باطل کے ساتھ مفاہمت (Compromise) کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا ۔ حق ، حق ہے اور باطل ، باطل ۔ دونوں آپس میں مل نہیں سکتے، چہ جائیکہ حق کو چھپایا اور باطل کو حق بنا کر دکھایا جائے ۔ حق کو باطل کے ساتھ ملانے (تلبیس حق و باطل) کے معنی یہ ہیں کہ وحی (قرآن کریم) کے ساتھ غیراز وحی امور کو بھی دین بنا دیا جائے ۔ ہم نے یہی کچھ کر رکھا ہے، اور اس کا نتیجہ بھگت رہے ہیں ۔

ل ب ن

اَللَّبَنُ ۔ دودھ * ۔ (اَللَّبِنُ ۔ اینٹ جس سے عمارت بنائی جاتی ہے) ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشّٰرِبِیْنَ (۱۶/۶۶) ۔ خالص دودھ جو پینے والوں کے لئے خوشگوار ہے ۔

ل ج أ

لَجَأَ وَ الْتَجَأَ اِلَیْہِ ۔ اس نے اس کی طرف پناہ لی ۔ اَلْجَاَہٗ اِلٰی کَذَا ۔ اسے کسی چیز کی طرف مجبور کیا ۔ اَلْجَاَ فُلَانًا ۔ اس نے فلاں کو بچا لیا ۔ اپنی حفاظت میں لے لیا** ۔ تَلَجَّاَ مِنْھُمْ ۔ وہ ان سے الگ اور ان کے زمرہ سے علیحدہ ہوکر دوسرے لوگوں کی طرف مائل ہوگیا* ۔ اَلَّلجَأُ وَ الْمُلْتَجَأُ ۔ جائے پناہ ۔ بچنے اور محفوظ رہنے کی جگہ* (۹/۵۷) ۔

ل ج ج

اَللُّجُّ وَ اللُّجَّۃُ ۔ گہرا پانی ۔ لُجُّ الْبَحْرِ ۔ دریا کے درمیان وہ گہرے پانی کا مقام جہاں سے اس کا کنارہ نظر نہ آئے ۔ بَحْرٌ لُجَاجٌ ۔ وسیع گہرے پانی والا دریا ۔ اَللَّجَاجُ ۔ جھگڑے میں بڑھتے چلے جانا ، خواہ اپنی غلطی بھی واضح کیوں نہ ہو جائے ۔ جھگڑے یا مخالفت کرنے میں برابر اصرار کئے جانا** ۔ اس سے فعل لَجَّ فِی الْاَمْرِ استعمال ہوتا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا اپنے اجزاء پر بار بار پلٹنا اور پلٹانا ہیں ۔ اَللَّجَاجُ ۔ اصرار کو کہتے ہیں ۔ لُجُّ الْبَحْرِ ۔ سمندر کے بڑے حصے کو اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں سمندر کے اجزاء اوپر تلے پلٹتے رہتے ہیں ۔

*تاج ۔ **تاج و محیط ۔

راغب نے لَجَّةٌ کے معنے بار بار پلٹنے اور آتے رہنے کے کئے ہیں اور اس سے لَجَّةُ الْبَحْرِ کے معنے سمندر کی موجوں کے بار بار آنے اور پلٹنے کے ہیں۔ نیز اس نے لِجَاجٌ کے معنے منع کئے ہوئے کام سے باز نہ آنے اور اسے کرتے چلے جانے کے کئے ہیں**۔

سورۃ ملک میں ہے۔ بَلْ لَجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّ نُفُوْرٍ (۶۷/۲۱)۔ وہ اپنی نفرت اور سرکشی میں موج در موج آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ سورۃ نمل میں ہے۔ حَسِبَتْهُ لُجَّةً (۲۷/۴۴)۔ اس نے اسے گہرا پانی سمجھا۔ سورۃ نور میں ہے بَحْرٍ لُّجِّیٍّ (۲۴/۴۰)۔ گہرا اور وسیع سمندر۔

ل ح د

اَللَّحْدُ۔ وہ گڑھا یا شگاف جو قبر کے ایک پہلو میں عرضاً کھود کر بنایا جاتا ہے اور اس میں مردہ دفن کیا جاتا ہے۔ (برخلاف ضَرِیْحٌ کے جو درمیان میں کھودا جاتا ہے)۔ لہذا، بقول ابن فارس، اس مادہ کے بنیادی معنی درمیان سے ہٹ کر ایک طرف کو مڑ جانا ہیں۔ لَحَدَ اِلَیْهِ۔ وہ اس کی طرف مائل ہوگیا۔ جھک گیا*۔ یہی معنی اِلْتَحَدَ اِلَیْهِ کے ہیں**۔ اَلْحَدَ۔ وہ دین حق سے مڑا اور ہٹا۔ اَلْاِلْحَادُ کے اصل معنے مڑنا، ہٹنا اور جھک جانا ہیں۔ درمیانہ روی کو چھوڑ کر ظلم کی طرف مائل ہونا*۔ سورۃ اعراف میں ہے اَلَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْ اَسْمَآئِهٖ (۷/۱۸۰)۔ جو لوگ صفات خداوندی کے بارے میں اعتدال سے ہٹ کر ایک طرف کو جھک جاتے ہیں (جیسے عیسائی، کہ انہوں نے خدا کو صرف رحم کا پیکر تصور کرلیا اور اس کے قانونِ مکافات سے الگ ہٹ گئے) اسی کا نام غلوفی الدین ہے (۴/۱۷۱)۔ دوسری جگہ ہے۔ اَلَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْ اٰیٰتِنَا (۴۱/۴۰)۔ جو لوگ ضابطۂ خداوندی میں الحاد برتتے ہیں۔ اعتدال کی راہ چھوڑ کر ایک طرف کو ہٹ جاتے ہیں۔ انحراف کرتے ہیں۔ سورۃ حج میں ہے وَ مَنْ یُّرِدْ فِیْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ (۲۲/۲۵)۔ جو کوئی اس میں ظلم کے ساتھ کجروی اور بے باکی کا ارادہ کرے۔ جو سیدھے راستے سے ہٹ کر اسے (کعبہ کو) غلط مقاصد کے لئے استعمال کرنے لگ جائے۔ سورۃ نحل میں ہے۔ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ......(۱۶/۱۰۳)۔ وہ شخص جس کے متعلق یہ اعتراضاً کہتے ہیں کہ وہ رسول اللہؐ کو قرآن کریم سکھا جاتا ہے، اس کی زبان (تو عجمی ہے)۔ یہاں اَلْحَادٌ کے معنی ہیں کسی غلط بات کو کسی کی طرف بطور اعتراض منسوب کرنا۔ یعنی راستی سے ہٹ کر، کسی کی طرف غلط بات کو منسوب کر دینا۔

---

*تاج۔ **راغب۔

مُلْتَحَدًا (۱۸/۲۷) پناہ گاہ۔ وہ جگہ جسکی طرف انسان (اپنے راستے سے ہٹ کر) پناہ کے لئے جائے۔ سرنگ یا زمین دوز راستہ کو بھی کہتے ہیں*۔

سورۃ اعراف کی جس آیت کو اوپر درج کیا گیا ہے اُسے ایک بار پھر سامنے لائیے کیونکہ وہ ایک عظیم حقیقت کو بے نقاب کرتی ہے۔ پوری آیت یوں ہے۔ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا۔ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِىْ اَسْمَآئِهٖ۔ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۷/۱۸۰)۔ تمام صفات پورے اعتدال اور تناسب کے ساتھ، اللہ کے لئے ہیں۔ اُسے انہی صفات کے ساتھ پکارو۔ اور جو لوگ اس کی صفات میں (اعتدال سے ہٹ کر) کسی ایک طرف نکل جاتے ہیں، انہیں چھوڑ دو۔ انہیں ان کی اس غلط روش کا نتیجہ بہت جلد مل جائیگا۔

خدا کی ذات تمام صفات کی حامل ہے، اور وہ صفات انتہائی اعتدال اور تناسب کے ساتھ اس میں جمع ہیں۔ تم ان صفات کو خود اپنی ذات میں اجاگر کرتے جاؤ لیکن اسی اعتدال و تناسب کے ساتھ۔ جو لوگ صفاتِ خداوندی کے تو قائل ہیں لیکن ان میں اعتدال اور تناسب کو ملحوظ نہیں رکھتے، وہ ملحد ہیں۔ تمہارا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کی اس غلط روش کا نتیجہ ان کے سامنے آجائے گا۔ تم نے ان کی پیروی نہ کرنا۔

غور کیجئے کہ یہ کتنی بڑی حقیقت ہے جسے سامنے لایا گیا ہے۔ ملحد وہ نہیں جو خدا کی ذات یا اس کی صفات کا منکر ہے۔ ملحد وہ ہے جو انہیں مانتا ہے لیکن کسی ایک صفت میں افراط سے کام لیکر تناسب کو بگاڑ دیتا ہے۔ یہ غلط روش ہے۔ اسلام کے معنی یہ ہیں کہ صفات ہوں یا قوانین (۲/۲۰۸) دونوں میں پورے پورے تناسب کو قائم رکھا جائے۔

ل ح ف

اَللِّحَافُ۔ سردی میں جس کپڑے کو اوڑھا جائے اور اس میں لپٹا جائے۔ لحاف، کمبل وغیرہ جو تمام کپڑوں کے اوپر اوڑھے جاتے ہیں*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی لپٹ جانے، ساتھ چمٹے اور لگے رہنے کے بتائے ہیں۔ لَحَفَهٗ۔ اس نے اسے لحاف سے ڈھانپ دیا۔ اِلْتَحَفَ بِهٖ۔ وہ اس میں لپٹ گیا*۔

سورہ بقرہ میں ہے۔ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (۲/۲۷۳)۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔ مانگتے ہوئے چمٹ نہیں جاتے۔ استعارۃً اسکے معنی ہوتے ہیں کسی کام کو بہت مبالغہ (شدت اور زیادتی) سے کرنا**۔

*تاج۔ **راغب۔

ل ح ق

لَحِقَہٗ ۔ یَلْحَقُہٗ ' وَ اَلْحَقَہٗ ' اَلْحَاقًا ۔ کسی چیز کو پا لینا ۔ اس سے جا ملنا ۔ اَلْحَقَہٗ بِہٖ ۔ اسے اس کے پیچھے لگایا ، اس سے ملا دیا ۔ یہ لازم اور متعدی دونوں طرح مستعمل ہے ۔ اَلْمُلْحَقُ ۔ وہ آدمی جو اپنے خاندان کو چھوڑ کر کسی دوسرے خاندان کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہو ۔ لہذا اس کے معنی کسی کے ساتھ مل جانے کے ہیں ۔ تَلَاحَقَتِ الرِّکَابُ ۔ سواریاں ایک دوسرے سے ملتی چلی گئیں * ۔ سورہ یوسف میں حضرت یوسفؑ کی دعا ہے ۔ وَاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (۱۲/۱۰۱) ۔ مجھے صالحین کے ساتھ ملا دے ۔ مجھے ان کے زمرے میں شامل کر دے ۔ سورہ جمعہ میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے کہ وہ اپنے مخاطبین کے لئے بھی رسول ہیں ۔ وَّاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ (۶۲/۳) ۔ اور ان اقوام کے لئے بھی جو ابھی ان سے نہیں ملیں ۔ یعنی ان کے بعد آنے والی اقوام ۔ اس لئے کہ حضورؐ خاتم النبیین ہیں اور تمام نوع انسانی کے لئے رسول ہیں ۔ اس لئے آپ کی رسالت تمام آنے والی اقوام کے لئے بھی اسی طرح ہے جسطرح اسوقت کی مخاطب قوم کے لئے تھی ۔ اس لئے حضورؐ کے بعد کسی اور نبی کے آنے کا عقیدہ باطل اور قرآن کریم کے یکسر خلاف ہے ۔

ل ح م

لَحْمَۃٌ ۔ قرابت ۔ رشتہ داری ۔ نیز کپڑے کا بانا ، جو تانے کے ساتھ ملکر کپڑا بناتا ہے ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز میں گھسنا اور گتھ جانا بتائے ہیں ۔ گوشت کو اَللَّحْمُ اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کے اجزاء باہمدگر پیوست ہوتے ہیں ۔ اَلْمَلْحَمَۃُ ۔ گھمسان کا رن ۔ قتل وغارتگری کا بڑا واقعہ ** ۔

قرآن کریم میں لَحْمُ الْخِنْزِیْرِ (سؤر کے گوشت) کی حرمت آئی ہے ۔ (۲/۱۷۳) ۔ اَللَّحِمُ ۔ وہ گھر جہاں لوگوں کی بہت غیبتیں کی جائیں ** ۔ قرآن کریم نے بھی غیبت کو " مردہ بھائی کے گوشت کھانے سے " تشبیہ دی ہے ۔ (۴۹/۱۲) ۔ لَحْمٌ کی جمع لُحُوْمٌ ۔ آئی ہے ۔ (۲۲/۳۷) ۔

ل ح ن

اَللَّحْنُ ۔ اس مادہ کے اصلی معنی ہوتے ہیں صحیح جہت اور راہ اعتدال سے کسی ایک طرف کو مڑجانا یا مائل ہو جانا * ۔ اور اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے

*تاج و راغب و محیط ۔ **تاج ۔

کہ بات کو اس کے صحیح اسلوب اور مستعمل طریقہ سے ہٹا دینا ۔ اسکی ایک شکل یہ ہے کہ خفیہ طور پر بعض الفاظ کے خاص معنی مقرر کر لئے جائیں ۔ جب وہ لفظ بولا جائے تو عام لوگ اس کا مطلب اور لیں اور جسے وہ خاص معنی معلوم ہیں وہ اس کا مطلب دوسرا لے۔ اسکی دوسری شکل یہ ہے کہ خود لفظ کی ہیئت میں تبدیلی کر دی جائے ۔ اور تیسری شکل یہ کہ الفاظ کا مفہوم بدل دیا جائے ۔ یا انہیں بطور تعریض استعمال کیا جائے ۔ اسی سے ایسے آدمی کو جو بہت ذہین ہو اور تعریض سے صحیح مقصود سمجھ جائے لَحِنٌ* کہدیتے ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) کسی چیز کو اس کے صحیح رخ سے موڑ دینا ۔ اور (۲) ذہانت اور ذکاوت ۔

قرآن کریم میں منافقین کے متعلق ہے کہ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ (۴۷/۳۰) یعنی وہ جسطرح الفاظ کو موڑ توڑ کر کہتے ہیں اور صریح مفہوم کو چھوڑ کر کلام کا تعریضی مفہوم لیتے ہیں ، اس سے وہ پہچانے جا سکتے ہیں ۔ چنانچہ یہودیوں کے متعلق سورہ نساء میں ہے يَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ (۴/۴۶) ۔ اسی قسم کی ذو وجہین باتیں منافقین کیا کرتے تھے ۔

اَللَّحْنُ ۔ زبان اور بولی کو بھی کہتے ہیں ۔ اور پڑھنے میں غلطی کرنے کو بھی چنانچہ لَاحِنٌ* ۔ غلط بولنے والے کو کہتے ہیں ۔ قَدْ لَحَنَ لَهُ لَحْنًا کے معنی ہیں اس نے اس سے اشاروں کنایوں میں اسطرح بات کی کہ وہ تو بات سمجھ جائے لیکن کوئی دوسرا آدمی نہ سمجھ سکے*** ۔

ل ح ی

لَحْیٌ* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی دو ہوتے ہیں ۔ (۱) بدن کا ایک ٹکڑہ یعنی جبڑا ۔ اور (۲) کسی چیز کو چھیل دینا ۔ چنانچہ اَللِّحَاءُ درخت کی چھال کو کہتے ہیں ۔ اَللِّحْيَةُ ۔ ڈاڑھی ۔ اَللَّحْیُ ۔ جبڑا ۔ ڈاڑھی اُگنے کی جگہ ۔ لَحَيْتُ فُلَانًا اَلْحَاهُ ۔ میں نے اسکو ملامت کی ۔ لَاحٍ ۔ ملامت گو ۔ مَلْحِيٌّ ۔ ملامت کردہ شخص ۔ لَاحَاهُ مُلَاحَاةً ۔ اس نے اس سے جھگڑا کیا ۔ ایک دوسرے کو برا بھلا کہا ۔ لعنت ملامت کی* ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي (۲۰/۹۴) اس کے لفظی معنی ہیں میری ڈاڑھی مت پکڑ ۔ اور مفہوم یہ ہے کہ میری ملامت مت کر ۔ ہماری زبان میں بھی ڈاڑھی نوچنا یا نچوانا اور پگڑی اچھالنا انہی معنوں میں بولتے ہیں ۔

*تاج و محیط ۔ **راغب ۔ ***تاج ۔

اگرچہ سورہ اعراف میں جو ہے وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗ اِلَیْهِ (۷/۱۵۰)۔ ''اس نے اپنے بھائی کے سر کو پکڑا اور اسے اپنی طرف کھینچا''۔ تو اس سے زبانی ملامت کے ساتھ ہاتھوں کی حرکت کا بھی اشارہ ملتا ہے۔

ل د د

اَلَدُّ کے اصلی معنے ایسے شخص کے ہیں جس کی گردن کا پہلو بڑا سخت ہو اور اس کی وجہ سے اسے اس کے ارادہ سے موڑا نہ جاسکے۔ اس سے مراد ایسا شخص ہے جو بڑا جھگڑا لو اور خود سر ہو اور کسی کی بات مانے ہی نہیں۔ اسکی جمع لُدٌّ آتی ہے *۔ اَللَّدِیْدَانِ۔ گردن کے دونوں پہلو جو کانوں کے نیچے ہوتے ہیں **۔ نیز وادی کے دونوں کنارے۔ اس نہج سے لُدٌّ کے معنی ''حق سے ہٹے ہوئے'' (جمع) آتے ہیں۔ نیز بات کو نہ سننے والے بہروں کو بھی کہتے ہیں۔ جھگڑا لو بھی گویا بہرہ ہوتا ہے، دوسرے کی نہیں سنتا اور اپنی کہے جاتا ہے۔ اِلْتَدَّ عَنْهُ۔ وہ اس سے ہٹ گیا۔ لَدَدْتُهٗ۔ میں نے اسے بہت جھگڑا لو پایا **۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے (۱) جھگڑا کرنا۔ اور (۲) کسی چیز کا کنارہ ہیں۔

سورۃ بقرہ میں ہے هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (۲/۲۰۴)۔ وہ بہت ہی سخت جھگڑا لو ہے۔ سورۃ مریم میں قَوْمًا لُدًّا (۱۹/۹۷) آیا ہے۔

لَدُنْ (لَدٰی)

لَدُنْ۔ پاس۔ نزدیک۔ مِنْ لَدُنْ۔ طرف سے۔ ہاں سے۔ مِنْ لَدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ (۱۱/۱)۔ خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے۔

ہمارے ہاں (تصوف میں) ''علمِ لدنی'' کی ایک اصطلاح رائج ہے جس کا مطلب ہوتا ہے وہ علم جو کوئی شخص براہ راست خدا سے حاصل کرے۔ مفہوم اس سے کشف یا الہام ہوتا ہے۔ جیسا کہ اِلْہَامٌ (ل۔ ہ۔ م کے عنوان) میں لکھا گیا ہے، ختمِ نبوت کے بعد الہام یا کشف کا تصور غیر قرآنی ہے۔ اب انسان جو علم خدا سے براہ راست حاصل کرتا ہے وہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی شخص خدا سے براہ راست علم حاصل نہیں کر سکتا۔ خدا سے براہ راست علم کا نام وحی ہے جس کا سلسلہ نبی اکرمؐ پر ختم ہو گیا۔

---

* راغب۔ ** تاج۔

لَدَیٰ ۔ لَدُنْ کے معنوں میں آتا ہے ۔ لَدَی الْحَنَاجِرِ (۴۰/۱۸) ۔ گلوں تک ۔ حلق کے نزدیک ۔ حلق کے پاس ۔ لَدَا الْبَابِ (۱۲/۲۵) ۔ دروازہ کے قریب ۔

ل ذ ذ

اَللَّذَّۃُ ۔ خواہش ۔ وہ مزہ جو طبیعت و مزاج کے مطابق ہو ۔ اَلَمٌ کی ضد ہے ۔ لَذَّہٗ ۔ لَذَّبِہٖ ۔ اس نے اسے لذیذ پایا* لذیذ سمجھا ۔ قرآن کریم میں ہے وَ تَلَذُّ الْاَعْیُنُ (۴۳/۷۱) ۔ اس سے آنکھیں لذت یاب ہوتی ہیں ۔ اَللَّذَّۃُ بمعنی لذیذ بھی آتا ہے ، قرآن کریم میں ہے لَذَّۃٍ لِلشّٰرِبِیْنَ (۳۷/۴۶) پینے والوں کے لئے لذیذ ۔ صاحب محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ کسی مناسب و موافقِ طبع چیز کے ، اس حیثیت سے کہ وہ موافق طبع ہو ، ادراک کر لینے کو لَذَّۃٌ کہتے ہیں ۔ مثلاً قوت ذائقہ کے لئے شیرینی کا مزہ الخ ....** ۔

ل ز ب

لَزْبٌ کے بنیادی معنی کسی چیز کے قائم اور ثابت رہنے ، جمے رہنے اور ساتھ لگے رہنے کے ہوتے ہیں ۔ لَازِبٌ ۔ لازم کو کہتے ہیں ۔ (ابن فارس) ۔ اَللُّزُوْبُ ۔ چمٹنا ۔ طِیْنٍ لَازِبٍ (۳۷/۱۱) ۔ چمٹنے والی مٹی ۔ اَللَّازِبُ ۔ وہ چیز جو کسی کے ساتھ جم جائے ۔ اس سے چمٹ جائے ، اور اس پر ثبت ہو جائے ۔ لَزِبَ الطِّیْنُ ۔ مٹی جم گئی اور سخت ہو گئی ۔ اَللَّزْبَۃُ ۔ سخت قحط سالی کو کہتے ہیں جو شدید طور پر چمٹ جاتی ہے*** ۔ (کیونکہ مصیبت کے دن جلدی نہیں گذرا کرتے) ۔

انسانی تخلیق کے سلسلہ میں سورۃ الصافات میں ہے کہ اسے طِیْنٍ لَازِبٍ سے پیدا کیا گیا ہے (۳۷/۱۱) ۔ جب مٹی پانی کے ساتھ ملتی ہے تو اس میں زندگی کے اولین جرثومہ کی نمود ہوتی ہے ۔ جیسے جوہڑوں کے کنارے چپچپی مٹی سے چھوٹے چھوٹے جرثومے (Life - Cells) پیدا ہو جاتے ہیں ۔ ان سے زندگی (Life) ارتقائی طور پر اوپر کو ابھرتی ہوئی پیکر انسانی میں آگئی ہے ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ''ابلیس و آدم'' میں عنوان ۔ انسان) ۔

ل ز م

لَزِمَ ۔ یَلْزَمُ ۔ لُزُوْمًا ۔ کسی چیز کا جمنا ، ہمیشہ رہنا ، ساتھ لگے رہنا اور جدا نہ ہونا ۔ اَلْمِلْزَمُ ۔ شکنجہ ۔ اَلْمُلَازِمُ ۔ کسی کے ساتھ لگا

*تاج ۔ **محیط ۔ ***تاج و راغب ۔

رھنے والا - نیز گلے ملنے والے کو بھی کہتے ھیں* - لَزِمَ الشَّیْئُ - چیز ثابت اور دائم رھی - لَزِمَ الْمَالُ فُلَانًا - فلاں آدمی پر مال واجب ھوگیا**- لُزُوْمُ الشَّیْئِ - کسی شے کا طویل عرصہ تک رھنا***- اَلتِّزَامٌ جو چیز آکر چپک جائے اور پھر الگ نہ ھو- (۲۵/۷۷) -

قرآن کریم میں ھے کہ حضرت نوح ؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ جو دعوت تم پر صاف اور واضح نہ ھوئی ھو اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كَارِهُوْنَ (۱۱/۲۸) کیا میں اسے زبردستی تمہارے گلے منڈھ سکتا ھوں؟ سورۃ فتح میں ھے وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى (۴۸/۲۶)- اس نے انہیں تقوی کی بات پر لگا دیا یعنی انہوں نے تقوی اختیار کرلیا - وہ اس پر مضبوطی سے جم گئے- سورۃ طٰہٰ میں عذابِ خداوندی کے متعلق ھے - لَكَانَ لِزَامًا (۲۰/۱۲۹) - وہ ان کے ساتھ آکر چپک جانے والا تھا -

ل س ن

اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کی ایسی لمبائی کے ھیں جو نہایت لطیف ھو اور منقطع نہ ھو (ابن فارس) - لِسَانٌ (جمع اَلْسِنَةٌ) - زبان (Tongue) - (۹۰/۹) - لغت (Language) (۱۴/۴) - قوتِ گویائی* (۲۸/۳۴) -

سورۃ مریم میں حضرات انبیاء کرام ؑ کے تذکرہ کے بعد فرمایا - وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا (۱۹/۵۰) - صاحبِ تاج کے نزدیک یہاں لِسَانٌ کے معنی تعریف و توصیف ھے - یعنی انہیں ایسا مقام عطا کر دیا کہ دنیا ان کا نام مدح و ستائش سے لیتی ھے - یا یہ کہ انہوں نے ھمیشہ خدا کی صداقتوں کو بلند کیا اور دنیا کے سامنے صدق کو پیش کیا -

قرآن کریم نے اختلافِ الوان و السنہ کو خدا کی نشانیاں قرار دیا ھے (۳۰/۲۲) - دنیا کی مختلف زبانوں کے متعلق تحقیقات کا سلسلہ تو ایک مدت سے جاری تھا لیکن ھمارے زمانہ میں (Language) نے زبان سے آگے بڑھ کر فلسفہ کی سی حیثیت اختیار کرلی ھے ، جیسے (Ernst Cassirer) کے الفاظ میں (The Philosophy of Symbolic Forms) کہا جاتا ھے****- اس فلسفہ کی رو سے ''زبان'' کے متعلق عجیب و غریب حقائق منکشف ھو رھے ھیں - علاوہ بریں ، ڈاکٹر بک (Bucke) نے اپنی کتاب (The Cosmic Consciousness) میں زبانوں کے تجزیہ سے قوموں کی تہذیب و ثقافت کے متعلق جو اصول بیان کئے ھیں ان سے بھی یہ

*تاج - **محیط - ***راغب- ****یہ خود (Cassirer) کی ایک کتاب کا بھی نام ھے -

حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ اختلافِ السنہ کس طرح آیَۃٌ مِنْ آیَاتِ اللّٰہِ ہے۔ ابھی ان علوم کی ابتدا ہے۔ جب ان کی تحقیقات کا سلسلہ آگے بڑھا تو پھر قرآن کریم کے یہ حقائق اور بھی اُبھر کر سامنے آجائینگے۔

ل ط ف

لَطَفَ۔ یَلْطُفُ کے معنی ہیں کسی سے نرمی اور مہربانی سے پیش آنا۔ اور لَطُفَ۔ یَلْطُفُ کے معنی ہیں کسی چیز کا چھوٹا اور باریک ہونا *۔ اَللَّطِیْفُ۔ خدا کے اسمائے حسنٰی میں سے ہے۔ اسکے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ خفیف اور دقیق امور تک سے واقف ہے اور یہ بھی کہ وہ انسانوں کو راہ نمائی دینے میں نہایت لطیف انداز اختیار کرتا ہے اور نرمی اور مہربانی کا برتاؤ کرتا ہے**۔ صاحب محیط نے اس کے معنی صاف اور شفاف کے بھی لکھے ہیں ***۔ خدا کے لطیف ہونے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اس کا قانون تدریج و امہال محسوس نہیں ہوتا۔ درخت بڑھتا ہے۔ اس سے پتے نکلتے ہیں۔ پھل لگتے ہیں۔ سورج " چلتا ہے "۔ ساری کائنات میں تغیرات کا سلسلہ جاری ہے۔ ارتقاء ہو رہا ہے۔ اعمال اپنے نتائج مرتب کر رہے ہیں۔ لیکن ان تمام حرکات، اعمال اور تغیرات کی رفتار ایسی غیر مرئی اور غیر محسوس ہوتی ہے کہ کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا۔ یہ سب کچھ نہایت لطیف انداز سے واقع ہوتا رہتا ہے۔

اَللَّطِیْفُ مِنَ الْکَلَامِ۔ بڑی لطیف اور دقیق بات *۔ اَللَّطَائِفُ۔ وہ باتیں جن کا ادراک انسانی حواس نہ کر سکیں**۔

سورہ انعام میں ہے۔ لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (۶/۱۰۴)۔ انسانی نگاہیں خدا کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ اور وہ تمام نگاہوں کا احاطہ کرتا ہے۔ (اس لئے کہ) وہ لطیف و خبیر ہے۔ یہاں سے اَللَّطِیْفُ کے معنی واضح ہو گئے۔ یعنی باریک بیں۔

سورہ کہف میں ہے کہ اصحاب کہف نے کہا کہ ہم میں سے ایک آدمی بستی کیطرف جائے اور وہاں کے حالات کا پتہ کرے اور کچھ کھانے کے لئے لائے۔ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا (۱۸/۱۹)۔ وہ احتیاط اور ہوشیاری سے کام لے تاکہ کسی کو تمہارا پتہ نہ لگ جائے۔ اس سے بھی لُطْفٌ کا مفہوم سامنے آجاتا ہے۔ یعنی کسی کام کو غیر محسوس طور پر سرانجام دینا۔

---

*تاج۔ **راغب ***محیط۔

ل ظ ی

اَللَّظٰی۔ آگ یا آگ کا شعلہ۔ راغب نے اسکے معنے آگ کا خالص شعلہ بتائے ہیں۔ یعنی جس میں دھوئیں کی آمیزش نہ ہو۔ لَظِیَتِ النَّارُ وَ تَلَظَّتْ۔ آگ بھڑک اٹھی *۔

قرآن کریم میں ہے۔ کَلَّا اِنَّھَا لَظٰی (۷۰/۱۵)۔ شعلہ انگیز آگ۔ دوسری جگہ نَارًا تَلَظّٰی (۹۲/۱۴) آیا ہے۔ یعنی ایسی آگ جو بھڑک رہی ہے۔

ل ع ب

اس مادہ کی اصل لُعَابٌ ہے جو منہ سے بہنے والی رال کو کہتے ہیں۔ لَعِبَ فُلَانٌ۔ اس نے بغیر صحیح مقصد کے کام کیا **۔ صاحب محیط نے اس کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ایسے کام کرنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے جس سے قطعاً کوئی فائدہ نہ ہو۔ نیز اس کے معنی ہیں غیر موزوں کاموں سے دلبستگی پیدا کرنا اور اس سے مسرت حاصل کرنا۔ یا سود مند چیزوں کو چھوڑ کر غیر سود مند چیزوں کی طرف لگ جانا ***۔ لَاعِبٌ۔ کھیل کھیلنے والا ****۔ لَعِبٌ، جِدٌّ کی ضد ہے جِدٌّ کے معنی ہوتے ہیں کسی کام کو (Seriously) کرنا۔ لہذا، لَعِبٌ کے معنی ہوئے کسی معاملہ میں (Serious) نہ ہونا۔ لَعِبَ بِنَا التَّمَوُّجُ۔ اُسوقت کہتے ہیں جب موجیں کشتی کو منزل مقصود کیطرف نہ لے جائیں۔ اس بنا پر، لَعِبٌ کے معنی یہ ہوں گے کہ حرکت تو ہو لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلے۔ قدم تو اٹھیں لیکن منزل قریب نہ آئے۔ بلا مقصد کام، بلا نتیجہ عمل۔ اِنَّمَا اَنْتَ لَاعِبٌ۔ تم یونہی مذاق کر رہے ہو۔ تم اسے سنجیدگی سے (Seriously) نہیں لے رہے ****۔

لَعِبٌ کے ساتھ لَھْوٌ کا عنوان (ل۔ ھ۔ و) بھی دیکھئے۔ کلیات میں ہے کہ لَھْوٌ حق سے روگردانی کو کہتے ہیں اور لَعِبٌ باطل کی طرف متوجہ ہو جانے کو ***۔

سورہ مائدہ میں ہے کہ جو لوگ تمہارے دین کو ھُزُوًا وَ لَعِبًا لیتے ہیں (۵/۵۷) انہیں اپنا دوست نہ بناؤ۔ یعنی جو اسے سنجیدگی سے (Seriously) نہیں لیتے۔ سورہ انعام میں ہے وَذَرْھُمْ فِیْ خَوْضِھِمْ یَلْعَبُوْنَ (۶/۹۲) " تو انہیں چھوڑ دے کہ یہ اپنی بیہودہ باتوں سے (زندگی سے) کھیلتے رہیں "۔ یہ ان لوگوں کے متعلق ہے جنہوں نے زندگی کو محض کھیل تماشا سمجھ رکھا ہے۔ اسے مذاق قرار دے رکھا ہے۔

---

*تاج و محیط۔ **راغب۔ ***محیط۔ ****تاج و لین۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ زندگی کی صحیح روش یہ ہے کہ انسان ہمیشہ مستقبل پر نگاہ رکھے۔ مستقبل کے اندر بہت سی باتیں آجاتی ہیں۔ اس زندگی میں عیش امروز کی بجائے فکر فردا۔ آنے والی نسلوں کے مفاد کا خیال۔ پوری نوع انسانی کی بہبود کی فکر۔ اور اس زندگی کے بعد مستقبل کی زندگی کا خیال۔ طبیعی زندگی کے مفاد عاجلہ کے مقابلہ میں بلند اقدار کا تحفظ۔ اس کے برعکس دوسری روش یہ ہے کہ انسان مستقبل کی کچھ پرواہ نہ کرے اور اپنی ساری توجہ طبیعی زندگی کے پیش پا افتادہ مفاد اور عیش امروز پر رکھے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ روش زندگی کھیل تماشے سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ (۶/۳۲) اپنی تمام تگ وتاز کو طبیعی زندگی کی آسائشوں کی نذر کر دینا، بے مقصد زندگی ہے۔ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ (۶/۳۲)۔ جو لوگ تباہیوں سے بچنا چاہتے ہیں انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ مستقبل کی زندگی کا مفاد ہی اس قابل ہے کہ اس کے حصول کے لئے کوشش کی جائے۔ لَهْوٌ اس بات کو کہتے ہیں جو انسان کی توجہ کو اس چیز کی طرف سے ہٹا کر جو اس کے لئے ضروری ہے اُس چیز کی طرف منعطف کرا دے جو غیر ضروری اور بے مقصد ہے۔ ان آیات سے (جن میں الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا کو لہو و لعب کہا گیا ہے) یہ مراد نہیں کہ قرآن کریم دنیاوی زندگی کو قابل نفرت قرار دیتا ہے۔ یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ وہ اس دنیا کی زندگی کی خوشگواریوں کے حصول اور کائناتی قوتوں کی تسخیر کو مومن کی زندگی کی خصوصیت قرار دیتا ہے (دیکھئے عنوان د۔ ن۔ و)۔ ان آیات کا مفہوم وہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ یعنی اپنی نگاہ کو مستقبل کے مفاد سے ہٹا کر مفاد عاجلہ اور فوری عیش پر مبذول کر لینا۔ زندگی کو محض طبیعی زندگی سمجھنا اور حیوانی سطح پر جینا۔ جب طبیعی زندگی کے کسی مفاد اور بلند انسانی قدر میں تصادم ہو تو بلند قدر کو طبیعی مفاد پر قربان کر دینا۔ یہ روش غلط ہے۔ جو قومیں مستقبل کی پرواہ نہیں کرتیں وہ برباد ہو جاتی ہیں۔ یہی حالت افراد کی ہے۔ قرآن کریم ہمیشہ مستقبل کے مفاد کی تاکید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیاوی مفاد ضرور حاصل کرو۔ طبیعی زندگی کی خوشگواریوں سے متمتع ہو۔ لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ اس قسم کی خوشگواریوں میں اور کسی بلند انسانی قدر میں (جو وحی کے ذریعے ملتی ہے) (Tie) پڑ جائے۔ تصادم ہو جائے۔ تو اسوقت بلند قدر کے تحفظ کی خاطر طبیعی زندگی کے مفاد کو قربان کر دینا چاہئے۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم انسانی زندگی کو محض مذاق سمجھ رہے ہو۔

سورہ انبیاء میں ہے ۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۲۱/۱۶) ۔ اور ہم نے اس سلسلۂ کائنات کو یونہی ، لَاعِبِيْنَ ، نہیں بنا دیا ۔ ایسے ہم نے کھیل تماشا کے طور پر پیدا نہیں کر دیا ۔ یہ مذاق نہیں ۔ یہ بلا مقصد نہیں ۔ اسکا ایک عظیم الشان مقصد ہے ۔ یہ ایک اہم پروگرام کے ماتحت عمل میں آیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۔ (۲۱/۱۸) ۔ یہاں ہو یہ رہا ہے کہ تعمیری قوتیں ، تخریبی قوتوں پر برابر ضرب کاری لگاتی رہتی ہیں ۔ اس سے تخریبی قوتیں نیست و نابود ہو جاتی ہیں اور تعمیری سلسلہ آگے بڑھ جاتا ہے ۔ یوں یہ سلسلۂ کائنات ، اس تعمیری طریق سے ارتقائی منازل طے کرتا چلا جا رہا ہے ۔ ظاہر ہے کہ جو چیز محض کھیل تماشے کے طور پر بلا مقصد و بلا منزل پیدا کر دی گئی ہو اس کی صورت یہ نہیں ہوا کرتی ۔

اس آیت میں قرآن کریم نے اس غلط تصور کی بھی تردید کی ہے جو ہندؤوں کے ہاں رائج ہے ۔ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ کائنات اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایشور نے ایک لیلا رچا رکھی ہے ۔ یعنی محض کھیل ہے ۔ اسی لئے ان کے ہاں ایشور کو "نٹ راجن" کہتے ہیں ۔ یعنی کھلاڑیوں کا بادشاہ ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ تصور لغو ہے ۔ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ (۲۱/۱۸) ۔ یہ باتیں بے حد قابل افسوس اور تباہی کا باعث ہیں ۔ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ (۳۰/۸) کائنات کی تخلیق حق کے ساتھ ہوئی ہے ۔

لہذا کائنات اور انسانی زندگی کے ہر مسئلہ کو ہمیشہ (Seriously) لینا چاہئے ۔ مذاق نہیں سمجھنا چاہئے ۔ اور اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے ۔ قرآن کریم نے انسانی زندگی اور کائنات کو حقیقت (Reality) قرار دیکر انسان کے سامنے ایک عظیم پروگرام رکھ دیا ہے ۔ اس سے افلاطون (Plato) کا وہ طلسم بھی یکسر ٹوٹ گیا جس کی رو سے اس کائنات کو محض فریب سمجھا جاتا تھا ۔ اور اس کے ٹوٹنے سے ویدانت (ہندی تصوف) ۔ خانقاہیت اور تصوف کی عمارت بھی نیچے آگری ۔ دوسری طرف مغرب کے نظریہ مادیت (Materialism) کا بھی بطلان کر دیا جس کی رو سے زندگی محض طبیعی زندگی (Physical Life) ہے اور بس ۔

لَعَلَّ (حرف)

لَعَلَّ ۔ یہ حرف حسب ذیل معانی پیدا کرتا ہے ۔

(۱) "تاکہ" وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۲/۱۸۹) ۔ تم

قانون خداوندی کی نگہداشت کرو تاکہ تمہاری کھیتیاں برو مند ہوں۔ یہ توقع اور ترجّی (امید) کے لئے آتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا ترجمہ ہوتا ہے ''امید ہے کہ''...... ''توقع ہے کہ''۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ کتاب اور حکمت دونوں منزل من اللہ ہیں (مثلاً - ۴/۱۱۳ ؛ ۱۷/۳۹ ؛ ۲/۲۳۱) ۔ کتاب کے معنی ہیں قانون اور حکمت کے معنی ہیں اس قانون کی غرض و غایت - مصلحت - وہ مقصد جس کے لئے وہ قانون دیا گیا ہے - لَعَلَّ بھی حکمت بتانے کے لئے آتا ہے - وَ اتَّقُوْا اللّٰہَ - کتاب ہے (یعنی قانون - یا حکم) اور لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ - اس کی حکمت (مقصد یا غایت یا وہ نتیجہ جو اس حکم یا قانون کی اطاعت سے لازمی طور پر مرتب ہونا چاہئے) ۔

(۲) ''شاید'' یا ''ہوسکتا ہے کہ'' کے معنوں میں - وَ مَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ (۴۲/۱۷) اور تجھے کیا خبر ہے ، شاید وہ انقلاب کی گھڑی قریب ہی ہو - (ہوسکتا ہے کہ وہ قریب ہی ہو) ۔

(۳) استفہام انکاریہ کے لئے - یعنی ایسا سوال جس کا جواب (یا اس سے مراد) نہیں ہوتا ہے - فَلَعَلَّکَ تَارِکٌ بَعْضَ مَا یُوْحیٰ اِلَیْکَ (۱۱/۱۲) - توکیا تو (ان لوگوں کی خاطر) اپنی وحی کا کچھ حصہ ترک کردیگا ؟ - (ہرگز نہیں - تو ایسا کبھی نہیں کریگا) ۔

(۴) بعض اوقات یہ ''گویا کہ'' اور ''جیسے'' کے معنوں میں بھی آتا ہے - اس کے لئے قرآن کریم کی یہ آیت مثال میں پیش کی جاتی ہے - وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّکُمْ تَخْلُدُوْنَ (۲۶/۱۲۹) - اور تم صنعت کاری کے بڑے بڑے کام کرتے ہو گویا تمہیں یہاں ہمیشہ رہنا ہے - لیکن اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم یہ صنعت کاری اس لئے کرتے ہو تاکہ تمہیں دوام و استمرار نصیب ہو جائے - یہ چیزیں تمہاری بقا کا ذریعہ بن سکیں -

ل ع ن

لَعَنَ کے معنے ہوتے ہیں کسی کو ناراضگی کی بنا پر اپنے سے دور کر دینا*- خدا کی طرف سے لعنت سے مراد یہ ہوگی کہ انسان زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہوگیا - ظاہر ہے کہ یہ محرومی قوانین خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرنے کا نتیجہ ہوگی - اس لئے لَعْنَۃٌ کے معنی ہونگے قانون مکافات کی رو سے زندگی کی شادابیوں سے محروم ہو جانا -

*راغب - **تاج -

دور رکھنے کے اعتبار سے اَللَّعِیْنُ (Scare - Crow) کو کہتے ھیں ۔ یعنی وہ لکڑیاں سی جنھیں انسانی لباس پہنا کر کھیتوں میں کھڑا کر دیا جاتا ھے تاکہ پرندے فصل سے دور دور رھیں اور اسے خراب نہ کریں* ۔

قرآن کریم نے ابلیس کے متعلق پہلے کہا ھے فَاِنَّکَ رَجِیْمٌ (۱۵/۳۴) ۔ اور اس کے بعد ھے اِنَّ عَلَیْکَ اللَّعْنَۃَ (۱۵/۳۵) ۔ رَجْمٌ کے معنی ھیں کسی چیز کو دور پھینک دینا ۔ اس سے بھی لَعْنَتٌ کے معنی واضح ھوجاتے ھیں ۔

سورۃ بقرہ میں ھے کہ یہودی کہتے تھے کہ ھم قرآنی تعلیم سے کبھی اثر پذیر نہیں ھوسکتے ۔ ھمارے دل غلافوں کے اندر ھیں ۔ قرآن کریم نے کہا کہ بَل لَّعَنَھُمُ اللہُ بِکُفْرِھِمْ (۲/۸۸) ۔ نہیں! بات یہ نہیں جو وہ کہتے ھیں ۔ بات یہ ھے کہ وہ اپنے انکار و سرکشی کی وجہ سے سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیتوں سے محروم کر دئیے گئے ھیں ۔ اور یہ خدا کے قانون مکافات کے مطابق ھوا ھے ۔ لہذا جو لوگ کہتے ھیں کہ قرآن کریم میں خدا کافروں پر "لعنتیں" برساتا ھے تو انہوں نے لَعْنَتٌ کے قرآنی مفہوم کو نہیں سمجھا ۔ خدا (معاذ اللہ) گالیاں نہیں دیا کرتا ۔ اس سے خدا کے قانونِ مکافات عمل کا بیان مقصود ھے ۔ اور وہ قانون یہ ھے کہ جو شخص غلط راھوں پر چلتا ھے وہ زندگی کی انسانیت ساز خوشگواریوں سے دور ھٹ جاتا ھے ۔ ان سے محروم رہ جاتا ھے ۔ اس کے غلط اعمال کے اس نتیجہ کو لعنت کہتے ھیں اور ایسے شخص (یا قوم) کو ملعون ۔

مَلْعُوْنٌ دور کیا ھوا ۔ اس کی جمع مَلْعُوْنُوْنَ وَ مَلْعُوْنِیْنَ ھے (۳۳/۶۱) ۔ دور کئے ھوئے ۔

ل غ ب

لَغَبَ ۔ لَغْبًا ۔ لُغُوْبًا ۔ بہت زیادہ درماندہ ھونا اور تھک جانا ۔ شدید تکان ھو جانا** ۔ اَلنَّصَبُ ۔ جسمانی تکان کو کہتے ھیں اور اَللُّغُوْبُ ذھنی یا نفسیاتی تکان کو* ۔ سَھْمٌ لَغِیْبٌ ۔ وہ تیر جس کے پر بہت کمزور اور خراب ھوں ۔ رَجُلٌ لَغِیْبٌ ۔ کمزور اور بیوقوف آدمی** ۔

قرآن کریم میں اھل جنت کا قول ھے کہ لَا یَمَسُّنَا فِیْھَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْھَا لُغُوْبٌ (۳۵/۳۵) ۔ اس میں نہ جسمانی مشقت ھوگی نہ ذھنی

*تاج ۔ **راغب ۔

اور نفسیاتی تکان ۔ غور کیجئے کہ انسانی زندگی کے اگلے مراحل جن کی طرف قرآن کریم لے جاتا ھے ، زندگی کی موجودہ سطح سے کسقدر بلند اور لطیف ھیں ۔ طبیعی (Physical) اضمحلال بھی نہیں اور ذھنی (Mental) یا نفسیاتی (Psychological) تکان (Exhaustion) بھی نہیں۔ جب ''زندگی کے اگلے مراحل'' سے مراد مرنے کے بعد کی زندگی ھوگی ، تو اس میں یہ کیفیت کسطرح پیدا ھوگی اسکا ھم ، اپنے شعور کی موجودہ سطح پر رھتے ھوئے ، اندازہ نہیں کرسکتے لیکن یہ ظاھر ھے کہ اس میں حیات (Life) کی توانائیاں بھرپور ھونگی ۔

ل غ و

اَللُّغَۃُ ۔ آوازیں جن سے ھر قوم اپنے مطالب کی تعبیر کرتی ھے ۔ بولی ۔ لَغَوْتُ لَغْوًا ۔ میں نے بات کی۔ بعض کا خیال ھے کہ اَللَّغْوُ کے معنی پھینکنے اور ڈالنے کے ھیں ۔ کلام کو اس لئے لَغْوٌ کہتے ھیں کہ اسے پھینکا جاتا ھے* ۔ صاحب محیط کا خیال ھے کہ کوئی بعید نہیں کہ اَللُّغَۃُ یونانی لفظ لُوْغُوْس (Logos) سے ماخوذ ھو جس کے معنی کَلِمَۃٌ کے ھیں** ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی دو ھیں ۔ (۱) ناقابل اعتناء چیز اور (۲) کسی چیز سے شیفتگی ۔ یعنی ھر وقت اسی کی باتیں کرتے رھنا ۔ چنانچہ پہلے مفہوم کی جہت سے اَللَّغْوُ اونٹ کے ان بچوں کو کہتے ھیں جو خوں بہا میں ناقابل اعتناء ھوں ۔ اور دوسرے مفہوم کے اعتبار سے اَللُّغَۃُ بولی کو کہتے ھیں اس لئے کہ ھر ایک اپنی بولی پسند کرتا اور اسے بولتا رھتا ھے ۔

اَللَّغَا اور اَللَّغْوُ ۔ پرندے کی آواز کو کہتے ھیں ۔ اَلطَّیْرُ تَلْغُو بِاَصْوَاتِھَا ۔ پرندے اپنی آوازوں سے شور مچاتے ھیں ۔ اس اعتبار سے بےمعنی باتیں جو کسی گنتی میں شمار بھی نہ ھوں ، لَغْوٌ کہلاتی ھیں ۔ یا وہ باتیں جو زبان سے یونہی بلا ارادہ نکل جائیں* ۔ راغب نے کہا ھے کہ لَغْوٌ وہ باتیں ھیں جو سوچ سمجھکر نہ کی جائیں ۔ اس لئے وہ (بغیر ارادہ کے) کسی قطار و شمار میں نہ ھوں ۔ خلیل نے کہا ھے کہ لَغْوٌ اس بات کو کہتے ھیں جو یونہی منہ سے نکل جائے* ۔

کَلِمَۃٌ لَاغِیَۃٌ بیہودہ بات کو کہتے ھیں ۔ لَغَا فِیْ قَوْلِہٖ کے معنی ھیں وہ اپنی بات میں غلطی کرگیا ۔ اَلْغَاہُ ۔ اسے نامراد کر دیا ۔ ناکام بنا دیا ۔ بیکار کر دیا ۔ اَللَّغِیُّ ۔ گری پڑی چیز* ۔

*تاج ۔ **محیط ۔

سورۃ بقرہ میں ہے لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (۲/۲۲۵) ۔ اللہ تمہاری لغو قسموں پر مؤاخذہ نہیں کرتا ۔ ان پر مؤاخذہ کرتا ہے جو تمہارے دل کا فعل ہوں ۔ یہاں سے لَغْوٌ کے معنی واضح ہیں ۔ یعنی وہ باتیں جو یونہی بلاارادہ منہ سے نکل جائیں ۔ دوسری جگہ لَغْوٌ کے بعد ہے وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ (۵/۸۹) ۔ جو تم پختہ معاہدہ کرو ۔ جو تم دل سے عہد کرو ۔ جو بات سوچ سمجھ کر دل کے ارادہ سے کرو ۔ اس سے بھی لَغْوٌ کے معنی واضح ہیں ۔

جنت کی ''شراب'' کے متعلق کہا ہے ۔ لَا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ (۵۲/۲۳) ۔ اس سے انسان نہ تو بے معنی بکواس کریگا اور نہ ہی اس سے اضمحلال پیدا ہوگا (نیز ۵۶/۲۵)۔ دوسری جگہ جنت کے متعلق ہے ۔ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا (۱۹/۶۲) ۔ یعنی اس میں ہر بات ایسی ہوگی جس سے سلامتی پیدا ہو ۔ وہاں کوئی بات لَغْوٌ نہیں ہوگی ۔ یہاں لَغْوٌ بمقابلہ سَلٰمٌ آیا ہے ۔ سورۃ غاشیہ میں لَغْوٌ کی جگہ لَاغِيَةٌ آیا ہے (۸۸/۱۱) ۔ مومنین کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (۲۵/۷۲) ۔ اگر انہیں کبھی لَغْوٌ کے پاس سے گذرنا پڑ جاتا ہے تو وہ نہایت متانت سے اپنی عزت کو بچاتے ہوئے وہاں سے گذر جاتے ہیں ۔ یہاں لَغْوٌ سے مراد ہر بیہودہ اور بے معنی بات کے ہیں ۔

ان مقامات سے لَغْوٌ کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے ۔ بیہودہ باتیں ۔ ایسی باتیں جو شریف انسانوں کے شایان شان نہ ہوں ۔ بے معنی باتیں ۔ ایسی باتیں جن میں آواز ہی آواز ہو ، مطلب کچھ نہ ہو ۔ ایسی گفتگو جو بے سوچے سمجھے کی جائے ۔ ایسے کام جن کا کوئی وزن اور شمار نہ ہو ۔ جماعتِ مومنین کے جنتی معاشرہ میں اس قسم کی باتوں کا کوئی دخل نہیں ہوگا ۔

قرآن کریم میں ایک جگہ کفار کے متعلق ہے کہ وہ اپنے ہم مشربوں کو تلقین کیا کرتے تھے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ ۔ اس قرآن کریم کو مت مانو ۔ وَالْغَوْا فِيْهِ ۔ جہاں قرآن کریم کی آواز بلند ہو تم شور مچا دو ۔ بے معنی باتیں کرنے لگ جاؤ ۔ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱/۲۶) ۔ شاید اس طرح تم قرآن والوں پر غالب آ جاؤ ۔ حیرت ہے کہ جو مسلک کفار کا تھا مسلمانوں کو بھی آج کل اس کی تلقین کی جاتی ہے ۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ جہاں سے تمہیں یہ آواز سنائی دے کہ قرآن کریم کی طرف آؤ ، تم اس کی بات

مت سنو ، بلکہ شور مچا دو کہ کوئی اور بھی یہ آواز نہ سننے پائے ۔ یہ طریقہ ہے جس سے تم ان لوگوں پر غالب آجاؤ گے ۔ اس لئے کہ اگر لوگوں نے قرآن کریم کی آواز سن لی تو وہ پھر تمہارے خود ساختہ مذہب سے کبھی مطمئن نہیں ہوسکیں گے ۔

لہذا ہر وہ بات ، وہ عمل ، وہ تصور ، وہ نظریہ ، وہ عقیدہ جو انسان کو قرآن کریم سے دور رکھے لَغْوٌ ہے ۔ یہی وہ لغویات ہیں جن میں ہم صدیوں سے الجھے چلے آرہے ہیں ۔ جب تک ہم اپنے دل و دماغ کو ان لغویات سے پاک اور صاف نہیں کرلیں گے ، دینِ خالص تک کبھی نہیں پہنچ سکینگے ۔

ل ف ت

لَفَتَهٗ يَلْفِتُهٗ ۔ کسی کو اس کی سمت سے موڑ دینا ۔ جس رخ پر وہ ہو اس سے پھیر دینا ۔ لوٹا دینا ۔ واپس کر دینا ۔ لَفَتَهٗ عَنِ الشَّیْءِ ۔ اسے کسی چیز سے ہٹا دیا ، پھیر دیا * ۔ قرآن کریم میں ہے اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۱۰/۷۸) ۔ کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اپنے اسلاف کے راستے سے موڑ کر کسی اور طرف لے جائے ۔ اَلتِّفَاتٌ اسی سے ہے جسکے معنے ہیں رخ موڑنا * ۔ لِفْتُهٗ مَعَهٗ ۔ اس کا میلان اسکی طرف ہے ** ۔ اَللَّفُوْتُ وہ عورت جسکے ساتھ پہلے شوہر کا بچہ ہو اور اسکی طرف توجہ کرنے کی وجہ سے وہ دوسرے شوہر کی طرف توجہ نہ کرسکے ۔ نیز اُس اونٹنی کو کہتے ہیں جو دودھ دوہنے والے کی طرف باربار مڑ کر دیکھے ، اسے کاٹے اور چلائے اور بمشکل دودھ دوھائے ، کیونکہ اس کا بچہ مرچکا ہے * ۔ سورۂ ھود میں اصحابِ حضرت لوطؑ سے کہا گیا ہے کہ تم ان لوگوں کو چھوڑ کر یہاں سے نکل جاؤ ۔ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ (۱۱/۸۱) ۔ اور پھر تم میں سے کوئی ادھر منہ موڑ کر بھی نہ دیکھے ۔ ان چیزوں کو ایسا چھوڑ دو کہ پھر ان کی طرف تمہارا خیال بھی نہ آئے ۔ تمہاری یہ حالت ہو کہ ۔ از گوشۂ بامے کہ پریدیم ، پریدیم ۔

ل ف ح

لَفْحٌ ۔ سخت گرم ہوا کی لپٹ ۔ لسان میں ہے کہ لَفْحٌ ہر گرم چیز کو کہتے ہیں اور نَفْحٌ ہر ٹھنڈی چیز کو ۔ محیط میں اصمعی کے حوالہ سے ہے کہ جس ہوا کو لَفْحٌ کہا جائے وہ گرم ہوگی اور جسے لَفْحٌ کہا

*تاج ۔ **محیط ۔

جائے وہ ٹھنڈی ہوگی ۔ لَفَحَتْهُ النَّارُ بِحَرِّهَا ۔ آگ نے اپنی گرمی سے اسے جھلسا دیا *۔ سورۂ مومنون میں ہے ۔ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۔ (۲۳/۱۰۴) ۔ آگ ان کے چہروں کو جھلس دیگی ۔

ل ف ظ

لَفَظَهُ ۔ يَلْفِظُهُ مِنْ فِيْهِ ۔ اس نے اسے اپنے منہ سے نکال کر پھینکدیا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو ڈالدینے اور پھینکدینے کے ہوتے ہیں ۔

اَللَّافِظَةُ ۔ سمندر (کیونکہ جو کچھ اس کے اندر ہوتا ہے وہ اسے کناروں پر پھینک دیتا ہے) ۔ چوگا دینے والے پرندے، کہ وہ جو کچھ منہ میں لاتے ہیں اپنے بچوں کو دیدیتے ہیں ۔ چکّی (کیونکہ جو کچھ دانہ وغیرہ اس میں ڈالا جاتا ہے وہ آٹا بنا کر اسے باہر پھینک دیتی ہے) ۔ نیز وہ بکری جو چارہ کھا رہی ہو اور دودھ دوھنے والا آجائے تو جو گھاس اس کے منہ میں ہو وہ اسے بھی چھوڑ دے اور دودھ دینے کے لئے تیار ہوجائے۔ اَللُّفَاظَةُ ۔ جو کچھ منہ سے پھینکا جائے ** ۔ لَفْظٌ ۔ منہ سے نکلی ہوئی آواز چونکہ اس میں آواز کا ہونا ضروری ہے اس لئے لَفْظُ اللهِ نہیں کہتے بلکہ كَلِمَةُ اللهِ کہتے ہیں *** ۔

قرآن کریم میں ہے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ (۵۰/۱۸) ۔ وہ کوئی بات بھی نہیں بولتا ہے ۔

ل ف ف

اَللَّفُّ ۔ لپیٹنا ۔ (نَشْرٌ کی ضد ہے) ۔ لَفَّ الشَّيْءَ بِالشَّيْءِ ۔ اس نے اس چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دیا ۔ اَللِّفُّ ۔ جماعت ۔ گروہ ۔ مجتمع لوگ ۔ اَللَّفِيْفُ ۔ ملے جلے اکھٹے لوگ ۔ مختلف قبائل کے ایک جگہ جمع ہونے والے لوگ ۔ اَللِّفَافَةُ ۔ پٹی وغیرہ جو لپیٹی جائے ۔ اَلْاَلْفَافُ ۔ گتھے ہوئے درخت ۔ جَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۔ گھنے، گنجان، بکثرت درختوں والے باغیچے ۔ (۷۸/۱۶) ۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے ۔ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا (۱۷/۱۰۴) ۔ ہم تمہیں چاروں طرف سے اکٹھا کر کے لائینگے ۔ اِلْتَفَّ ۔ ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ لپٹ جانا ۔ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ (۷۵/۲۹) شدت پر شدت جمع ہوگئی ۔ مشکلات اکٹھی ہوتی چلی گئیں ۔ ساق پنڈلی کو بھی کہتے ہیں ۔****

*تاج و راغب و محیط ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔ ****تاج و راغب ۔

ل ف ی

اَلْفَاهُ کَاذِبًا ۔ اس نے اسے جھوٹا پایا ۔ وَاَلْفَیَا سَیِّدَھَا لَدَی الْبَابِ (۱۲/۲۵) ۔ ان دونوں نے اس کے شوہر کو دروازہ کے قریب پایا* ۔

سورۃ بقرہ میں ہے ۔ مَا اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ آبَاءَنَا (۲/۱۷۰) ۔ جس مسلک پر ہم نے اپنے آبا و اجداد کو پایا ہے ۔

تَلَافَی التَّقْصِیْرَ ۔ اس نے تقصیر کی تلافی کر دی ۔ اَلتَّلَافِی ۔ بدلہ لے لینا* ۔ تلافی کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ جو چیز ہاتھ سے نکل گئی تھی اسے دوبارہ پا لیا گیا ہے ۔ تلافیِ مافات ۔ جو کچھ ہاتھ سے چلا گیا تھا اسے دوبارہ پا لینا ۔ اَللَّفَاءُ ۔ مٹی اور ہر گری پڑی گھٹیا چیز کو کہتے ہیں* ۔ یعنی جو چیز یونہی پا لی جائے ۔

ل ق ب

اَللَّقَبُ ۔ وہ نام جو کسی کا اصلی نہ ہو بلکہ بعد میں پڑ جائے ۔ جمع اَلْقَابٌ* ۔ اس نام میں معنی کی رعایت ہوتی ہے ، بخلاف اَعْلَامٌ کے جس میں معنی کی رعایت نہیں ہوتی** ۔ لَقَبٌ تین طرح کے ہوتے ہیں ۔ لقب تشریف ۔ لقب تعریف ۔ اور لقب تسخیف ۔ تیسری قسم سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اس میں ذلّت کا پہلو ہوتا ہے*** ۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (۴۹/۱۱) ۔ ایک دوسرے کے برے نام نہ رکھا کرو ۔ (دیکھئے عنوان ن ۔ ب ۔ ز)

ل ق ح

لِقَاحٌ ۔ گھوڑے یا اُونٹ کے مادۂ منویہ کو کہتے ہیں ۔ اَللَّقَحُ ۔ حمل ۔ لَاقِحٌ ۔ حاملہ ۔ (جمع لَوَاقِحُ) ۔ لَقِحَتِ النَّاقَۃُ ۔ اونٹنی حاملہ ہوئی ۔ اَلْقَحَتِ الرِّیَاحُ الشَّجَرَ وَالسَّحَابَ ۔ ہواؤں نے درختوں اور بادلوں کو بار آور بنا دیا**** ۔ (درختوں کو اسطرح کہ ہوائیں نر درختوں کا زیرہ ، مادہ درختوں پر لا کر ڈال دیتی ہیں جس سے ان میں پھول آ جاتے ہیں اور پھل پیدا ہوتے ہیں ۔ اور بادلوں کو اس طرح کہ ہوائیں سمندر سے پانی اٹھا کر بادلوں کو بار آور کر دیتی ہیں ۔ یہ ابن فارس کی تشریح ہے) ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے ۔ وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ (۱۵/۲۲) ۔ ہم بار آو

---

*تاج ۔ **راغب ۔ ***محیط ۔ ****تاج و راغب ۔

ہواؤں کو بھیجتے ہیں ۔ اس کے مقابلہ میں آندھی اور جھکڑ کی ہوا کو اَلرِّیْحَ الْعَقِیْمَ (۵۱/۴۱) کہا گیا ہے ۔ بانجھ ہوا ۔

ل ق ط

لَقَطَ ۔ یَلْقُطُ ۔ لَقْطًا ۔ کسی (گری پڑی) چیز کو زمین سے بلا محنت و مشقت اٹھا لینا ۔ اَللُّقَطَۃُ ۔ وہ پڑی ہوئی چیز جو کسی کو ملے اور وہ اُسے اٹھالے ۔ نیز پھینکا ہوا نوزائیدہ بچہ ۔ اسے اَللَّقِیْطُ بھی کہتے ہیں * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہوتے ہیں اس چیز کو زمین سے اٹھا لینا جسے اچانک دیکھا ہو اور اسے لینے کا پہلے سے کوئی ارادہ نہ ہو ۔ اگرچہ بعض اوقات یہ مقصد اور ارادے کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے ۔

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا کہ اسے اندھے کنوئیں میں ڈالدو ۔ یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَۃِ (۱۲/۱۰) ۔ کوئی قافلہ اسے پڑی ہوئی چیز دیکھ کر اٹھا کر لے جائیگا ۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے کہ جب ان کی والدہ نے انہیں دریا میں بہا دیا ۔ فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ (۲۸/۸) ۔ فرعون کے لوگوں نے اسے اٹھا لیا ۔

ل ق ف

لَقِفَ ۔ یَلْقَفُ ۔ کسی چیز کو جلدی سے لے لینا ۔ جو چیز تمہاری طرف پھینکی جائے اسے تیزی سے (ہاتھ سے یا منہ سے) اُچک لینا ۔ راغب نے اسکے معنی کسی چیز کو مہارت اور ہوشیاری سے لے لینا لکھے ہیں ۔ اَلتَّلْقِیْفُ ۔ اَلتَّلَقُّفُ ۔ کھانے کو نگل لینا ۔ اَلتَّلْقِیْفُ ۔ گھوڑے یا اونٹ کا تیزی سے دوڑنے میں اگلی ٹانگوں کو تیزی سے چلانا اور پیٹ کی طرف پوری طرح نہ جانے دینا** ۔ تَلَقَّفَ الشَّیْءَ ۔ کسی چیز کو تیزی اور پھرتی سے لینا** ۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کے "عصا" کے متعلق ہے ۔ فَاِذَا ھِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِکُوْنَ (۷/۱۱۷) وہ فریق مقابل کے باطل (دلائل) کو بولنے ہی نگل گیا ۔ وہ دلیلیں اس کے سامنے نہ ٹھہر سکیں ۔ اسنے انہیں ہاتھ بڑھا کر اُچک لیا ۔ ساحرین نے جو کچھ جھوٹ موٹ بنا رکھا تھا (ڈھونگ رچا رکھا تھا) اس نے اسے تیزی سے اُچک لیا ۔ ساحرین کے جھوٹ موٹ کے "سانپوں" کو موسیٰؑ کا "اژدہا" جھٹ سے نگل گیا ۔

---

* تاج و محیط ۔ **تاج و راغب ۔ ***محیط ۔

ل ق م

اَللَّقْمُ - جلدی اور تیزی سے کھانا - لَقِمَہٗ - اسے اپنے منہ سے کھینچا اور جھٹ سے کھا لیا - اِلْتَقَمَہٗ - اس نے اسے نگل لیا ، مہلت کے ساتھ *- یعنی پہلے منہ میں رکھا اور پھر نگلا - اس اعتبار سے لَقِمَ اور اِلْتَقَمَ - منہ میں لینے کو کہتے ہیں ***- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہاتھ کے ذریعے منہ تک کھانا لے جانے کے ہیں - قرآن کریم میں قصہ حضرت یونس[ع] میں ہے - فَالْتَقَمَہُ الْحُوْتُ (۳۷/۱۴۲) - بڑی مچھلی نے اسے لقمہ بنایا - منہ میں لے لیا - لَقَمَ الطَّرِيْقَ - اس نے راستہ کا منہ بند کر دیا *- اَلْقَمَہٗ الْحَجَرَ - جھگڑے وقت حریف مقابل کو لاجواب اور خاموش کر دیا**-

لقمان

قرآن کریم نے علم و حکمت کی باتوں کے سلسلہ میں ایک شخصیت کا ذکر کیا ہے جس کا نام لقمان ہے - (وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ ... (۳۱/۱۲) قرآن کریم نے انھیں نبی نہیں کہا - نہ ہی ان کا تفصیلی تعارف کرایا ہے - انہوں نے اپنے بیٹے کو جو نصیحت آمیز باتیں کہی ہیں فقط ان کا ذکر کیا ہے (۳۱/۱۲-۱۹) -

بعض نے کہا ہے کہ آپ حضرت ایوب[ع] کے بھانجے تھے - بعض کہتے ہیں کہ آپ حضرت داؤد[ع] کے زمانہ میں پیدا ہوئے - بعض کا خیال ہے کہ آپ حبشی غلام تھے - مستشرقین میں سے سیل کا خیال ہے کہ یہ یونانی ایساپ (Aesop) ہی ہیں - ڈاکٹر (Spanger) نے کہا ہے کہ یہ ابیونہ کے الکسائی (Elxai) ہی کا دوسرا نام ہے - پروفیسر ھتی (Hitti) بھی اسی خیال کا مؤید ہے - تورات کی کتاب الامثال میں یاقہ کے بیٹے اجور (امثال ۳۰/۱) اور طوایل بادشاہ (۳۱/۱) کی حکمت کی باتیں عرب کے لقمان کی نصائح سے ملتی جلتی ہیں - اس قیاس کے مطابق جناب لقمان کو بنی اسمٰعیل میں سے ہونا چاہئے -

لیکن یہ سب قیاسات ہیں - بعد کی تحقیق کسی فیصلہ کن نتیجہ تک پہنچا سکیگی - ایک بات البتہ بالکل واضح ہے - اگر لقمان ، صاحبِ وحی تھے (جس کا ذکر قرآن کریم نے نہیں کیا) تو حکمۃ کے معنی وحی ہونگے - اور اگر وہ صاحب وحی نہ تھے (جیسا کہ قرآن کریم سے ظاہر ہے) تو حکمۃ

*تاج و راغب - **محیط - ***لسان العرب -

کے معنی یہ ہونگے کہ وہ، وحی کے احکام کے حکیمانہ نتائج کو سمجھنے کی عمدہ صلاحیت رکھتے تھے۔ جب الحکمۃ منزل من اللہ ہو تو وہ وحی ہی کا دوسرا نام ہوتا ہے۔ اور جب یہ لفظ ہام انسانوں کیطرف منسوب ہو تو اس سے ہام دانش اطواری مراد ہوتی ہے۔

ل ق ی

لِقَاءٌ۔ امام رازی نے کہا ہے کہ کسی جسم کا دوسرے جسم تک اس طرح پہنچنا کہ وہ آپس میں مس کر جائیں، لِقَاءٌ کہلاتا ہے*۔ لیکن امام راغب کے نزدیک مس کرنا ضروری نہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے ہونا لِقَاءٌ ہے۔ بعض کے نزدیک کسی بات کا حس اور بصر یا بصیرت سے ادراک کرلینا** (Perception)۔ یا کسی بات کا پا لینا بھی لِقَاءٌ ہے۔ تِلْقَاءٌ کے معنی ہیں۔ سامنے*۔ یَوْمُ التَّلَاقِ (۳/۱۵) کے معنی ہیں ایک دوسرے کے سامنے آنے کا دن۔ یعنی جب اعمال کے نتائج محسوس طور پر سامنے آجائیں۔

اَلْقَاءٌ کے معنی کسی چیز کو اس طرح ڈال دینا ہیں کہ وہ دوسرے کے سامنے آجائے**۔ جوہری کے نزدیک مطلق کسی چیز کو پھینک دینے کو بھی کہتے ہیں*۔ نیز لِقَاءٌ کا لفظ جنگ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، جب فوجوں کی ایک دوسرے سے مٹھ بھیڑ ہو جاتی ہے***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تین ہیں (۱) دو چیزوں کا ملنا۔ آمنے سامنے ہونا۔ (۲) کسی چیز کو ڈال دینا۔ اور (۳) ٹیڑھا پن، جس سے اَللَّقْوَۃُ ہے۔ (لیکن موخرالذکر واوی ہے)۔

قرآن کریم میں ہے اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۲/۱۴)۔ جب وہ مومنین کے سامنے آتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ کَلِمٰتٍ (۲/۳۷) اس میں تَلَقّٰی کے معنی قوانین خداوندی کے حصول (پالینے) کے ہیں۔ زمین کے متعلق جہاں ہے وَاَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ (۱۵/۱۹)۔ وہاں اَلْقَاءٌ کے معنی ڈال دینا یا بنا دینا ہیں۔ ڈال دینے کے معنوں میں یہ لفظ (۲/۳۹) میں استعمال ہوا ہے۔ سورۂ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ہرکارے کو اپنا خط دیا اور کہا فَاَلْقِهْ اِلَیْهِمْ (۲۷/۲۸) "یہ خط ان کے سامنے ڈال دے"۔ یعنی (Deliver) کر دے۔ اس کے بعد ملکۂ سبا کا قول ہے اِنِّیْۤ اُلْقِیَ اِلَیَّ کِتٰبٌ کَرِیْمٌ (۲۷/۲۹) "میری طرف ایک باعزت خط بھیجا گیا ہے۔" سورۂ نحل میں۔ فَاَلْقَوْا اِلَیْهِمُ الْقَوْلَ (۱۶/۸۶) کے معنی ہیں، ان کی طرف بات ڈالنا یعنی کہنا۔

---

*تاج۔ **راغب۔ ***محیط۔

سورۂ کہف میں ہے کہ فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْ لِقَاءَ رَبِّہٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحًا وَّلَا یُشْرِکْ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖ اَحَدًا (۱۸/۱۱۰)۔ اس کے معنی ہیں جو شخص یہ چاہتا ہے کہ خدا کا (قانون یا) نظام ربوبیت، محسوس شکل میں اسکے سامنے آجائے تو اسے چاہئیے کہ وہ (قانون خداوندی کے متعین کردہ) صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہے اور اپنی تمام صلاحیتوں کو اس قانون کے مطابق صرف میں لائے اور اس میں کسی اور جذبہ یا مفاد پرستی کی کشش کو شریک نہ ہونے دے ۔ لہذا، لِقَاءِ رَبّ کے معنی ہیں خدا کے نظام ربوبیت کا محسوس شکل میں سامنے آجانا۔ یا قانون خداوندی کی رو سے انسانی اعمال کے نتائج کا محسوس شکل میں سامنے آجانا۔ نیز انسان کا ہر وقت اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا کہ وہ اپنے ہر عمل کے لئے خدا کے قانون مکافات کے سامنے جواب دہ ہے ۔ لِقَاءِ رَبّ سے انکار (کفر) کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی زندگی کے عملی پہلوؤں میں قانون خداوندی کا سامنا کرنے سے گریز کی راہیں نکالے ۔ اس کا سامنا کرنے سے کترائے اور قانون مکافات کے سامنے جواب دہی سے انکار کرے۔ واضح رہے کہ قانون مکافات کی رو سے اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی سامنے آجاتے ہیں اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔ اس لئے ان معانی میں لِقَاءِ رَبّ یہاں بھی ہوتا ہے اور مرنے کے بعد بھی ۔ جہاں تک اس لِقَاءِ رَبّ کا تعلق ہے جس میں خدا کے قانون ربوبیت کو مشہود طور پر دیکھا جاتا ہے ، اس کے لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم نظام کائنات پر غور کرو۔ اس میں ریسرچ کرو۔ اس کے نظم و نسق کو سمجھو۔ اس سے یہ قانون اور نظام تمہارے سامنے آجائیگا۔ (دیکھئیے ۱۳/۲)۔ لیکن ایسا وہی کر سکیگا جو پیش پا افتادہ مفاد ہی کو مقصود زندگی نہ سمجھ لے (۱۰/۷-۸)۔ ایسے لوگ خدا کے عطا کردہ سامانِ نشوونما سے محروم رہ جاتے ہیں (۲۹/۲۳)۔

قرآن کریم کے مختلف مقامات میں یہ دیکھنا چاہئیے کہ لِقَاءِ رَبّ سے مراد نظام کائنات میں خدا کے قانون ربوبیت کو بے نقاب دیکھنا ہے۔ یا اس کے قانون مکافات کی رو سے اعمال کے نتائج کو اپنے سامنے دیکھنا (خواہ اس زندگی میں ہو یا اس کے بعد کی زندگی میں)۔ بعض لوگ ''لِقَاءِ رب'' سے متعلق آیات سے یہ مفہوم لیتے ہیں کہ آخرت میں انسان کو خدا کا دیدار ہوگا۔ یعنی وہ اور خدا ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونگے۔ ہم اس ضمن میں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ نہ تو خدا کی ذات مادی ہے اور نہ ہی ہمیں یہ معلوم ہے کہ حیات اخروی میں انسانی زندگی کی کیفیت کیا ہوگی۔ اس لئے یہ تصور کرنا کہ اس زندگی میں انسان اور خدا اسطرح آمنے سامنے

ہونگے جسطرح یہاں دو انسان ایک دوسرے کے سامنے ہوتے ہیں ، غلط ہوگا۔ اگر وہاں " لِقَاءِ رب " ہوگا تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ اسکی کیفیت کیا ہوگی۔

ہمارے ہاں عام طور پر " بزرگوں " کے متعلق کہا جاتا ہے کہ فلاں بات کو خدا نے ان کی طرف " القا کیا "۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس بات کا علم انہیں خدا کیطرف سے بذریعہ الہام ہوا۔ یعنی انہوں نے اپنے علم و عقل سے اسے دریافت نہیں کیا بلکہ یہ علم انہیں براہ راست خدا کیطرف سے عطا ہوا۔ اسی کو الہام یا کشف کہا جاتا ہے جس کی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ خدا کیطرف سے براہ راست علم صرف وحی کے ذریعے ملتا تھا جس کا سلسلہ نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اب وہ علم قرآن کریم کے اندر ہے۔ اب یہ کہنا کہ کسی کو خدا کیطرف سے الہام یا القا ہوتا ہے مہر نبوت کو توڑنا ہے۔ [تفصیل اس اجمال کی (و - ح - ی) اور (ل - ھ - م) کے عنوانوں میں ملیگی] ۔

واضح رہے کہ یہ جو ہم کہدیا کرتے ہیں کہ میرے دل میں بیٹھے بیٹھے یونہی خیال آیا کہ فلاں کام کرو ، تو اس کا تعلق وحی ، الہام ، القا وغیرہ سے کچھ نہیں ۔ یہ انسان کے نفس لاشعور (Un - Conscious Mind) کا عمل ہوتا ہے جس کے متعلق ہمارے زمانے میں تحقیقات کے نئے باب کھل رہے ہیں ۔ وحی کی نوعیت اس سے یکسر مختلف ہوتی ہے ۔ وہ ایک یقینی علم ہوتا ہے جو خدا کیطرف سے نبی کو براہ راست ملتا تھا ۔

یُلَقّٰی کے معنی توفیق دئے جانے کے بھی آتے ہیں ۔ وَمَا یُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا (۴۱/۳۵) اس (اہم کام) کی توفیق انہیں ہی ملتی ہے جو قوانین خداوندی کی استقامت سے اطاعت کرتے ہیں ۔ اسے وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں ۔

سورہ یونس میں ہے ۔ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِیْ (۱۰/۱۵) ۔ اس کے معنی ہیں ، اپنی طرف سے ۔

لکنّ (حرف)

لٰکِنْ ۔ لٰکِنَّ ۔ " مگر یا لیکن " کے معنوں کے لئے آتا ہے ۔ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ۔ وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی (۷۵/۳۱-۳۲) ۔ تو وہ نہ تصدیق کرتا ہے نہ سیدھے راستے پر چلتا ہے ۔ لیکن جھٹلاتا ہے اور گریز کی

راھیں نکالتا ھے ۔ (" لیکن " کے مقابلہ میں یہاں " بلکہ " ترجمہ کیا جائے تو زیادہ موزوں رھیگا لہذا) یہ " لکن " اور " بلکہ " دونوں معنوں میں آتا ھے ۔ سورہ بقرہ کی آیت ۔ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَّا تَشْعُرُونَ (۲/۱۵۴) میں اس کے معنی " لیکن " یا " مگر " کے ھیں ۔ یعنی وہ زندہ ھیں لیکن تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس بات کو سمجھ نہیں سکتے ۔

لَمْ (حرف)

لَمْ ۔ یہ مضارع پر آتا ھے تو اس کے معنی ماضی منفی کے کر دیتا ھے ۔ مثلاً ۔ لَمْ يَلِدْ (۱۱۲/۳) ۔ اس نے نہیں جنا ۔ يَلِدُ ۔ مضارع ھے جس کے عام طور پر معنی "جنتا ھے" ھونگے ۔ لیکن لَمْ سے اس کے معنی "جنا" (ماضی) کے بھی ھو گئے اور نفی (نہیں) کے بھی ۔ یعنی ، نہیں جنا ۔

لَمَّا

لَمَّا ۔ (۱) "جب" کے معنوں میں ۔ لَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ (۲۸/۲۳) ۔ جب وہ مدین کے پانی (گھاٹ) پر پہنچا ۔

(۲) ھنوز "نہیں" (اب تک نہیں) کے معنوں میں ۔ لَمَّا يَذُوقُوا عَذَابِ (۳۸/۸) ۔ ابھی تک انہوں نے میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا ۔

(۳) اِلَّا (مگر) کے معنوں میں ۔ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (۸۶/۴) ۔ کوئی متنفس ایسا نہیں مگر اس پر نگران موجود ھے ۔ یعنی کوئی متنفس ایسا نہیں کہ جس پر نگران موجود نہ ھو ۔ ھر متنفس پر نگران موجود ھے ۔

(۴) "سب کے سب" کے معنوں میں ۔ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ (۱۱/۱۱۱) ۔ یقیناً تیرا رب ان سب کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیگا ۔

(۵) بعض اوقات زائد بھی ھوتا ھے ۔ وَإِنْ كُلُّ ذَٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۴۳/۳۵) ۔ اور یہ سب طبعی زندگی کا سازوسامان ھے ۔ یہاں اگر لَمَّا نہ بھی ھو تو بھی یہی معنی ھونگے ۔ یہ بھی ھو سکتا ھے کہ یہاں اِنْ نافیہ ھو اور لَمَّا بمعنی اِلَّا ۔ (جیسا کہ نمبر (۳) میں لکھا جاچکا ھے) ۔

ل م ح

لَمَحَ اِلَيْهِ ۔ کسی کی طرف تیزی سے دیکھنا ۔ نیز عجلت کے ساتھ دیکھنا ۔ اَللَّمْحَةُ ۔ عجلت کے ساتھ دیکھنا ۔ اَلْمَحَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ

وَجْہِہَا - عورت نے اپنے محاسن کی جھلک دکھائی پھر انہیں چھپا لیا - ایسا بالعموم حسینہ اپنے عاشق کے ساتھ کرتی ہے* -

اَللَّمْحُ - بجلی کے چمکنے کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں بھی اظہار و اخفاء کی یہی کیفیت ہوتی ہے** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی کسی چیز کے چمکنے کے ہیں - لَمَحَ الْبَصَرُ - نگاہ کا کسی چیز کی طرف اٹھنا*** - قرآن کریم میں اَمْرُ السَّاعَةِ - (آنے والے انقلاب) کے متعلق ہے - كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ (۱۶/۷۷) - وہ آنکھ جھپکنے کی طرح ہے یا اس سے بھی قریب تر -

ل م ز

اَللَّمْزُ - اس کے اصلی معنے آنکھ ، سر یا ہونٹوں سے اشارہ کرتے ہوئے خفیہ بات کرنا ہیں - منہ پر عیب چینی کرنا - بعض نے اس کے معنی غیبت کرنے کے بھی لکھے ہیں - لُمَزَةٌ* اس چغلخور کو کہتے ہیں جو جماعت میں تفریق ڈالے اور دو دوستوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکائے**** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی عیب کے ہیں -

قرآن کریم میں ہے مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ (۹/۵۸) - جو صدقات (کی تقسیم) کے معاملہ میں تیرے خلاف اعتراض کرتے ہیں اور اس طرح جماعت میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں - سورہ حجرات میں ہے لَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ (۴۹/۱۱) - آپس میں ایک دوسرے کی عیب چینی نہ کرو- مذاق نہ اڑاؤ- سورہ ھمزہ میں هُمَزَةٍ لُمَزَةٍ (۱۰۴/۱) آیا ہے - کچوکے لگانے والے - عیب تراشنے والے (تاکہ جماعت میں انتشار پیدا ہو) - راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی دوسروں کے عیوب کی تلاش کرنا ہے** -

ل م س

لَمَسَ - يَلْمِسُ - ہاتھ سے چھونا - کسی چیز کو ادھر ادھر تلاش کرنا***** - سورہ جن میں ہے اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ (۷۲/۸) - ہم نے آسمان کو ٹٹولا - (غیب کی خبروں کے لئے قیاس آرائیاں کیں) - اِلْتَمَسَ - کسی شے کو طلب کرنا - تلاش کرنا***** - ابن فارس نے ابن درید کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تو کسی چیز کو ہاتھ سے چھونے کے ہیں لیکن پھر ہر متلاشی اور جستجو کرنے والے کو مُلْتَمِسٌ کہدیتے ہیں -

---

* تاج - ** راغب - *** محیط - **** تاج و محیط - *****تاج و راغب -

سورہ حدید میں ہے۔ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا (۵۷/۱۳) - تم روشنی کو تلاش کرو۔ اَلْمُلَامَسَةُ - ایک دوسرے کو ہاتھ سے چھونا۔ نیز یہ کنایۃً مجامعت کے لئے بولا جاتا ہے*۔ اسی معنی میں قرآن کریم میں اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (۴/۴۳) آیا ہے۔

ل م م

لَمَّهٗ یَلُمُّهٗ لَمًّا - اس نے اسکو جمع کر دیا۔ لَمَّ الشَّعَثَ - منتشر معاملات کو سمیٹ کر قریب قریب کر دیا۔ دَارُنَا لَمُوْمَةٌ - ہمارا گھر لوگوں کو جمع کر لینے والا اور ان کی پرورش کرنے والا ہے۔ رَجُلٌ مِلَمٌّ - قوم اور کنبہ کو جمع کر لینے والا آدمی**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اکٹھا ہونے، قریب قریب ہونے اور ملا ہوا ہونے کے ہیں۔

سورہ فجر میں ہے۔ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (۸۹/۱۹) - تم اس مال کو جو تمہیں میراث میں ملتا ہے، سمیٹ کر خود ہی کھا جاتے ہو؟ اس سے ظاہر ہے کہ قرآنی نظامِ معیشت میں میراث انفرادی چیز نہیں رہتی۔ قرآن کریم میں وراثت کے متعلق جو احکام ہیں وہ اس عبوری دور سے متعلق ہیں جن میں نظام قرآنی ابھی مکمل طور پر قائم نہ ہوا ہو۔ اس نظام کی تشکیل کے بعد فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہتی اس لئے ترکہ میں مال اور جائداد چھوڑنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ (تفصیل متعلقہ عنوانات میں دیکھئے)۔ اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم ترکہ سے مختلف وارثوں کا حق نہیں دیتے۔ سارے کا سارا خود ہی کھا جاتے ہو۔ اس صورت میں یہ آیت اس دور سے متعلق ہوگی جس میں میراث اور اس کی تقسیم کا ہنوز عمل جاری ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اسلامی نظام بھی بعض حالات میں اس عمل کو جاری رکھے۔ نیز مال و دولت اور جائداد کے علاوہ عام مستعملہ اشیاء بھی تو ترکہ میں آسکتی ہیں۔

"قریب ہونے" کے اعتبار سے اَلَمَّ الرَّجُلُ کے معنی ہیں، آدمی گناہ کے قریب ہو گیا۔ یعنی اس کا مرتکب تو نہیں ہوا، البتہ اس نے اسکا ارادہ کر لیا تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ لَمَمٌ کے معنی یہ ہیں کہ انسان کبھی کبھار کوئی غلطی کر بیٹھے لیکن اس پر اصرار نہ کرے۔ اِلْمَامٌ کے معنی ہیں، کسی وقت کوئی کام کر لینا لیکن اس پر اصرار نہ کرنا۔ چنانچہ کہتے ہیں

*تاج و راغب۔ **تاج۔

مَا يَزْوُرْنَا اِلاَّ لِمَامًا ۔ وہ ہمارے ہاں بلاپابندی کبھی کبھار آجاتا ہے ۔ کلبی نے کہا ہے کہ لَمَمٌ کے معنی بلا ارادہ غیر محرم کو دیکھ لینے کے ہیں ۔ جوہری نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں بلا ارادہ کسی معصیت کے قریب ہو جانا لیکن اس کا ارتکاب نہ کرنا ۔ ''قریب ہو جانے'' کے اعتبار سے لَمَمٌ کے معنی بوسہ لینے کے بھی آتے ہیں *۔

قرآن کریم میں مومنین کے متعلق ہے وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (۵۳/۳۲) ۔ وہ لوگ بڑی بڑی لغزشوں سے اور بےحیائی کی باتوں سے مجتنب رہتے ہیں ، بجز اُن غلطیوں کے جو انسان سے کبھی کبھار بلا ارادہ سرزد ہو جائیں ۔ ایسی غلطیاں معصیت نہیں ہوتیں لیکن معصیت کے قریب ضرور لے جاتی ہیں ۔ اس لئے ان کی بابت بھی احتیاط برتنی چاہئے کہ بار بار ایسا نہ ہو ۔ غور کیجئے قرآن ، نفسیاتی اصلاح کے لئے کسقدر تدریجی تدابیر اختیار کرتا ہے ۔ ایک دم سختی نہیں کر دیتا ۔

(لَمْ ۔ لَمَّا ۔ حروف ہیں ۔ انہیں انکے عنوانات کے تحت دیکھئے)۔

لَنْ (حرف)

لَنْ ۔ یہ مضارع پر آتا ہے تو (۱) اسے مستقبل کے معنی دیتا ہے ۔ (۲) نفی (نہیں) کا مفہوم پیدا کرتا ہے اور (۳) اس نفی میں شدت پیدا کرتا ہے ۔ جیسے لَنْ تَفْعَلُوْا (۲/۲۴) تم ہرگز ایسا نہیں کرو گے ۔

ل ھ ب

لَهَبٌ ۔ آگ کا شعلہ ۔ لَهِيْبٌ ۔ اس شعلہ کی حرارت ۔ اَلْهَبَ النَّارَ ۔ اس نے آگ کو بھڑکایا ۔ فَالْتَهَبَتْ ۔ پس وہ بھڑک اٹھی *۔ نیز دھوئیں کی طرح اوپر اڑنے والے غبار کو بھی لَهَبٌ کہتے ہیں *۔ راغب نے لَهَبٌ کے معنی دھواں بھی لکھے ہیں **۔

قرآن کریم میں ہے ۔ لَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ (۷۷/۳۱) ۔ وہ آگ کے شعلے سے نہیں بچا سکتا ۔ سورہ لہب میں اَبِيْ لَهَبٍ (۱۱۱/۱) آیا ہے ۔ جس کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (۱۱۱/۳) میں داخل ہوگا ۔ ابی لہب ، نبی اکرمؐ کے چچا (عبدالعزی بن عبدالمطلب) کی کنیت تھی ، غالباً اسکی شعلہ مزاجی کی وجہ سے ۔ وہ اسلام کا سخت مخالف تھا ۔ وہ بدر کی لڑائی کے کچھ دنوں بعد ایک وبائی مرض میں مر گیا ۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر

*تاج ۔ **راغب

خصوصیت سے کیا ہے، اس لئے کہ وہ ایک خاص ٹائپ کے لوگوں کا ترجمان تھا۔ کعبہ کا متولی، جسے معلوم تھا کہ اسلام کی کامیابی سے اسکی عیش سامانیاں سب چھن جائینگی، کیونکہ اسلام پیشوایت کا سخت دشمن تھا۔ بد دیانت ایسا (جیسا کہ عام طور پر وہ تمام لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کی محنت پر زندگی بسر کریں) کہ کعبہ کے اندر سے سونے کا ایک ہرن (جو وہاں چڑھاوا چڑھا ہوگا) چرا لیا۔ بزدل ایسا (جیسا کہ کام نہ کرنے والا طبقہ ہو جاتا ہے) کہ بدر کی جنگ میں جس میں قریش کے قریب قریب تمام سردار شامل تھے، یہ شریک نہ ہوا اور اپنی طرف سے ایک ایسے شخص کو مرنے کے لئے بھیج دیا جو اس کا مقروض تھا۔ بخیل بے حد تھا۔ چنانچہ جب مرا ہے تو خود اس کے اپنے عزیز اس کی لاش کے قریب تک نہیں آئے اور حبشیوں سے اٹھوا کر اسے دفن کرایا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ رسول اللہؐ کی قرابت داری اس کے کسی کام نہ آسکی۔ کیونکہ اسلام میں قرب کا معیار ایمان ہے، نہ کہ رشتہ داری۔

اس قسم کے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ ۔ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ (۱۱۱/۱-۲)۔

ل ھ ث

اَللُّهَاثُ ۔ اَللَّهَثُ ۔ پیاس ۔ اَللُّهْثَاثُ ۔ پیاس کی گرمی کی شدت ۔ پیاس کی وجہ سے زبان باہر نکالنا ۔ ھانپنا ۔ تھک جانا ۔ درماندہ ھو جانا*۔ راغب نے کہا ہے کہ لَهَثٌ کے معنی پیاس سے زبان لٹکانے، تھکنے اور پیاس کے ھیں**۔ تاج نے راغب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ تھکن سے سانس کا پھولنا لَهَثٌ کہلاتا ہے۔

لَهَثَ الْكَلْبُ ۔ کتّے کا زبان باہر نکال کر ھانپنا*** (۷/۱۷۶)

ل ھ م

لَهِمَهُ يَلْهَمُهُ ۔ لَهْمًا ۔ کسی چیز کو یکبارگی نگل لینا ۔ رَجُلٌ لَهِمٌ ۔ بہت کھانے والا آدمی****۔ أَلْهَمَهُ الشَّيْءَ ۔ اس نے اسے کوئی چیز نگلوا دی ۔ اسی سے اِلْهَامٌ ہے*****۔

قرآن کریم میں نفس انسانی کے متعلق ہے ۔ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (۹۱/۸)۔ اس کے عام طور پر یہ معنی کئے جاتے ھیں کہ اللہ نے انسان

*تاج ۔ **راغب ۔ ***ابن قتیبہ (القرطین ۔ ج/۱ صفحہ ۱۸۳ ۔ ****تاج و راغب ۔ *****محیط ۔

کی فطرت کے اندر نیکی اور بدی ، خیر اور شر ، حق اور باطل کی تمیز کی استعداد رکھدی ہے ۔ یہ معنی بوجوہ غلط ہیں ۔ کائنات میں انسان کے علاوہ ، ہر شے کو بطور جبلت (Instinct) اس راستے کی راہ نمائی عطا کر دی گئی ہے جس پر اسے چلنا ہے ۔ پانی کی فطرت میں یہ داخل ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے ۔ بکری کی جبلت میں یہ چیز داخل ہے کہ وہ گھاس کھائے اور گوشت سے پرہیز کرے۔ اگر اسی طرح انسان کے اندر بھی خیر و شر کی تمیز رکھدی جاتی تو ہر انسان ایک ہی راستے پر چلتا ۔ (جسطرح ہر بکری گھاس ہی کھاتی ہے)۔ اور اس میں اس کے اختیار اور ارادے کا کوئی دخل نہ ہوتا ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ صورتِ حال ایسی نہیں ۔ ہر انسان ایک ہی راستہ پر نہیں چلتا ۔ اس سے ظاہر ہے کہ حق اور باطل کی تمیز انسان کی فطرت کے اندر داخل نہیں کی گئی ۔

کہا جاتا ہے کہ یہ تمیز انسان کی فطرت کے اندر تو ہے لیکن ماحول اور تعلیم کا اثر اس کی فطرت کو مسخ کر دیتا ہے اور انسان وہ کچھ بن جاتا ہے جو کچھ اسے اس کے ماں باپ یا معاشرہ بنا دے۔ اگرانسان پر یہ خارجی اثرات نہ ہوتے تو ہر بچہ حق کے راستے پر از خود چلتا۔ یہ بھی غلط ہے۔ ایسے بچے پائے گئے ہیں جو پیدائش کے ساتھ ہی (کسی حادثے کی وجہ سے) انسانوں کی بستیوں سے الگ ہو کر جنگل میں چلے گئے اور وہاں ان کی پرورش انسانی اثرات سے یکسر دور رہ کر ہوئی ۔ لیکن جب وہ بڑے ہوئے تو بالکل جانور تھے ۔ حق و باطل کی تمیز تو ایک طرف ، ان میں کھانے پینے کے معاملہ میں بھی انسانی بچوں کی سی تمیز نہ تھی ۔ لہذا یہ تصور صحیح نہیں کہ خیرو شر کی تمیز انسان کی فطرت کے اندر رکھدی گئی ہے ۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے لفظ فِطْرَت" عنوان ف ۔ ط ۔ ر۔ میں)

اس آیت (۹۱/۸) کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اس انداز سے ہوئی ہے کہ اس کے اندر وہ قوتیں بھی رکھدی گئی ہیں جن سے انسانی ذات (Personality) ٹکڑے ٹکڑے (Disintegrate) ہو جاتی ہے ۔ (فُجُوْرَھَا ۔ دیکھئے عنوان ف ۔ ج ۔ ر) اور وہ قوتیں بھی جن کی رو سے یہ اس انتشار (Disintegration) سے محفوظ رہ سکتی ہے ۔(تَقْوٰھَا۔ دیکھئے عنوان و۔ ق ۔ ی)۔ فُجُوْرَھَا اور تَقْوٰھَا کی "ھا" خود،اسکی دلالت کرتی ہے کہ یہ دونوں "نفس" کی کیفیات ہیں ۔ اس لئے اس کے معنی یہی ہیں کہ نفس انسانی (انسانی ذات) میں یہ ہر دو ممکنات رکھ دئے گئے ہیں ۔ اس کے بعد ، یہ انسان

کے اپنے اختیار کی بات ہے کہ وہ ان ممکنات یا مضمر قوتوں (Latent Faculties) کو نشو نما دیکر انہیں کس راستے میں صرف کرتا ہے ۔ وہ انسے اپنی ذات کی نشو نما کا کام لیتا ہے یا اس کی تخریب اور تدسیہ کا ۔ (قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۱۰-۹/۹۱))۔

باقی رہا یہ تصور کہ فلاں بزرگ کو خدا کیطرف سے الہام ہوتا ہے تو اس کی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی ۔ قرآن کریم کی رو سے ، علم کے سر چشمے دو ہی ہیں ۔ ایک وحی ۔ یعنی خدا کی طرف سے براہ راست علم کا ملنا ۔ یہ حضرات انبیاء کرامؑ کے ساتھ مخصوص تھا اور ختم نبوت کے ساتھ اسکا سلسلہ بھی ختم ہو گیا ۔ دوسرا ، عقلِ انسانی (Human Intellect)۔ اس میں ہر انسان شریک ہوتا ہے ۔ لہذا ، ختم نبوت کے بعد ، اب دو چیزیں ہمارے پاس رہ گئیں ۔ ایک تو وحی کی رو سے ملی ہوئی تعلیم ، جو قرآن کریم کے اندر ہے ۔ اور دوسرے عقل انسانی ۔ اب صحیح راستہ یہ ہے کہ زندگی کے معاملات کا حل قرآن کریم کی روشنی میں انسانی عقل و بصیرت کے رو سے کیا جائے ۔ بنابریں، یہ تصور کہ رسول اللہؐ کے بعد ، کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہ راست کوئی علم عطا ہوتا ہے (جسے کشف یا الہام کہتے ہیں) ایسا عقیدہ ہے جس سے ختم نبوت کی مہر ٹوٹتی ہے ۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اسکی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی ۔ نہ ہی کشف ، الہام ، وحیِ خفی ، وغیرہ اصطلاحات کا کوئی ذکر رسول اللہؐ کے زمانہ میں ملتا ہے ۔ یہ سب اصطلاحات بعد کی وضع کردہ ہیں اور دوسروں سے مستعار لی ہوئی ۔ (دیکھئے عنوانِ و ۔ ح ۔ ی)۔

انسان اگر اپنی قوت خیال یا قوت ارادی کو ایک خاص طریق سے (Develop) کر لے تو اس سے بعض ایسی باتیں سرزد ہونے لگتی ہیں جو عقلِ عامہ کی رو سے مستبعد ہوتی ہیں۔ لوگ انہیں خوارقِ عادات یا کرامات سمجھنے لگ جاتے ہیں ، اور جس سے ایسی باتیں سرزد ہوں ، اسے صاحب کشف و الہام قرار دیتے ہیں، اور "روحانی قوتوں" کا مالک ۔ لیکن ان باتوں کو "روحانیت" (یا دین) سے کوئی تعلق نہیں ۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے ، یہ محض قوتِ ارادی کی نشو و نما (Development) کے کرشمے ہیں جسے ہر انسان (بلا تمیز مذہب و ملت) خاص مشق کے ذریعے حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ اب مغرب (بالخصوص امریکہ) میں ، اسے بطور فن کے حاصل کرنے کی درسگاہیں قائم ہو رہی ہیں اور اس سے اعصابی بیماریوں کے علاج میں مدد لی جاتی ہے ۔

اسے پھر اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہئیے کہ خدا سے براہ راست علم ، صرف وحی کے ذریعے مل سکتا ہے جو حضرات انبیاء کرام[ؑ] سے مخصوص ہے ۔ اور چونکہ اب نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اس لئے اب کسی شخص کو خدا سے براہ راست علم حاصل نہیں ہو سکتا ۔ وحی کو الہام بھی نہیں کہنا چاہئیے ۔ اور نہ ہی یہ عقیدہ رکھنا چاہئیے کہ اب کسی شخص کو خدا بذریعہ الہام براہ راست علم عطا کرتا ہے ۔

ل ھ و

لَهْوٌ اور لَعِبٌ ۔ دونوں ہم معنی الفاظ ہیں (دیکھئیے عنوان ل ۔ ع ۔ ب) لیکن علمائے لغت نے ان میں فرق کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ ان دونوں میں یہ چیز مشترک ہے کہ انسان بے سود اور بے معنی باتوں میں مشغول ہوتا ہے اور جذباتی اور عارضی مسرت کے پیچھے پڑتا ہے ۔ لیکن لَهْوٌ کا لفظ لَعِبٌ سے عام ہے ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ لَعِبٌ سے مراد ہے جلدی سے مسرت حاصل کرنا اور اس سے دل کو راحت و آرام پہنچانا اور لَهْوٌ سے مقصود ہے خواہشات اور طرب جو انسان کی توجہ اور فکر کو مصروف کر دیں ۔ اس کے برعکس طرسوسی کا کہنا ہے کہ لَهْوٌ اس لذت کو کہتے ہیں جو ناپائدار ہو یا وہ لذت جو انسان کی توجہ اہم کاموں سے ہٹا کر غیر اہم کاموں کی طرف منعطف کر دے ۔ یا ایسے کاموں کو کہتے ہیں جن کی کوئی صحیح غرض نہ ہو* ۔ راغب نے بھی یہی کہا ہے کہ لَهْوٌ سے مراد ایسے امور ہیں جو انسان کو اہم کاموں سے باز رکھیں** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) کسی چیز کے ذریعہ دوسری چیز سے توجہ کا ہٹ جانا (۲) کسی چیز کو ہاتھ سے چھوڑ دینا ۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ انسان کی زندگی ایک عظیم مقصد لئے ہوئے ہے اس لئے اسے بڑی سنجیدگی سے (Seriously) لینا چاہئیے ۔ لہذا ہر وہ کام جس سے یونہی پیش پا افتادہ مفاد یا ناپائدار مسرت تو حاصل ہو جائے لیکن زندگی کا اصل مقصود نگاہوں سے گم ہو جائے ، لَهْوٌ اور لَعِبٌ میں داخل ہے ۔ اسی لئے قرآن کریم نے الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۔ یعنی فوری عیش اور مفادات عاجلہ کی زندگی (یا محض حیوانی سطح پر طبعی زندگی) کو لَعِبٌ ولَهْوٌ کہا ہے (۶/۳۲) ۔ واضح رہے کہ قرآن کریم اس دنیا کی زندگی کو بھی بڑی اہمیت دیتا ہے ۔ وہ جس بات کو لَهْوٌ وَلَعِبٌ قرار دیتا ہے وہ یہ

*تاج ۔ **راغب ۔

نظریہ ہے کہ انسان زندگی کے بلند مقصد کو چھوڑ کر عارضی طرب انگیزیوں کے پیچھے پڑ جائے - یعنی زندگی کو حیوانی سطح پر رکھے - اسے بلند انسانی سطح پر نہ لے جائے - انہی باتوں کو اس نے لَهْوَ الْحَدِيْثِ (۳۱/۶) کہا ہے - لیکن اگر اس آیت میں اَلْحَدِيْثُ کے معنی قرآن کریم لئے جائیں تو لَهْوَ الْحَدِيْثِ کے معنی ہونگے ایسی باتیں جو انسان کو قرآن کریم سے غافل کر دیں -

اس زاویہ نگاہ کو جس کی رو سے انسان زندگی کے اہم حقائق کو سنجیدگی سے (Seriously) نہ لے لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ (۲۱/۳) سے تعبیر کیا گیا ہے -

اسی سے اَلْهٰى کے معنی ہیں ، مصروف رکھنا - مشغول کر دینا - مقصد کو نگاہوں سے اوجھل کرکے دوسری باتوں میں لگا دینا - قرآن کریم میں ہے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲/۱-۲) - '' تکاثر '' نے زندگی کے اہم مقاصد کو تمہاری نظروں سے اوجھل کرکے تمہیں اور ہی طرف لگا رکھا ہے اور تم اسی روش پر چلے جاتے ہو تاآنکہ تم قبر تک پہنچ جاتے ہو - تَكَاثُرٌ کے معنی ہیں ایک دوسرے سے مال و دولت میں بڑھ جانے کی ہوس - غور کیجئے ، قرآن کریم نے کسطرح دو لفظوں میں انسان کی پوری تگ و تاز اور نوع انسانی کی تاریخ کی داستان کا نقشہ کھینچ کر رکھدیا ہے - آپ ان لوگوں کو دیکھئے جن کے پاس اتنا کچھ جمع ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر کے لئے ان کی اور انکی اولاد کی ضروریات زندگی کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہو - لیکن اس کے باوجود آپ دیکھینگے کہ وہ دولت سمیٹنے کے لئے دیوانہ وار سارے مارے پھر رہے ہونگے - وہ ایسا کیوں کرتے ہیں ؟ محض دوسروں سے آگے بڑھ جانے کے لئے - یہی جذبہ دنیا میں ساری تباہیوں کا موجب ہے - افراد کے لئے بھی اور اقوام کے لئے بھی - مسابقت (دوسروں سے آگے بڑھ جانے) کا جذبہ انسان کے اندر ہے - قرآن کریم بھی اس جذبہ کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے لیکن اس کے لئے میدان دوسرا تجویز کرتا ہے - وہ کہتا ہے کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (۲/۱۴۸) - ایک دوسرے سے آگے بڑھنا ہے تو ان کاموں میں بڑھو جن میں نوع انسانی کی وسعتوں اور بھلائیوں کا راز پوشیدہ ہو -

تَلَهّٰى عَنْهُ - کسی سے بے رخی برتنا - توجہ کو اسکی طرف سے ہٹا کر دوسری طرف مبذول کر لینا (۸۰/۱۰) - اَللَّهْوُ وَاللَّهْوَةُ - وہ عورت جس سے لَهْوٌ اور دلبستگی کا کام لیا جائے - پھر لَهْوٌ مجازاً عورت کو کہنے لگے * -

*تاج -

چنانچه صاحب تاج العروس نے لکھا ھے کہ سورہ انبیاء میں جو ھے لَوْ اَرَدْنَا اَنْ نَتَّخِذَ لَهْوًا (۲۱/۱۷) ۔ تو اس میں لَهْوًا سے مراد عورت ھے *۔ (لیکن یہ تکلف ھے ۔ وھاں بھی لَهْوًا کے معنی بے مقصد و بے حقیقت شے کے ھیں)۔ ابن قتیبہ نے لَهْوٌ کے معنی بیٹا ، عورت اور نکاح کے لکھے ھیں** ۔ راغب نے لکھا ھے کہ جن لوگوں نے اس سے عورت یا بیٹا مراد لیا ھے انہوں نے اس لفظ کی عمومیت کو بعض چیزوں میں مخصوص کر دیا ھے۔

(لَهْوٌ کے ساتھ ل ۔ ع ۔ ب کا عنوان بھی دیکھئے تاکہ پوری حقیقت بیک وقت سامنے آجائے)

لَوْ (حرف)

لَوْ ۔ (۱) اِنْ (اگر) کے معنوں میں ۔ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۶/۱۰۲) ۔ سو اگر ھمیں ایک بار لوٹ کر جانے کی مہلت مل جائے تو ھم مومنوں میں سے ھو جائیں ۔ واضح رھے کہ لَوْ بالعموم ایسے امور کے لئے آتا ھے جن کا وقوع میں آنا ممکن نہ ھو۔ یعنی محض فرضی طور پر ایسا کہا جائے ۔ جیسا کہ اوپر کی آیت میں آیا ھے ۔ یعنی ان کا لوٹ آنا ممکنات میں سے نہیں ۔ اس کا ترجمہ ''بفرض محال'' کیا جائے تو بہتر ھوگا ۔

(۲) ''اگر'' کے ساتھ ۔ ''اے کاش'' (تمنا) کے معنوں میں ۔ مندرجہ بالا مثال میں بھی تمنا پائی جاتی ھے۔ ''اے کاش اگر کہیں ایسا ھو جائے تو''۔ جیسے لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ (۱۵/۲) ۔

(۳) اَنْ (کہ) کے مفہوم میں ۔ وَدَّ كَثِيْرٌ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا (۲/۱۰۹) ۔ اھل کتاب میں سے اکثر وہ ھیں جو یہ چاھتے ھیں کہ تمہیں ایمان لانے کے بعد پھر سے کافر بنا دیں ۔ (اگرچہ یہاں کاش کا مفہوم بھی پایا جاتا ھے) ۔

(۴) لَوْ کے ساتھ لائے نفی بھی آتا ھے ۔ لَوْلَا اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ (۳۴/۳۱) اگر تم نہ ھوتے تو ھم ضرور مومن ھوتے ۔

(۵) ''کیوں نہیں'' کے معنوں میں ۔ لَوْلَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ (۶/۸) اسکی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہ اُتارا گیا ۔

*تاج ۔ **القرطبین ج/۲ صفحہ ۱۹ ۔

(٦) لَوْلاَ ۔ نہیں کے معنوں میں ۔ فَلَوْلاَ كَانَتْ قَرْيَةٌ ۔ ۔ ۔ ۔ (١٠/٩٨) ۔ ایسی کوئی بستی نہ ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(٧) بعض اوقات ۔ لَوْلاَ کی بجائے لَوْمَا بھی آتا ہے ۔ لَوْمَا تَأْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (١٥/٧) ۔ اگر تو سچوں میں سے ہے تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لے آتا ؟

ل و ح

اس مادہ کے اہم بنیادی معنی ظاہر ہونے اور چمکنے کے ہیں ۔ اَلَاحَ الْبَرْقُ ۔ بجلی چمکی (ابن فارس) ۔ اَللَّوْحُ ۔ ہر پھیلی ہوئی ، چوڑی لکڑی یا ہڈی ۔ جمع اَلْوَاحٌ*۔ سورۃ اعراف میں ہے وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً (٧/١٤٥) ۔ ہم نے تمام امور کے اخلاق اقدار ، موسیٰؑ کے لئے تورات میں فرض قرار دے دیئے ، جو تختیوں پر لکھی ہوئی تھی ۔ یا ہم نے انہیں موسیٰ کے لئے تختیوں میں جمع کر دیا تھا ۔ حضرت نوحؑ کی کشتی کو ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّ دُسُرٍ (٥٤/١٣) کہا گیا ہے ۔ یعنی جو تختوں اور کیلوں سے بنائی گئی تھی ۔

قرآن کریم کے متعلق ہے ۔ فِىْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (٨٥/٢٢) ۔ اسی کو دوسری جگہ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ (٥٦/٧٨) کہا گیا ہے ۔ اس سے مراد ہے علم خداوندی جو ہر قسم کے خارجی اثرات سے محفوظ اور فنا اور تغیر سے مصؤن ہے ۔ یہ کتاب (قرآن) علم خداوندی ہی میں محفوظ نہیں بلکہ ہمارے پاس (کتابی شکل میں) بھی محفوظ ہے ۔

اَللَّوْحُ کے معنی چمکنا نیز دیکھنا بھی ہیں ۔ لَاحَهٗ بِبَصَرِهٖ لَوْحَةً ۔ اُس نے اُسے دیکھا پھر وہ چیز چھپ گئی ، یعنی اس کی ایک جھلک دیکھی ۔ نیز اس کے معنی پیاس کے بھی ہیں* ۔ لَوَّحَهٗ بِالنَّارِ تَلْوِيْحًا ۔ اس کو آگ میں تپایا ۔ یہیں سے لَوَّاحٌ کے معنی ہیں جلا اور جھلسا کر رنگ متغیر کر دینے والا* ۔ قرآن کریم میں دوزخ کی آگ کے متعلق ہے ۔ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ (٧٤/٢٩) ۔ چمڑے کو جھلسا کر اس کا رنگ بدل دینے والی ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ لَوَّحَتْهُ الْحَرُّ کے معنی ہیں گرمی نے اُسے جلا دیا اور سیاہ کر دیا حتکہ وہ دور سے نظر آنے لگ گیا ۔ لَوَّحَ الرَّجُلُ تَلْوِيْحًا ۔ اُس آدمی نے دور سے اشارہ کیا** ۔ اَلَاحَ الْبَرْقُ ۔ بجلی کوندی ۔ لَاحَ النَّجْمُ

---

*تاج ۔ **محیط ۔

ستارہ چمکا*۔ لہذا لَوْحٌ میں روشنی اور چمک کا پہلو بھی ہے ۔ ہر آسمانی کتاب میں روشنی اور چمک ہوتی ہے ۔ قرآن کریم کو (۳/۱۷۵) اور تورات کو (۶/۹۲) میں نور کہا گیا ہے ۔

ل و ذ

اَللَّوْذُ بِالشَّیْیءِ ۔ کسی چیز کے پیچھے چھپ جانا اور اس طرح محفوظ ہو جانا ۔ اَللَّوْذُ ۔ پہاڑ کا کنارہ ۔ وادی کا موڑ ۔ اَلْمَلَاذُ ۔ جائے پناہ ۔ قلعہ ۔ اَلْمُلَاوَذَۃُ وَ اللِّوَاذُ ۔ ایک دوسرے کی آڑ لینا ، چھپنا اور ایک دوسرے کی آڑ میں آنا ۔ کترانا اور چال چلنا* ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْکُمْ لِوَاذًا (۲۴/۶۳)۔ جو تم میں سے چپکے چپکے کھسک کر نکل جاتے ہیں ۔ لیکن زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی مخالفت کرنے کے ہیں اور اس آیت کے اگلے الفاظ دلالت کرتے ہیں* ۔ لیکن پہلے معنوں میں بھی عدول حکمی کا مفہوم واضح ہے ، کیونکہ چپکے چپکے وہی کھسکتے ہیں جو تعمیلِ حکم نہیں کرنا چاہتے ۔

لوط علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے برادر زادہ ، حضرت لوطؑ ، اول الذکر کے ساتھ ہجرت کر کے فلسطین کیطرف تشریف لے آئے تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی شرف نبوت سے سرفراز فرمایا اور سدوم کی طرف جانے کے لئے حکم دیا ۔ یمن سے بحر احمر (Red Sea) کے کنارے کنارے قدیمی تجارتی قافلوں کی ایک سڑک حجاز اور مدین سے گزر کر عقبہ وغیرہ تک چلی گئی ہے ۔ سدوم کی بستی اسی شاہراہ پر واقع تھی ۔ قیاس ہے کہ یہ علاقہ بحر میت (Dead Sea) کے قریب تھا ۔ زلزلوں کی وجہ سے اس کا بہت سا حصہ سمندر کے نیچے آ گیا ۔ جس قوم کی طرف حضرت لوطؑ نبی بنا کر بھیجے گئے تھے وہ اس علاقہ میں آباد تھی ۔ قرآن کریم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قوم میں آپ سے پہلے اور رسول بھی آچکے تھے اور حضرت لوطؑ ان میں اتنا لمبا عرصہ رہے کہ انہیں ان کا بھائی بند (اَخُوْھُمْ) کہکر پکارا گیا (۲۶/۱۶۰) ۔

یہ قوم (لواطت کی) شرمناک فحاشی میں مبتلا تھی (۲۶/۱۶۵) ۔ اس کے علاوہ، وہ ''قطع السبیل''۔ رہزنی اور قزاقی کے جرائم کی بھی مرتکب ہوتی تھی ۔ (۲۹/۲۹)

*تاج و راغب ۔

آپ نے انہیں ان اعمال شنیعہ سے رکنے کی تلقین کی لیکن انہوں نے ایک نہ مانی ۔ اور وہ تباہ ہو گئی۔

قوم سدوم کا علاقہ آتش فشاں پہاڑوں اور گندھک کی کانوں سے پٹا پڑا تھا۔ جب یہ پہاڑ پھٹتے ہیں تو ان کے دھانے سے راکھ اور پتھروں کا مینہ برسنے لگ جاتا ہے جس کی بوچھاڑ دور دور تک جاتی ہے ۔ قوم لوط کی تباہی کے وقت بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آتش فشاں پہاڑوں سے اسی قسم کی سنگ باری ہوئی ۔ گندھک کی کانوں میں آگ بھڑک اٹھی - پھر ایسے زلزلے آئے جن سے زمین نیچے دھنس گئی اور بحر میت کا پانی اوپر چڑھ آیا ۔ قرآن کریم نے ان تفاصیل کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے ۔ سورۃ اعراف میں ہے وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا ($\frac{7}{84}$)۔ ''ہم نے ان پر سخت مینہ برسایا'' ۔ دوسری جگہ ہے اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِنْ سِجِّيلٍ مَنْضُودٍ ($\frac{11}{82}$) ۔ ''ہم نے اس قوم پر آگ میں پکے ہوئے پتھروں کا مینہ برسایا'' ۔ سورۃ حجر میں ہے فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ ($\frac{15}{73}$) ۔ ''ایک ہولناک آواز نے انہیں آلیا'' ۔ سورۃ قمر میں ہے اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا ($\frac{54}{34}$) ۔ ''ہم نے ان پر سنگ باری کا طوفان بھیجا'' ۔

(طبعی حوادث کس طرح خدا کا عذاب بنتے ہیں ، اس کے لئے میری کتاب ''جوئے نور'' میں حضرت نوح کا عنوان ملاحظہ کیجئے)۔

ویسے لَاطَ الشَّيْءُ بِقَلْبِي کے معنی ہیں ''وہ چیز میرے دل کے ساتھ چمٹ گئی''*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں ۔

ل و م

لَامَ ۔ ملامت کرنا ۔ کسی کو بہت زیادہ برا بھلا کہنا **۔ قرآن کریم میں ہے ۔ فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا اَنْفُسَكُمْ ($\frac{14}{22}$) ۔ تم مجھے ملامت نہ کرو ۔ خود اپنے آپ کو ملامت کرو۔

لَوْمَةٌ ۔ ملامت ۔ لَائِمٌ ۔ ملامت کرنے والا ۔ لَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ($\frac{5}{54}$) ۔ وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے ۔ لَوَّامٌ ۔ وہ جو بہت زیادہ ملامت کرے ۔ مَلُومٌ ۔ ملامت کیا ہوا ($\frac{51}{54}$) ۔ مُلِيمٌ ۔ قابل ملامت ($\frac{37}{142}$) ۔ يَتَلَاوَمُونَ ($\frac{68}{30}$) ۔ ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے ۔

---

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔

لَوْمَۃٌ انتظار کو کہتے ھیں *۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی عتاب اور ملامت اور (۲) دیر کرنے کے لکھے ھیں۔

قرآن کریم میں اَلنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ آیا ھے (۷۵/۲)۔ اسکے تفصیلی مفہوم کے لئے (ن ۔ ف ۔ س) کا عنوان دیکھئے ۔ یہاں اتنا سمجھ لینا ضروری ھے کہ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو اسے از خود یہ بتا دے کہ فلاں بات حق اور فلاں باطل ھے ۔ اسکی راہ نمائی ھمیں صرف وحی سے مل سکتی ھے ۔ (دیکھئے عنوان ل ۔ ھ ۔ م)۔ البتہ انسان کے اندر ایک ایسی قوت ھے کہ جس بات کو وہ غلط سمجھتا ھے اس کے ارتکاب پر وہ اسے ملامت کرتی ھے ۔ اسی کو ضمیر یا (Conscience) کہا جاتا ھے ۔ لہذا ضمیر کی آواز حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتی ۔ وہ اسبات کی تائید کریگی جسے آپ اچھا سمجھتے ھیں اور اس پر ملامت کریگی جسے آپ برا سمجھتے ھیں ۔ وہ جینی کے بچے کو گوشت کھانے کے ارادہ پر ملامت کریگی لیکن مسلمان کے بچے کو گوشت کھانے پر آمادہ کریگی ۔ اس لئے ضمیر کی آواز حق و باطل کا معیار نہیں قرار پا سکے گی ۔ " فتوی " ھمیشہ وحی سے لینا چاھئے ، نہ کہ اپنے دل سے ۔ ٹھگوں کا دل انہیں کبھی مسافر کشی پر ملامت نہیں کرتا ۔ ڈاکو کا دل اسے رہزنی پر کبھی نہیں ٹوکتا ۔ عصر حاضر کے مہذب ٹھگوں اور ڈاکوؤں (بالا دست اقوام کے " محب الوطنوں ") کا دل انہیں کبھی اس پر ملامت نہیں کرتا کہ وہ کمزور اقوام کے خون کو اپنی قوم کے محلات کی آرائش کا موجب نہ بنائیں ۔ لہذا غلط اور صحیح کا فیصلہ خدا کی وحی کر سکتی ھے ، انسان کا دل نہیں ۔

ل و ن

اَللَّوْنُ ۔ ہر وہ خصوصیت جو کسی چیز کو دوسری چیز سے ممتاز کردے ۔ نوع ۔ صنف ۔ قسم *۔ لیکن چونکہ مختلف چیزوں کا سب سے پہلا امتیازی نشان ان کا رنگ ھوتا ھے اسلئے لَوْنٌ کے معنی رنگ کے ھو گئے ۔

اِلْوَنَّ ۔ رنگدار ھوگیا ۔ اَلْمُتَلَوِّنُ ۔ وہ جو ایک حالت پر قائم نہ رھے ۔ رنگ بدلتا رھے *۔

قرآن کریم نے اختلاف السنہ (زبانوں) اور اَلْوَان (رنگوں) کو صاحبانِ علم و بصیرت کے لئے ادراک حقیقت کی نشانیاں قرار دیا ھے (۳۰/۲۲) ۔ اس میں رنگ (اَلْوَانٌ) سے مراد نسلیں (Races) ھیں جن سے متعلق تحقیق ،

*تاج ۔

علم الانسان کا بہت بڑا شعبہ ہے ۔ لیکن اگر اَلْوَانٌ کے معنی عام رنگ (Colours) لئے جائیں تو بھی اس آیت میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے ۔ دورِ حاضر کی تحقیق یہ ہے کہ انسانیت کے ارتقائی مراحل میں اگر یہ دیکھنا ہو کہ فلاں دور میں فلاں قوم کی ذہنی سطح کیا تھی تو اس کے لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس دور میں وہ قوم کتنے مختلف رنگوں (Colours) کو پہچانتی تھی ۔ وہ قوم جتنے زیادہ رنگوں سے متعارف ہو، اتنی ہی بلند اسکی ذہنی سطح ہوگی ۔ یعنی رنگوں کی تمیز کا انسان کی ذہنی نشو و نما سے خاص تعلق ہے ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے ڈاکٹر (Bucke) کی کتاب (Cosmic Consciousness)

سورہ نحل میں ہے وَمَا ذَرَأَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ۔ (۱۶/۱۳) اس کے معنی انواع و اقسام کے ہیں ۔

ل و ی

لَوَى الْحَبْلَ ۔ يَلْوِيْهِ لَيًّا ۔ رسّی کو بٹا اور دوہرا کر دیا ۔ لَوَى بِرَأْسِهِ ۔ اس نے اپنا سر پھیر لیا ۔ یعنی اعراض کیا[1]* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو موڑ دینے کے ہیں (۵/۱۳) ۔ لَوَى لِسَانَهُ بِكَذَا ۔ کنایہ ہے جھوٹ بولنے اور اٹکل پچو باتیں بنانے سے** ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے ۔ يَلْوُوْنَ أَلْسِنَتَهُمْ (۳/۷۷) ۔ اور لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ (۴/۴۶) ۔ اس سے بھی مطلب ہے ۔ یعنی زبان کو توڑ مروڑ کر باتیں کرنا ۔ جھوٹ بولنا ۔ افترا پردازی کرنا ۔

ل ی ت

لَاتَهُ ۔ يَلِيْتُهُ عَنْ كَذَا ۔ اسے کسی چیز سے پھیرا، موڑا ۔ لَاتَهُ وَ أَلَاتَهُ ۔ اسے کم کیا ۔ اس کا پورا حق نہ دیا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَللِّيْتُ گردن کے ایک پہلو کو کہتے ہیں ۔ اور اَللَّيْتُ ۔ کم کردینے کو ۔ اور یہ کہ ان دونوں معانی میں کوئی قیاس نہیں چلتا ۔ سورۃ حجرات میں ہے لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا (۴۹/۱۴) ۔ وہ تمہارے اعمال میں سے کچھ بھی کمی نہیں کریگا ۔ سورۃ طور میں ہے وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ (۵۲/۲۱) ۔ اس کے معنی بھی کمی کرنے کے ہیں ۔ (بعض نے کہا ہے کہ یہ أَلَتَ سے ہے اور لَاتَ اور أَلَتَ کے ایک ہی معنی ہیں ۔ بعض نے اسے وَلَتَ سے کہا ہے ۔ چنانچہ اسے وہاں بھی لکھ دیا گیا ہے) ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔

[1] (مزید) لَوَّى رَأْسَهُ کے بھی یہی معنی ہیں لیکن اس میں لَوَى سے زیادہ شدت و مبالغہ پایا جاتا ہے ۔

لَیْتَ (حرف)

لَیْتَ - اے کاش (یہ حرف تمنا ہے) - یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ ھٰذَا (۱۹/۲۳) - اے کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتی....

لَیْسَ

لَیْسَ - نہیں کے معنوں میں آتا ہے - لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ .... (۲/۱۷۷)- یہ کشاد کی راہ نہیں ہے کہ....

اس فعل سے صرف ماضی کی شکلیں استعمال ہوتی ہیں - مثلاً لَسْتَ - لَسْتُ - لَیْسُوْا - لَسْتُمْ - لَسْتُنَّ - وغیرہ -

ل ی ل

اَللَّیْلُ وَاللَّیْلَۃُ - رات، جو غروب آفتاب سے طلوع فجر صادق تک یا طلوع آفتاب تک ہوتی ہے *- صاحب محیط نے لکھا ہے کہ عبرانی میں رات کو لَیْل کہتے ہیں اور سریانی میں لِلْیا **- لَیْل کی جمع لَیَالٍ اور اللَّیَالِیْ آتی ہے -

سورہ مریم میں حضرت زکریاؑ کے متعلق ہے - لَا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا (۱۹/۱۰) - اس کے معنی تین راتیں نہیں بلکہ تین شب و روز ہیں (متواتر تین دن تک جن میں راتیں بھی شامل ہیں)- اس لئے کہ (۳/۴۰) میں اسے ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ کہا گیا ہے - لیکن ان دونوں آیات کے مضمون میں ذرا سا باریک فرق بھی ہے - (۳/۴۰) میں کہا گیا ہے کہ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا- اور (۱۹/۱۰) میں اِلَّا رَمْزًا نہیں ہے - اس لئے دنوں کے لئے حکم الگ تھا اور راتوں کے لئے الگ -

سورہ ابراھیم میں نزول قرآن کریم کا مقصد بتایا گیا ہے لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (۱۴/۱) - تاکہ تو نوع انسانی کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے - یعنی نزول قرآن کے وقت نوع انسانی تاریکی میں تھی، قرآن کریم کی راہ نمائی انہیں روشنی میں لے آئی - اس جہت سے، اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کو جس میں قرآن کریم دنیا کو ملا، لَیْلٌ کہکر پکارا ہے - یعنی وہ زمانہ جس میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی - روشنی کا

*تاج - **محیط -

کہیں نشان تک نہیں تھا - اس دور میں قرآن کریم نازل ہوا جس نے دنیا کو نئی اقدار سے روشناس کرایا - تاریکی میں انسان کے لئے (حقیقی یا محض خیالی) خطرات بھی ہوتے ہیں - روشنی کی وجہ سے یہ خطرات سلامتی میں تبدیل ہو گئے - پھر، اس روشنی کی تکمیل اسطرح سے ہوئی کہ رات کا کوئی حصہ باقی نہ رہا - هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷/۵) - ساری دنیا خدا کے نور سے جگمگا اٹھی - اسطرح یہ تاریک دور، قرآن کریم کی روشنی کی وجہ سے نوع انسان کے لئے سلامتی اور برکات کا دور بن گیا (۴۴/۳) -

ل ی ن

لَانَ الشَّيْءُ - چیز نرم ہوئی - اَلَنْتُهٗ - میں نے اسے نرم کر دیا *-

اللِّيْنُ - نرم - قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے لِنْتَ لَهُمْ (۳/۱۵۸) - تو ان کے لئے نرم واقع ہوا ہے - یعنی فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ نہیں (۳/۱۵۸) - (دیکھئے عنوان ف - ظ - ظ اور غ - ل - ظ) - لیکن یہ لینت ان کے لئے تھی جو حق وصداقت کے سامنے جھک کر حضورؐ کے ساتھ شامل ہو گئے تھے - جو لوگ حق کی مخالفت میں نبردآزما تھے ان کے مقابلہ میں حضورؐ اور آپ کے ساتھی ''اشداء'' تھے (۴۸/۲۹) -

حضرت داؤدؑ کے متعلق ہے - وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ (۳۴/۱۰) - ہم نے اس کے لئے لوہے کو نرم کر دیا - یعنی اسے، لوہا گلا کر یا تپا کر، اسلحہ سازی وغیرہ کی صنعت کا علم دیدیا - سورہ طٰہٰ میں ہے - فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (۲۰/۴۴) - تم دونوں اس (فرعون) سے نرمی سے بات کرنا -

اَللِّيْنَةُ - کھجور کا درخت * - تاج نے تصریح کی ہے کہ یہ اس کھجور کے درخت کو کہتے ہیں جو دو اعلٰی قسم کی کھجوروں کے علاوہ ہو (۵۹/۵) - بیشتر اہل لغت نے اسے (ل - و - ن) میں دیا ہے -

---

*تاج و محیط۔

م

مَا

مَا ۔ (۱) جو کچھ ۔ (اَلَّذِی) کے معنوں میں ۔ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ (۱۶/۹۶) ۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ جاتا رہے گا ۔

(۲) مَنْ (جو ۔ جس) کے معنوں میں ۔ وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِنَ النِّسَآءِ ...... (۴/۲۲) ۔ جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے تم نکاح مت کرو ۔

(۳) ''کیا چیز ۔ کونسی چیز ۔ کس چیز'' کے معنوں میں (استفہامیہ) ۔ وَمَا تِلْكَ ...... (۲۰/۱۷) ۔ اور یہ کیا چیز ہے ۔

(۴) شرط کے معنوں میں ۔ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ (۹/۷) ۔ جب تک وہ تمہارے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں پر قائم رہیں تم بھی ان کے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں پر قائم رہو ۔

(۵) تعجب (کیسے) کے معنوں میں ۔ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (۲/۱۷۵) ۔ سو ان کا تباہ کن روش پر قائم رہنا کیسا تعجب انگیز ہے ۔ دراصل یہ پورا مرکب اظہار تعجب کے لئے بولا جاتا ہے (اکیلا مَا نہیں بلکہ مَا اَفْعَلَ کے وزن پر) ۔

(۶) ''جہانتک'' کے معنوں میں ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (۶۴/۱۶) ۔ جہاں تک تمہاری استطاعت میں ہو قانون خداوندی کی نگہداشت کرو ۔

(۷) لَيْسَ (نہیں) کے معنوں میں ۔ فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ (۲/۱۶) ۔ سو ان کی تجارت فائدہ مند ثابت نہ ہوئی ۔

(۸) کبھی یہ زائد بھی ہوتا ہے ۔ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۷/۱۰) ۔ تم میں سے بہت کم شکر گذار ہوتے ہیں ۔ اگرچہ یہاں مَا (اَلَّذِی) کے معنوں میں بھی ہو سکتا ہے ۔

(نوٹ) ۔ کبھی مَا کی جگہ صرف مَ ھی آجاتا ہے ۔ جیسے بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ (۲۷/۳۵) ''قاصد (جواب میں) کس چیز کے ساتھ واپس آتے ہیں'' ۔

(۹) مَاذَا ۔ ’’کیا‘‘ (استفہامیہ) کے معنوں میں ۔ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ($\frac{۲}{۲۱۵}$) ۔ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا (یا کسقدر) کھلا رکھیں ؟ مَا + ذَا ۔ مَا استفہامیہ اور ذَا بمعنی موصول ہے ۔ اور دونوں کا مرکب استفہام کا مفہوم دیتا ہے ۔ یہ وہی ہے جو اوپر (۳) میں گذر چکا ہے ۔ صرف اس کے آگے ذَا بڑھایا گیا ہے ۔

م أ ی

مَأَیْ فِیْہِ ۔ مبالغہ کیا اور تعمق سے کام لیا ۔ اَلْمِائَۃُ ۔ ایک سو ۔ زمخشری نے کہا ہے کہ یہ مَأَیْتُ الْجِلْدَ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں میں نے کھال کو پھیلایا ۔ اورسو (۱۰۰) بھی ایک بڑی اور وسیع تعداد ہوتی ہے ۔

مِائَۃَ عَامٍ ($\frac{۲}{۲۵۹}$) ۔ ایک سو سال ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ’’سو‘‘ بھی ہیں اور قوم میں فساد ڈالنا بھی ہیں ۔ ہمارا خیال ہے کہ سو (۱۰۰) کو اَلْمِائَۃُ شاید اس لئے کہتے ہوں کہ اُس سادگی کے دور میں جس شخص کے پاس سو تک درہم و دینار یا اونٹ وغیرہ ہوتے ہونگے وہ (سرمایہ داروں کی طرح) قوم میں فساد کا موجب بن جاتا ہوگا ۔ ہمارے ہاں بھی کہا کرتے تھے کہ جس کے پاس سو روپے ہوں وہ ایک قتل کے لئے بیباک ہوجاتا ہے ۔

مَأْجُوْج

دیکھئے یَأْجُوْجُ ۔ عنوان (ا ۔ ج ۔ ج) ۔

ماروت

اَلْمَرْتُ ۔ وہ لق و دق صحراء جس میں کسی قسم کی سرسبزی نہ ہو ۔ اَلْھَرْتُ وَ الْمَرْتُ ۔ توڑنا* ۔

مَارُوْتُ ۔ یہ عجمی لفظ ہے* ($\frac{۲}{۱۰۲}$) ۔ (دیکھئے عنوان ہاروت) ۔

م ت ع

مَتَاعٌ ۔ ضرورت کا ساز و سامان ۔ ہر وہ ضرورت کی چیز جس سے فائدہ حاصل کیا جائے ($\frac{۱۰}{۸۰}$) ۔ اس کے بنیادی معنی ، وہ سامان ہے جو ضروریات

*تاج ۔

سفر کے لئے کافی ہو**۔ اسی لئے اَلْمَتَاعُ اُس چیز کو کہتے ہیں جس سے تھوڑا فائدہ حاصل کیا جائے لیکن وہ باقی رہنے والی نہ ہو، بلکہ جلد ختم ہو جائے**۔ اَلْمُتْعَةُ۔ ضروریات سفر۔ مثل ڈول، رسی، مشکیزہ، قلیل توشہ*۔ نیز عورت کو طلاق دینے کے بعد جو نان و نفقہ شوہر سے ملتا ہے اسے بھی مُتْعَةٌ کہتے ہیں*۔ اور گذر بسر کے قابل روزی کو بھی۔ اَلْمَرْاَۃُ تُمَتِّعُ صَبِیَّھَا کے معنی ہیں وہ عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہے*۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز سے منفعت اور اس سے طویل مدت تک نفع اٹھانے کے ہیں۔ نیز جس فائدہ میں لذت کا پہلو مضمر ہو۔ یا جس میں ارتقاع و ترقی ہو۔ اس میں بہرحال فائدہ اٹھانا قدر مشترک ہے۔

قرآن کریم نے اَرْضٌ (زمین) کو جو مَتَاعٌ کہا ہے ($\frac{2}{36}$) تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ نوعِ انسانی کے لئے سامان پرورش مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن اس پر قابض نہیں ہو سکتا۔ یہ سَوَآءً لِلسَّآئِلِیْنَ ($\frac{41}{10}$) ہے۔ یعنی تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں (طور پر کھلی)۔

چونکہ مَتَاعٌ میں پرورش کا پہلو غالب ہے اس لئے اَلْمَاتِعُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیزوں سے بہتر اور طویل تر ہو۔ جسکی نشوونما اچھی ہو چکی ہو۔ عمدہ بٹی ہوئی رسی۔ یا تیز سرخ شراب کو بھی کہتے ہیں**۔ مَتَعَ النَّھَارُ کے معنی ہیں دن چڑھ گیا۔ مَتَعَ الْحَبْلُ۔ رسی مضبوط اور سخت ہو گئی۔ اَلتَّمْتِیْعُ کے معنی ہیں لمبا کرنا۔ عمر دراز کرنا۔ آباد کرنا۔ (اس کے علاوہ اس کے اور معنی بھی لغت میں دئے گئے ہیں) اس سے مَتَاعٌ اسم آسکتا ہے جس کے معنی فائدہ دینا ہیں**۔ اَفَرَءَیْتَ اِنْ مَتَّعْنٰھُمْ سِنِیْنَ ($\frac{26}{205}$)۔ کیا تو نے اس پر بھی غور کیا کہ اگر ہم برسوں ان کو دنیا سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیں۔

اَلْمَتْعُ۔ خفیہ تدبیر کو بھی کہتے ہیں*۔ اِسْتَمْتَعَ عَنْهُ کے معنی ہیں وہ اس سے مستغنی ہو گیا*۔

م ت ن

اَلْمَتْنُ۔ سخت بلند اور ہموار زمین۔ مَتُنَ۔ یَمْتُنُ۔ وہ سخت اور مضبوط ہوا۔ اَلتَّمْتِیْنُ۔ خیموں کی رسیاں یا ڈوریاں۔ نیز خیمے نصب کرنے

*تاج۔ **محیط۔

کو بھی کہتے ہیں ۔ اَلْمِیْتَانُ ۔ دو ستونوں کے درمیان کا حصہ ۔ اَلْمَتَانَۃُ ۔ شدت اور قوت ۔ سختی اور مضبوطی ۔ سَیْفٌ مَتِیْنٌ ۔ مضبوط پشت والی تلوار ۔ ثَوْبٌ مَتِیْنٌ ۔ مضبوط اور سخت کپڑا * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں امتداد پایا جاتا ہے ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ (۷/۱۸۳) ۔ میری تدبیر بڑی محکم مضبوط اور شدید ہوا کرتی ہے ۔ کوئی اسے توڑ نہیں سکتا ۔ اسی اعتبار سے خدا کو اَلْمَتِیْنُ کہتے ہیں (۵۱/۵۸) ۔ یعنی وہ جس کے محکم قوانین کے سہارے کائنات کے خیمے ایستادہ ہیں ۔ یعنی خود بھی محکم اور دوسروں کو بھی قوت اور استحکام عطا کرنے والا ۔ بعض نے کہا ہے کہ ذُوالْقُوَّۃِ وہ ہوتا ہے جس کی قوت دوسروں پر بھی اثر انداز ہو ۔ اور مَتِیْنٌ اسے کہتے ہیں جو اپنی ذات میں محکم اور مضبوط ہو * ۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ مَتِیْنٌ میں دونوں باتیں آسکتی ہیں ۔

مَتٰی

مَتٰی ۔ کب ۔ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ (۳۶/۴۸) ۔ یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا؟ (کبھی یہ ۔ جب ۔ کے معنوں میں بھی آتا ہے ۔ اُسوقت یہ شرطیہ ہوتا ہے)

م ث ل

مِثْلٌ ۔ کسی کے مشابہ یا مانند یا برابر ۔ مَثَلٌ کے معنی کسی چیز کی (Description) ہیں جو کسی دوسری چیز کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے بیان کی جائے ۔ مِثَالٌ کے معنی ہیں انداز، اسلوب، شکل و صورت ۔ وہ نمونہ جس کے مطابق کوئی چیز بنائی جائے ۔ قالب (Pattern) ۔ وہ مقدار جس کے مطابق کوئی چیز ماپی جائے یا قطع کی جائے ۔ نیز (Example) ** ۔ اَمْثَلُ کے معنی افضل کے ہیں ۔ اس کا مؤنث مُثْلٰی ہے ۔ اَلطَّرِیْقَۃُ الْمُثْلٰی ۔ اُس طریقہ کو کہتے ہیں جو حق وعدل کے مطابق اور اس سے زیادہ مشابہ ہو ۔ تَمْثِیْلٌ کے معنی تصویر بنانا اور تَمَثَّلَ کے معنی ہیں کسی کے مانند بن جانا ۔ اِمْتِثَالٌ ۔ کسی کے طریقہ کی پوری پوری پیروی کرنا ۔ مَثَلَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں وہ آدمی سیدھا کھڑا ہو گیا * ۔ (نیز زمین سے چپک جانے کے لئے بھی بطور اضداد استعمال ہوتا ہے) * ۔ مُثْلَۃٌ کے معنی ہیں کسی کو قتل کرکے اسکے ہاتھ پیر کاٹنا اور اسکی صورت بگاڑ دینا * ۔ مَثُلَۃٌ (اور مَثْلَۃٌ) جسکی جمع مَثُلَاتٌ ہے *** ۔ عبرتناک سزائیں نیز تاریخ کے وہ واقعات جو شاہراہ زمانہ پر اسطرح کھڑے ہوں کہ ان سے ہر رہرو عبرت حاصل کرے * (۱۳/۶) ۔

---

*تاج ۔ **لین و تاج و محیط ۔ ***محیط ۔

تِمْثَال - تصویر کو کہتے ہیں جسکی جمع تَمَاثِیْلُ ہے - صاحب تاج العروس کے نزدیک قرآن کریم میں تماثیل سے مراد انبیاء کرام کی تصاویر ہیں * - لیکن عیسائیوں کے نزدیک تَمَاثِیْلُ مجسموں (Statues) کو کہتے ہیں - اور تصاویر (Paintings) کو ** -

قرآن کریم میں مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا (۲/۱۷) میں مَثَلٌ کے معنی مثال کے ہیں - یعنی مشابہ اور مانند - اور (۲/۱۰۶) میں مِثْلِهَا کے معنی ہیں جو اس جیسا ہو - سورہ رعد میں مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ (۱۳/۳۵) میں مَثَلٌ کے معنی تمثیلی بیان کے ہیں -

سورۃ طٰہٰ میں بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى (۲۰/۶۳) کے معنی وہ راستہ ہیں جوحق و عدل اور توازن و تناسب سے زیادہ قریب ہو - اقرب الموارد میں کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مَثَلَ کے معنی فَضَلَ ہے - یعنی بڑھا - زیادہ ہؤا اور غالب آیا - اس اعتبار سے اَمْثَلُ کے معنی اَفْضَلُ اور اَغْلَبُ ہو گئے (اس کا مؤنث مُثْلٰی ہے) - لہذا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى کے معنی ہوئے ایسا مسلک و مشرب جو دیگر مسالک و مشارب پر غالب ہو - ہر غالب قوم اپنے مسلک و مذہب کو افضل اور غالب سمجھتی ہے خواہ وہ کیسا ہی باطل کیوں نہ ہو - اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً (۲۰/۱۰۴) کے معنی ہیں وہ شخص جو اعلیٰ درجہ کے طریقہ پر ہو - سورۃ نحل میں ہے کہ جو لوگ مستقبل کی زندگی پر یقین نہیں رکھتے ان کا کرداری ڈھانچہ بہت ہی برا ہے - اس کے لئے مَثَلُ السَّوْءِ (۱۶/۶۰) کے الفاظ آئے ہیں - ان کے برعکس وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى (۱۶/۶۰) - جو عملی ڈھانچہ خدا کے قانون کے مطابق بنتا ہے وہ نہایت بلند ہوتا ہے - اس لئے کہ کائنات کے جس قدر بلند ڈھانچے ہیں سب قانون خداوندی کے قالب میں ڈھلے ہوئے ہیں -

سورۃ انبیاء میں ان بتوں کے لئے تَمَاثِیْلُ کا لفظ آیا ہے (۲۱/۵۲) جن کی پرستش قوم ابراھیم کیا کرتی تھی - اس سے ظاہر ہے کہ تَمَاثِیْلُ کے معنی مجسمے ہیں - اس لئے (۳۴/۱۳) میں جہاں آیا ہے کہ حضرت سلیمان تماثیل بنوایا کرتے تھے تو اس سے مراد مجسمے ہی ہیں - سورۃ مریم میں جہاں ہے فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹/۱۷) - تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حضرت مریم کی نگاہ میں ایک متوازن انسان کی شکل میں سامنے آیا - اندازہ یہ ہے کہ یہ واقعہ خواب کا ہے - یعنی حضرت مریم نے یہ کچھ اپنے خواب میں دیکھا -

---

* تاج - ** لین و تاج و محیط -

سورۃ آل عمران میں ہے ۔ مِثْلَيْهِمْ (۳/۱۲) ۔ یعنی اپنے سے دگنے ۔

قرآن کریم میں ہے وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ.... (۲/۲۳) ۔ "جو کچھ ہم نے اپنے بندے کی طرف نازل کیا ہے اگر تم اس کی بابت شک میں ہو (کہ یہ منجانب اللہ نہیں ہے) تو تم اس کی مثل ایک سورت (بنا کر) لاؤ" ۔اس کے بعد خود ہی کہدیا کہ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا.... (۲/۲۴) ۔ لیکن اگر تم ایسا نہ کرو ۔ اور تم ایسا ہرگز ہرگز نہیں کر سکوگے—تو... (اس چیلنج کو دیگر مقامات پر بھی دہرایا گیا ہے ۔ دیکھو ۱۰/۳۸ و ۱۱/۱۳) ۔

یہ قرآن کریم کا چیلنج ہے جو اس نے اپنے زمانۂ نزول کے (عرب) مخاطبین کو بھی دیا اور اس کے بعد ساری دنیا کو دیتا چلا آ رہا ہے ، لیکن تاریخ اس پر شاہد ہے کہ نہ تو اس زمانے کے عربوں نے (جو اسلام اور مسلمانوں کے سخت دشمن تھے) ایسے قبول کیا اور نہ ہی اس کے بعد آجتک کسی میں اس کی ہمت پڑی ہے کہ اس کی مثل ایک سورت بنا کر دکھائے ۔ یہ چیلنج لفظی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے ہے ۔ معنوی حیثیت سے قرآنی حقائق ان بلندیوں پر ہیں جن کا تصور بھی فکر انسانی نہیں کر سکتا ۔ جہاں تک اس کے اسلوب بیان کا تعلق ہے ، اس کی مثل و نظیر تو ایک طرف پروفیسر گب (H. A. R. Gibb) کے بیان کے مطابق اس کا ترجمہ بھی دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہوسکتا***۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا اسلوب بالکل نرالا ہے ۔ یہ نہ نثر ہے نہ نظم ۔ نہ ہی اس اسلوب کی عربی لٹریچر میں کوئی مثال ملتی ہے (نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد) ۔ اس لئے قرآن اپنے لفظوں اور معنوں ، دونوں کے ساتھ ، خدا کا کلام اور بے مثل و بے نظیر ہے ۔ اس کی مثل کچھ ہو ہی نہیں سکتا ۔

م ج د

اَلْمَجْدُ ۔ اس کے اصلی معنی کثرت کے ہوتے ہیں* ۔ یہ دراصل مَجَدَتِ الْاِبِلُ سے ماخوذ ہے جو اس وقت بولتے ہیں جب اونٹ کسی وسیع اور نہایت سرسبز چراگاہ میں داخل ہوجائیں جہاں چارہ کثرت سے ہو**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی صفاتِ محمودہ (مثلاً کرم و شرافت وغیرہ) میں انتہا تک پہنچ جانا ہیں ۔ اس نے مَجَدَتِ الْاِبِلُ کے معنی "اونٹ شکم سیر ہونے کے قریب ہوگیا" دئے ہیں ۔

*محیط ۔ **راغب ۔ ***Modern Trends in Islam. p. 4

اَمْجَدَ نَا فُلَانٌ* کے معنی ہیں ہمیں فلاں آدمی نے مہمانی کے طور پر اتنا دیا جو ہمیں کافی ہو گیا اور بچ بھی رہا۔ نیز اَمْجَدَ الْعَطَاءَ۔ اسے بکثرت بخشش دی۔ اَمْجَدَ الْاِبِلَ۔ اونٹوں کو پیٹ بھر چارہ دیا*۔ عربوں میں چونکہ سخاوت (کسی کو دینا) بہت بڑا شرف تھا اس لئے ان کے ہاں اَلْمَجْدُ بلند ترین شرف کو کہتے تھے****۔ اہل لغت نے مجد اور شرف کو ہم معنی لکھا ہے اور دونوں کے متعلق کہا ہے کہ ان میں آبائی شرف بھی شامل ہے۔ لیکن قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لئے مَجِیْدٌ آیا ہے۔ شَرِیْفٌ کہیں نہیں آیا۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ مجد جوہر ذاتی ہے جس میں آبائی شرف کو دخل نہیں۔

قرآن کریم نے خدا کی صفت مَجِیْدٌ بتائی ہے (۱۱/۷۳ و ۸۵/۱۵)۔ یعنی سامان ربوبیت (خواہ وہ طبعی زندگی سے متعلق ہو یا انسانیت کی راہ نمائی کے متعلق) کو نہایت کثرت اور فراوانی سے دینے والا۔ وسعت اور فراخیاں پیدا کرنے والا۔ انتہا تک پہنچا دینے والا۔ اور اسی بناء پر وہ حَمِیْدٌ ہے۔ یعنی تعریف اور ستائش کا مالک۔

م ج س

اَلْمَجُوْسِیَّةُ۔ ایک قدیم مذہب جسکی تجدید جناب زرتشت نے کی تھی۔ اس مذہب کے ماننے والوں کو مَجُوْسٌ کہتے ہیں***۔ زرتشت کے بعد جب اس مذہب کی شکل بگڑی تو اس میں خیر و شر کے لئے اہرمن و یزداں کی دو مستقل قوتوں کو تسلیم کیا گیا۔ قرآن کریم میں اَلْمَجُوْسُ (۲۲/۱۷) کا ذکر یہودیوں، نصرانیوں اور صابیوں کے ساتھ آیا ہے۔ قرآن کریم نے ان کا تفصیلی تعارف نہیں کرایا۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں اس مذہب کے پیرو موجود تھے جس سے عرب اچھی طرح واقف تھے۔ اب اس سے عام طور پر پارسی مراد لئے جاتے ہیں جو جناب زرتشت کے متبعین ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ لفظ فارسی زبان کا ہے۔

م ح ص

اَلْمَحْصُ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو اس کے عیوب سے پاک کرنا**۔ مَحَصَ الذَّهَبَ بِالنَّارِ۔ سونے کو آگ میں گلا کر اس کے کھوٹ کو اس سے الگ کر دیا اور اسطرح سونے کو خالص کر لیا****۔

*تاج۔ **راغب۔ ***تاج و محیط۔ ****محیط۔

مَحَصَ السِّنَانَ - اس نے نیزے کو جلادی ، چمکایا * - قرآن کریم میں ہے - وَلِيُمَحِّصَ مَافِي قُلُوْبِكُمْ (۳/۱۵۳) - تاکہ جو کچھ تمہارے دلوں میں کھوٹ ہے اسے نکال دے -

نیز حَبْلٌ مَحِصٌ - اس رسی کو کہتے ہیں جس کا چبھنے والا رواں استعمال سے صاف ہو گیا ہو اور وہ اسطرح نرم ہو گئی ہو - اور فَرَسٌ مَحْصٌ و مُمَحَّصٌ - مضبوط جسم والا گھوڑا * - اس اعتبار سے مَحْصٌ کے معنی مضبوط اور طاقتور بنانے کے آئیں گے - سورہ آل عمران میں یہ لفظ مَحْقٌ کے مقابل میں آیا ہے (۳/۱۴۰) - مَحْصٌ اور مَحْقٌ دونوں میں کمی کرنے کا مفہوم ہوتا ہے - لیکن مَحْصٌ میں کسی کی کمزوریوں کو کم کرکے اسے محکم بنانا مقصود ہوتا ہے اور مَحْقٌ میں کسی کو مٹا دینا مفہوم ہوتا ہے - (دیکھئے عنوان م - ح - ق)

م ح ق

مَحَقَهٗ - اسے مٹا دیا حتکہ اس میں سے کچھ بھی باقی نہ رہا * - اسے بتدریج تھوڑا تھوڑا کم کیا ** - اَلْمَحْقُ - کسی چیز کا تمام کا تمام ضائع ہو جانا حتکہ اس کا کچھ حصہ بھی نظر نہ آئے - مَحَقَ الْحَرُّ الشَّيْئَ - گرمی نے اس چیز کو جلا کر تباہ کر دیا - اِمْتَحَقَ النَّبَاتُ - سخت گرمی کے باعث پودے سوکھ کر جل گئے * - اَلْمَحَقَةُ - ہلاکت * - راغب کے نزدیک اس کے معنی کم ہو جانے کے ہیں ** - ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے - چنانچہ اَلْمَحَاقُ (م کی تینوں حرکات کے ساتھ) - قمری مہینوں کی ان آخری راتوں کو کہتے ہیں جن میں چاند نمودار نہیں ہوتا -

سورہ بقرۃ میں ہے يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا (۲/۲۷۶) - خدا کا قانون ربٰو کی بنا پر حاصل شدہ سرمایہ کو کم کر دیتا یا برباد کر دیتا ہے - وہ معاشرہ کبھی ثمر بار نہیں ہو سکتا جس کا معاشی نظام ربٰو پر قائم ہو - یہاں يَمْحَقُ بمقابلہ يُرْبِي آیا ہے جس کے معنی بڑھانے اور زیادہ کرنے کے ہیں - سورہ آل عمران میں يَمْحَقُ بمقابلہ يُمَحِّصُ آیا ہے (۳/۱۴۰) جس کے لئے دیکھئے عنوان (م - ح - ص)

م ح ل

اَلْمَحْلُ - خفیہ تدبیر - مکر - چال - شدت - شدید بھوک - قحط سالی - بارش کا بند ہو جانا اور زمین کا خشک ہو جانا - زَمَانٌ مَاحِلٌ - خشک

*تاج - **راغب - ***محیط -

زمانہ جس میں بارش نہ ہو۔ اَرْضٌ مَحِلٌ ۔ وہ زمین جہاں وقت پر بارش نہ ہوئی ہو اور اس وجہ سے وہاں قحط ہو گیا ہو۔ اَمْحَلَ الْقَوْمُ ۔ وہ قوم قحط سالی میں مبتلا ہو گئی۔ مَاحَلَہٗ مِحَالًا ۔ اس نے اس سے دشمنی کا رتاؤ کیا۔ اس سے زور آزمائی کی تا کہ معلوم ہو جائے کہ دونوں میں سے کون زیادہ طاقتور ہے ۔ چنانچہ اَلْمَاحِلُ ۔ جھگڑا کرنے والے حریف کو کہتے ہیں *۔

قرآن کریم میں اللہ تعالی کے متعلق ہے وَ ھُوَ شَدِیْدُ الْمِحَالِ (۱۳/۱۳) ۔ اس کے معنی ہیں سختی سے گرفت کرنے والا ۔ سختی سے سزا دینے والا ۔ بڑی قوت کے ساتھ مواخذہ کرنے والا ۔ جس کا قانون مکافات بڑی قوتوں کا مالک ہو اور جو اعمال کے نتائج مرتب کرنے میں بڑی سختی برتتا ہو اور کسی سے رعایت نہ کرتا ہو۔ اس میں سختی کے ساتھ قوت کا پہلو بھی ہوتا ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں مَحَّلَنِیْ یَافُلَانُ ۔ اے شخص ! مجھے قوت پہنچا * ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ مِحَالٌ دراصل حَوْلٌ اور حِیْلَۃٌ سے مشتق ہے اور اس میں میم زیادہ ہے ۔ (اسکے لئے دیکھئے ح ۔ و ۔ ل) لیکن یہ بہت بعید ہے ۔

م ح ن

مَحْنٌ کے اصلی معنی کوڑے مارنے کے ہوتے ہیں۔ اَلْمِحْنَۃُ اسم ہے جس کی جمع مِحَنٌ آتی ہے ۔ یعنی وہ مشقتیں جن سے کسی کی آزمائش کی جائے۔ مَحَنَ الْبِئْرَ مَحْنًا ۔ اس نے کنویں کی مٹی وغیرہ نکال کر اسے صاف کر دیا** ۔

مَحَنَ الْاَدِیْمَ ۔ اس نے چمڑے کو نرم کر دیا ۔ اسے چھیل کر صاف کر دیا ۔ اس نے چمڑے کو کھینچکر وسیع کر دیا ۔ مَحَنَ الْفِضَّۃَ ۔ اس نے چاندی کو آگ میں تپا کر صاف اور خالص کر دیا ** ۔

قرآن کریم میں ہے اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی (۴۹/۳) ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ نے تقوی کے لئے پاک اور صاف کر دیا ۔ یا انہیں نرم اور کشادہ کر دیا ۔

اِمْتِحَانٌ کے معنی کسی کے اندرونی حالات معلوم کرنے یا آزمانے کے ہیں ۔ سورہ الممتحنہ میں ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَکُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُھٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْھُنَّ (۶۰/۱۰) ۔ اے جماعت مومنین !

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔

جب مومن عورتیں تمہارے پاس ہجرت کرکے آئیں تو ان کے اندرونی حالات معلوم کر لیا کرو۔

م ح و

مَحَاهُ یَمْحُوْهُ مَحْوًا۔ اس نے اس کے اثر اور نشان کو مٹا دیا اور ختم کر دیا، زائل کر دیا۔ اَلْمَحْوَۃُ۔ بارش جو خشک سالی کے آثار مٹادے۔ مَحَا الصُّبْحُ اللَّیْلَ۔ صبح نے نمودار ہو کر رات کو مٹا دیا۔ اَلْمَحْوُ۔ اس سیاہ نشان کو کہتے ہیں جو چاند کے اندر نظر آتا ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو لے جانے اور غائب کر دینے کے ہیں۔

قرآن کریم میں مَحْوٌ بمقابلہ اِثْبَاتٌ آیا ہے۔ یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ ($\frac{13}{39}$)۔ خدا اپنے قانون مشیت کے مطابق (نہ رکھنے کے قابل چیز کو) مٹا دیتا اور رکھنے والی چیز کو قائم رکھتا ہے۔ مٹاتا اسے ہے جو تخریبی نتائج پیدا کرے اور باقی اسے رکھتا ہے جو تعمیری نتائج کی حامل ہو ($\frac{32}{24}$)۔ یعنی جو نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہو ($\frac{13}{17}$)۔ محو و اثبات کا یہ اٹل قانون، کارگہ فطرت کے ہر گوشے میں کارفرما ہے اور اسی قانون کے مطابق قوموں کی موت و حیات کے بھی فیصلے ہوتے ہیں۔ یعنی بقائے نافع ($\frac{13}{17}$)۔ بقا اس کے لئے ہے جو نوع انسان کے لئے نفع رساں ہو۔ تھوڑا سا غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ "بقائے نافع" کا اصول "بقائے اصلح" (Survival of the Fittest) کے اس اصول سے بہت بلند ہے جسے ڈارون (اور اس کے متبعین نے) طبیعیاتی قانون ارتقا میں دیکھا تھا۔ انسانی دنیا کے لئے صحیح اصول یہی ہے کہ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ($\frac{13}{17}$) "زمین میں وہی چیز (وہی نظریہ۔ وہی نظام) ٹھہرتی ہے جو نوع انسانی کے لئے نفع بخش ہو"۔ یعنی وہ نظریہ زندگی اور نظام حیات جو نفع بخش ہو اور اسکی نفع بخشیاں کسی خاص گروہ، پارٹی، قوم، یا ملک تک محدود نہ ہوں، پوری کی پوری انسانی دنیا کو محیط ہوں۔ دنیا کے تمام انسان ان سے متمتع ہوں۔

م خ ر

مَخْرٌ۔ شق کرنا۔ پھاڑنا۔ چیرنا۔ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں**۔ مَخَرَتِ السَّفِیْنَۃُ۔ کشتی پانی کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ مَخَرَ السَّابِحُ

*تاج۔ **محیط و ابن فارس۔

تیرنے والے نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پانی کو چیرا* ۔ قرآن کریم میں ہے وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ (۱۶/۱۴) ۔ اس میں مَوَاخِرَ مَاخِرَةٌ کی جمع ہے جس کے معنے ہیں سینہ بحر کو چیر کر چلنے والی (کشتیاں) ۔

م خ ض

مَخَضَ اللَّبَنَ ۔ دودھ (دھی) کو بلویا ۔ اسی سے مَخَضَ الشَّيْءَ مَخْضًا کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو سختی سے ہلانا ۔ اس طرح حرکت دینا جس طرح دھی کو بلوتے وقت حرکت دیتے ہیں ۔ تَمَخَّضَ الْوَلَدُ ۔ بچے نے حاملہ کے پیٹ میں اس طرح حرکت کی جس سے معلوم ہوا کہ اس کی پیدائش کا وقت قریب آ رہا ہے ۔ اَلْمَاخِضُ ۔ وہ حاملہ جس کے وضع حمل کا وقت قریب آگیا ہو۔ مَخَضَتِ الْمَرْاَةُ ۔ عورت کو درد زہ شروع ہوگیا**۔ سورۃ مریم میں اَلْمَخَاضُ (۱۹/۲۳) انہی معنوں میں آیا ہے ۔ یعنی دردِ زہ ۔

م د د

مَدٌّ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو لمبائی میں کھینچنا اور کسی چیز کا دوسری سے طول میں ملے ہوئے ہونا ۔ اسی نسبت سے مَدٌّ کے معنی سیلاب کے آتے ہیں کیونکہ اس میں پانی دور تک مسلسل بڑھتا چلا جاتا ہے ۔ بڑھانے اور اضافہ کرنے کو بھی مَدٌّ کہتے ہیں ۔ مَدُّ الْبَحْرِ ۔ سمندر کے چڑھاؤ کو کہتے ہیں ۔ یہ الْجَزْرُ (اتار) کی ضد ہے ۔ مَدٌّ کے معنے بچھانے اور پھیلانے کے بھی ہیں ۔ مَدَّ نَظَرَهُ اِلَيْهِ ۔ اس کی طرف جھانک کر دیکھا ۔ نظر اٹھا کر دیکھا ۔ مَدٌّ اور اِمْدَادٌ کے معنی مہلت دینے کے بھی آتے ہیں ۔ مَدِيْدٌ ۔ لمبی پھیلی ہوئی یا کھینچی ہوئی چیز کو کہتے ہیں ۔ مِدَادٌ ۔ روشنائی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ قلم سے برابر آتی رہتی ہے اور بعد میں آنے والی روشنائی پہلی روشنائی سے ملتی رہتی ہے ۔ مَدٌّ کے معنی مدد دینے کے بھی آتے ہیں** ۔

بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ مَدٌّ بیشتر شر کے لئے آتا ہے اور اِمْدَادٌ خیر کے لئے*** ۔ (مثالیں آگے آتی ہیں) ۔

مَادَّةٌ ۔ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیز کو بڑھائے**۔ اہل لغت نے اس کے معنی اَلزِّيَادَةُ الْمُتَّصِلَةُ بھی بتائے ہیں ۔ اس کے معنی ہیں وہ شے جو اسطرح بڑھے کہ اس کے اجزاء باہمدگر ملے رہیں ۔ یہ لفظ (Matter) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا ۔

*تاج و راغب و محیط ۔ **تاج و محیط ۔ ***راغب ۔

سورۃ النمل ۔ (۲۷/۳۶) میں یہ مادہ ''بڑھانے'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔ سورۃ حجر میں ہے ۔ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ (۱۵/۸۸) ۔ تو اپنی آنکھوں کو (اس طرف) مت بڑھا ۔ یعنی ان چیزوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے مت دیکھ ۔ روشنائی کے معنوں میں مِدَادٌ (۱۸/۱۰۹) میں آیا ہے ۔ ''پھیلے ہوئے'' کے معنوں میں (۵۶/۳۰) میں ۔ یعنی ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ۔ اِمْدَادٌ خیر اور بھلائی کے معنوں میں ۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ (۱۷/۲۰) میں آیا ہے ۔ اس لئے کہ یہ امداد ربوبیت اور پروردگاری کے سرچشمہ سے متعلق ہے ۔ آیت کے معنی ہیں ''ہم سب کو مدد دیتے ہیں ۔ آگے بڑھاتے ہیں ۔ ان کو بھی اور اُن کو بھی ۔ یہ تیرے رب کی عطا سے ہوتا ہے'' ۔ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ (۱۷/۶) میں اَمَدَّ بھی خیر اور بھلائی کے لئے آیا ہے ۔ آیت کے معنی ہیں ''اور مال اور اولاد سے تمہیں مدد دی ۔ آگے بڑھایا'' ۔ اس کے برعکس ، سورۃ مریم میں ہے قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا (۱۹/۷۵) ۔ ''کہو کہ جو کوئی گمراہی میں رہے تو رحمٰن اس کے لئے مہلت کا عرصہ لمبا کرتا جائے گا'' ۔ اس میں مَدَّ شر کے لئے آیا ہے ۔ اسی طرح ذرا آگے چل کر ہے سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا (۱۹/۷۹) ۔ یہاں بھی مَدَّ شر کے لئے آیا ہے ۔ یعنی ''ہم اسے لکھتے جائینگے جو وہ کہتا ہے اور اس کے لئے عذاب کو لمبا کھینچتے جائینگے'' ۔

هُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ (۱۳/۳) میں مَدَّ کے معنی پھیلانے اور ہموار کرنے کے ہیں ۔ ''اللہ وہ ہے جس نے زمین کو پھیلایا ہے'' ۔ اور وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ (۲/۱۵) میں اس کے معنی مہلت دینے اور دور تک لے جانے کے ہیں ۔

سورۃ کہف میں مَدَدًا (۱۸/۱۰۹) اضافہ کے معنوں میں آیا ہے ۔

م د ن

مَدَنَ بِالْمَكَانِ ۔ اس نے اس جگہ قیام کیا ۔ اَلْمَدِيْنَةُ (۳۶/۲۰) ۔ بڑا شہر اس کی جمع مَدَائِنُ ہے ۔ یعنی بہت سے شہر (۷/۱۱۱) ۔ قلعہ ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ دِيْنٌ سے مشتق ہے (دیکھئے عنوان د ۔ ی ۔ ن) ۔ مَدَائِنُ ایران (فارس) کے ایک بڑے شہر کا نام تھا جو بغداد کے قریب تھا ۔ مَدْيَنُ حضرت شعیبؑ کے قریہ کا نام* (۷/۸۵) ۔ تَمَدْيَنَ الرَّجُلُ ۔ آدمی آسودہ

---

*محیط و راغب و تاج ۔

و خوش حال ہوا - تَمَدَّنَ الرَّجُلُ - اس آدمی نے شہر والوں کی عادات اختیار کرلیں - دیہاتی پن چھوڑ کر شہریت و شائستگی اختیار کی - مَدَّنْتُ مَدِيْنَةً - میں نے شہر بنایا** - اسے آباد کیا اور بسایا* -

مَدْيَنُ

وہ قوم جس کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے تھے (۸۵/۷) - نیز وہ علاقہ جس کی طرف حضرت موسیٰؑ گئے تھے (۲۲/۲۸) - تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ''شعیبؑ'' - نیز عنوان ''موسیٰؑ'' -

م ر أ

اَلْمَرْءُ - (میم پر تینوں حرکتیں جائز ہیں) نیز اُمْرُؤٌ - انسان یا مرد - اَلْمَرْاَةُ اور اَلاِمْرَاَةُ عورت کو کہتے ہیں - مُرُوْءَةٌ - انسانیت - آدمیت کمالِ مردانگی - مَرِیَ الطَّعَامُ مَرَاءَةً - کھانا خوشگوار ہوگیا - هَنِيْئٌ - لذیذ کھانے کو کہتے ہیں - اور مَرِیْءٌ اس کھانے کو جس کا نتیجہ عمدہ ہو* - هَنِيْئًا مَرِيْئًا (۴/۴) -

م ر ج

مَرْجٌ - ملانا - خلط ملط کر دینا - مَرَجٌ کے معنے گڈ مڈ ہونے، مل جانے اور اختلاط کے ہیں (راغب نے یہ معنی اَلْمُرُوْجُ کے دئے ہیں)۔ اسی سے اَلْمَرَجُ کے معنی اضطراب اور التباس کے ہیں - نیز فتنہ و فساد کے*** - سورۃ قٓ میں ہے کہ یہ لوگ حق کی تکذیب کرتے ہیں فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ (۵/۵۰) - وہ پیچیدہ معاملہ کے اندر ہیں - وہ بڑے الجھاؤ اور پریشانی کی حالت میں ہیں - انہیں التباس ہو رہا ہے - وہ اسی اضطراب میں ہیں جو بے یقینی کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے - اَلْمَارِجُ - مختلط چیز - بلند اور تند و تیز شعلہ *** - (لیکن، جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا - مَرَجٌ کے معنی کھلا چھوڑ دینے کے بھی آتے ہیں - اسی لئے اَلْمَارِجُ - آگ کے آزاد شعلے کو کہیں گے جس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ ہو) - سورۃ رحمٰن میں ہے - مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (۱۵/۵۵) - آگ کے مخلوط یا بھڑکنے والے شعلے سے - لیکن اَلْمَرَجُ وسیع چراگاہ اور کھلی جگہ کو بھی کہتے ہیں جس میں جانور آزادانہ (کھلے طور پر) چرتے پھرتے رہیں*** - (غالباً اس لئے کہ اس طرح کھلے طور

*تاج - **ابن فارس - ***تاج و راغب -

پر چرنے پھرنے سے ایک دوسرے کے جانور آپس میں مخلوط ہو جاتے ہیں) ۔ اَمْرَجَہَا ۔ اُس نے جانوروں کو چرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا کہ وہ جہاں چاہیں چلیں پھریں ۔ چنانچہ اَلْمَرَجُ اُن اونٹوں کو کہتے ہیں جو بغیر چرواہے کے آزاد چر پھر رہے ہوں ۔ اسی سے اَلْمَرْجُ کے معنی جاری کرنے چلانے اور کھلا چھوڑنے کے بھی ہوتے ہیں * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آنے جانے اور اضطراب کے ہیں ۔

قرآن کریم میں مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ (۲۵/۵۳) ; (۵۵/۱۹) آیا ہے ۔ جس کے معنی ہیں اس نے دو دریا جاری کر رکھے ہیں جو آپس میں ملتے ہوئے بہہ رہے ہیں ۔

م ر ح

اَلْمَرَحُ ۔ اس خوشی اور نشاط کو کہتے ہیں جس میں شدت اور زیادتی سے انسان اپنی حدود سے متجاوز ہو جائے (اور اس میں اوچھے پن یا اترانے کی کیفیت پیدا ہو جائے) ۔ اکڑنے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔ ابن فارس نے اس کے معنے ایسی خوشی بتائے ہیں جس میں فرط طرب سے آدمی آپے سے باہر نکل جائے ۔ فَرَسٌ مِیْمَرَحٌ ۔ طاقت کی مستی میں اٹھلا کر چلنے والا پر نشاط گھوڑا ۔ قَوْسٌ مَرُوْحٌ ۔ کڑی کمان ** ۔ جو انتہائی تیزی سے تیر پھینکتی ہو ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا (۱۷/۳۷) ۔ زمین میں اکڑ کر نہ چلو ۔ اسکی تفسیر دوسری جگہ ان الفاظ سے کر دی ۔ بِمَا کُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَبِمَا کُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ (۴۰/۷۵) ۔ یعنی یہ لوگ بغیر ایسے کام کئے جو تعمیری نتائج مرتب کریں ، یونہی اکڑتے رہتے ہیں ۔ انہی کے متعلق دوسری جگہ ہے ۔ وَیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا (۳/۱۸۷) ۔ چاہتے ہیں کہ ان کاموں کی بنا پر ان کی تعریف کی جائے جو انہوں نے کئے نہیں ۔

م ر د

مَرَدَ ۔ یَمْرُدُ کے معنی ہیں سرکشی کرنا ۔ مَرَدَ عَلَی الشَّیْءِ کے معنی ہیں وہ اس چیز کا عادی ہو گیا ۔ وہ اسے برابر کرتا رہا ۔ تَمَرَّدَ کے اصلی معنی مشتاق ہو جانے اور عادی ہوجانے کے ہیں *** ۔ چنانچہ قرآن کریم

* تاج و راغب ۔ ** تاج و محیط و راغب ۔ *** تاج ۔

میں ہے۔ مَرَدُوْا عَلَی النِّفَاقِ (۹/۱۰۱) - وہ منافقت کے عادی ہوچکے ہیں۔ اَلْمَرْدَاءُ - اُس عورت کو کہتے ہیں جس کے سر پر بال نہ ہوں * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے چھلکے یا اوپر کے روئیں اور بالوں کو صاف کر دینا ہوتے ہیں - اس سے اَلْاَمْرَدُ اس نوجوان کو کہتے ہیں جس کی ڈاڑھی نمودار نہ ہوئی ہو - قرآن کریم نے شیطان کو مَرِیْدٌ کہا ہے (۴/۱۱۷) - پہلے معنوں کے اعتبار سے اس کا مطلب ہوگا سرکش - راغب نے اسے شَجَرَةٌ مَرْدَاءُ سے ماخوذ بتایا ہے جس کے معنے ہیں وہ درخت جس کے پتے نہ ہوں - ان معنوں کے اعتبار سے اس کا مفہوم ہوگا وہ جو ہر قسم کی بھلائیوں اور خوشگواریوں سے محروم ہو چکا ہو - یہ معنی رَجِیْمٌ اور لَعِیْنٌ کے مرادف ہیں - (دیکھئے عنوانات ر - ج - م اور ل - ع - ن)

اَلْمَرِیْدُ - کھجور جو دودھ میں بھگو دی جائے تاکہ نرم ہو جائے۔ اصمعی نے کہا ہے کہ ہر وہ چیز جسے مَل دیا جائے حتٰکہ وہ نرم ہوجائے مَرِیْدٌ کہلاتی ہے * - قرآن کریم میں صَرْحٌ مُمَرَّدٌ آیا ہے (۲۷/۴۴) - اس کے معنی ہیں ہموار یا چکنا کیا ہوا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی لمبی عمارت کے بھی ہیں - ویسے اَلتَّمْرِیْدُ فِی الْبِنَاءِ کے معنی ہوتے ہیں عمارت کو چکنا اور ہموار کرنا - اس پر پلاسٹر لگانا - اَلْمَارِدُ - بلند - نیز سرکش - خیر سے عاری * (۳۷/۷) -

م ر ر

مَرَّ - مَرَّبِهٖ - مَرَّ عَلَيْهِ - اس کے پاس سے گزر گیا - اَلْمَرَّةُ - ایک بار - مَرَّتَانِ - دو بار - فِیْ كُلِّ مَرَّةٍ - ہر بار - اَوَّلَ مَرَّةٍ - پہلی بار - اَلْمُرُّ - کڑوا* - اِسْتَمَرَّ الشَّیْئُ - چیز ہمیشہ رہی - مسلسل رہی - ایک ہی طریقہ پر چلتی رہی*** - سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (۵۴/۲) وہی جھوٹ جو ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے - یعنی اِفْكٌ قَدِیْمٌ (۴۶/۱۱) -

سورۃ بقرہ میں ہے - اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ...... (۲/۲۲۹) - طلاق دو ہی بار ہوسکتی ہے - اس کا عام طور پر مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اگر کوئی آدمی دو مرتبہ طلاق ، طلاق کہدے (یا ایک ایک مہینہ کے وقفہ کے بعد دو بار طلاق کا اعلان کردے) تو اس سے طلاق نہیں پڑتی (واپسی ہو سکتی ہے) لیکن اگر تین مرتبہ کہدے تو پھر معاملہ ختم ہوجاتا ہے - اس کے بعد اگر یہ (سابقہ میاں بیوی) پھر باہمی نکاح کرنا چاہیں تو ضروری ہے کہ عورت کسی

*تاج - **راغب - ***محیط -

دوسرے مرد سے نکاح کرے اور اس سے ہم بستر ہو۔ (اسے حلالہ یا تحلیل کہتے ہیں) ۔ یہ خیال اور طلاق کا طریق قرآن کریم کے خلاف ہے ۔ قرآن کریم کی رو سے طلاق کے لئے ایک خاص طریقہ مقرر ہے ۔ یعنی پہلے باہمی افہام و تفہیم ۔ پھر ثالثوں کے ذریعے مصالحت کی کوشش ۔ پھر عدالت کے ذریعے فیصلہ ۔ جب معاملہ اس حد تک پہنچ جائے اور باہمی نباہ کی کوئی صورت نہ ہو تو میاں بیوی میں علیحدگی ہو جاتی ہے ۔ اسے طلاق کہتے ہیں ۔ اس کے بعد بھی اگر یہی مرد اور عورت چاہیں تو باہمی نکاح کرسکتے ہیں ۔ لیکن ایسا ، اس جوڑے کی ازدواجی زندگی میں صرف دو مرتبہ ہوسکتا ہے ۔ اگر تیسری مرتبہ بھی طلاق کی نوبت آگئی تو پھر یہ میاں بیوی آپس میں نکاح نہیں کرسکتے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کرنے کے بعد مطلقہ یا بیوہ ہو جائے تو پھر وہ اپنے پہلے خاوند سے نکاح کرسکتی ہے ۔ یہ ہے قرآن کریم کا مطلب اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ سے ۔ جب تک طلاق (قیدِ نکاح سے آزادی) عمل میں نہ آجائے اسے طلاق کہا ہی نہیں جاسکتا ۔ اس لئے اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ کے معنی واضح ہیں ۔ یعنی قیدِ نکاح سے ایسی آزادی دو مرتبہ ہوسکتی ہے جس میں لوٹ آنے کی اجازت ہو ۔ تیسری مرتبہ کی آزادی کے بعد اس کی اجازت نہیں ۔

اَلْمَرَّۃُ ۔ رسی کو بھی کہتے ہیں ۔ اَمْرَرْتُ الْحَبْلَ ۔ میں نے رسی کو بٹ دیا ۔ اس سے اس کے معنی قوت اور استحکام کے آتے ہیں ۔ اِسْتَمَرَّ مَرِیْرُہٗ ۔ اس کا ارادہ مستحکم ہوگیا ۔ اِسْتَمَرَّ بِالشَّیْءِ ۔ وہ اس چیز کے اٹھانے پر قادر ہوگیا ۔ اہل عرب کہا کرتے ہیں اَرْجَی الْغِلْمَانِ الَّذِیْ یَبْدَءُ بِحُمْقٍ ثُمَّ یَسْتَمِرُّ ۔ سب سے ہونہار لڑکا وہ ہے جو ابتداءً بیوقوفی کرے اور پھر درست ہو جائے ۔ اس سے اَلْمِرَّۃُ کے معنی خلقی قوت و شدت اور عقل و اصالت کے آتے ہیں* ۔ چنانچہ صاحب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ مِرَّۃُ الْاِنْسَانِ آدمی کی قوت کو کہتے ہیں ۔ سورۃ القمر میں جو آیا ہے فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (۵۴/۱۹) ۔ تو اس کے معنی سخت شدت کا دن ہیں (اس کے معنی ہیں ایسا دن جس کی نحوست مسلسل رہے)۔ نیز اس نے لکھا ہے کہ سورۃ اعراف میں جو ہے حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِہٖ (۷/۱۸۹) ۔ تو اس میں فَمَرَّتْ بِہٖ کے معنی سختی یا شدت کو محسوس کرنا ہیں ۔

سورۃ النجم میں اللہ تعالیٰ کو ذُوْ مِرَّۃٍ (۵۳/۶) کہا گیا ہے ۔ اس کے معنی صاحب قوت و حکمت بھی ہوسکتے ہیں ۔ یعنی وہ جس کے ارادے مستحکم

---

*تاج ۔

اور تدبیریں قوی ہوں ۔ اور یہ بھی کہ جو زندگی کی مختلف گزرگاہوں کا مالک ہو ۔ اس لئے کہ "مُرُوْر" کے بنیادی معنی گزر جانے کے ہیں ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ "مِرَّةٌ" کے معنی ایسی حالت کے ہیں جس پر کوئی چیز مستقلاً چلتی رہے ۔ اس اعتبار سے اس کے معنے قوانین خداوندی (سنة الله) کے ہونگے جن میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی ۔

م ر ض

مَرَضٌ ۔ توازن اور اعتدال کا اس طرح بگڑ جانا کہ کسی قوت میں اضمحلال ، ضعف یا کمی واقع ہوجائے ۔ کمی کے لحاظ سے شَمْسٌ مَرِيْضَةٌ ۔ سورج کو اس وقت کہتے ہیں جب گرد و غبار سے اس کی روشنی مدھم پڑ گئی ہو ۔ اور اَرْضٌ مَرِيْضَةٌ ۔ ایسی زمین کو جس میں طاقت کم ہو ۔ یا جس میں پیداوار کم ہوتی ہو ۔ نیز وہ زمین جہاں بد امنی ہو ۔ مَرَضٌ کے معنی ظلمت اور تاریکی کے بھی آتے ہیں ۔ اور شک اور نفاق کے بھی* ۔

قرآن کریم میں مَرَضٌ بمقابلہ شِفَاءٌ آیا ہے (۲۶/۸۰) جہاں اس کے معنی جسمانی مرض کے ہیں ۔ اور فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ (۲/۱۰) ۔ جہاں اس کے معنی قلب و نگاہ کے توازن کے بگاڑ اور نفسیاتی الجھاؤ کے ہیں ۔ لہذا ، جسمانی بیماری ہو یا ذہنی اور قلبی فتور ، دونوں کے لئے مَرَضٌ کا لفظ آتا ہے ۔ سورۃ بقرہ میں سطحی جذبات پرستوں یا مفاد پرستوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ (۲/۱۰) ۔ اس قسم کی ذہنیت یا سیرت کو ، قلب (Psyche) یا (Mind) کا مرض کہنا ایک ایسی حقیقت کا انکشاف ہے جس سے (بیسویں صدی سے پہلے) انسانی علم بالعموم بے بہرہ تھا ۔ اسی جہت سے قرآن کریم نے اپنے متعلق کہا ہے شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (۱۰/۵۷) ۔ اس میں "قلب کے امراض" کا علاج اور شفاء ہے ۔

اگر اس کا علاج وحی کی رو سے نہ کیا جائے تو یہ مرض اپنے زور دروں سے از خود بڑھتا رہتا ہے (۲/۱۰) ۔

م ر و

صَفَا اور مَرْوَةَ مکہ میں مسجد حرام سے باہر دو پہاڑیاں ہیں ۔ صَفَا (صَفَاةٌ کی جمع) صاف پتھروں کو کہتے ہیں اور مَرْوٌ چھوٹے چھوٹے سفید براق کنکروں کو ۔ مراسم حج کے سلسلہ میں قرآن کریم نے انہیں

---

*تاج ۔

میں شَعَائِرِ اللہ (۲/۱۵۸) کہا ہے ۔ شَعَائِر، کسی نظام یا مملکت کی اُن محسوس علامات (نشانات) کو کہتے ہیں جو تقاریب اور مراسم میں اُس نظام یا مملکت کے قائمقام سمجھی جاتی ہیں ۔ مثلاً کسی سلطنت کا جھنڈا اُس کے شعائر میں سے ہوتا ہے ۔ جھنڈے کے احترام کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے دل میں اُس سلطنت کا احترام ہے ۔ قرآن کریم نے جن محسوس علامات کو شعائر اللہ قرار دیا ہے اُن سے یہی مقصود ہے کہ وہ حکومتِ خداوندی (قرآنی نظام مملکت) کے محسوس نشان ہیں جن کا احترام درحقیقت حکومتِ خداوندی کے احترام کا مرادف ہے ۔ اس سے زیادہ ان محسوس علامات (Symbols) کی کچھ حیثیت نہیں ہوتی ۔ (نیز دیکھئے عنوان ش ۔ ع ۔ ر) ۔

م ر ی

مَرَى النَّاقَةَ يَمْرِيْهَا مَرْياً ۔ اونٹنی کے تھنوں کو ہاتھ سے سہلانا (مس کرنا) کہ وہ دودھ دیدے ۔ یہ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں ۔ چنانچہ اَلْمِرْيَةُ ۔ اور اَلْمَرْيَةُ ۔ اس دودھ کو کہتے ہیں جو اسطرح نکالا جائے**۔

اس سے اس کے معنی ہیں تردد اور کوشش سے کسی بات کا نکالنا ۔ چنانچہ مِرْيَةُ الْفَرَسِ کے معنی ہیں وہ چال جو گھوڑا وغیرہ کھانے سے گھوڑا نکالے** ۔ لہذا مِرْيَةٌ کسی معاملہ میں تردد کو کہتے ہیں ۔ نیز شک اور جھگڑے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ راغب نے ان معانی کی یہی توجیہ کی ہے اور کہا ہے کہ مِرْيَةٌ شک سے خاص ہوتا ہے* ۔ جھگڑے کے مفہوم میں مناوی نے کہا ہے کہ مِرَاءٌ دوسرے کے کلام میں اظہار خلل کے لئے طعن کرنے کو کہتے ہیں اور اس سے مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے آدمی کی تحقیر کی جائے، اور بس ۔ اِمْتَرَى فِيْهِ وتَمَارَى کے معنے شک کرنے کے ہیں ۔ فراء نے تَتَمَارَى کے معنی تکذیب کرنے کے بتائے ہیں** ۔

قرآن کریم میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ (۴۲/۱۸) ۔ جو لوگ اَلسَّاعَةُ کے بارے میں شک اور تردد میں پڑے ہیں ۔ سورہ کہف میں ہے ۔ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ (۱۸/۲۲) ۔ ان سے ان کے بارے میں جھگڑا مت کر ۔ سورہ بقرہ میں ہے ۔ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (۲/۱۴۷) ۔ جھگڑا کرنے والوں یا شک اور تردد کرنے والوں میں سے نہ ہوجا ۔

مریم

مَرْيَمُ ۔ یہ سریانی لفظ ہے جس کے معنی بلند مرتبہ ہیں ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جو شخص کوئی بہت ہی عجیب بات کرتا ہے اسے عرب

*راغب ۔ **تاج ۔

یَا مَرْیَمُ کہکر خطاب کرتے ہیں ۔ اور اَلْمَرْیَمُ مِنَ النِّسَاءِ اُس عورت کو کہتے ہیں جو مردوں کے ساتھ باتیں کرنا پسند کرے لیکن برائیوں سے دور رہتی ہو* ۔

قرآن کریم نے حضرت عیسیٰؑ کی والدہ ماجدہ کا نام مریم بتایا ہے ۔ (۳/۴۵) ۔ آپ (حضرت مریمؑ) کی والدہ کو اِمْرَاَتُ عِمْرَانَ (۳/۳۴) کہکر پکارا گیا ہے ۔ اس کے معنی ”عمران کی بیوی“ یا ”آل عمران کی عورت“ کے ہیں ۔ سورہ مریم میں ہے کہ آپ کی قوم کے لوگوں نے آپ کو یَا اُخْتَ ھٰرُوْنَ (۱۹/۲۸) ”اے ھارون کی بہن“ بھی کہا تھا ۔ اس کے بھی دو معنی ہو سکتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ آپ کے کسی بھائی کا نام ھارون تھا ۔ اور دوسرے یہ کہ حضرت ھارونؑ (مورث اعلیٰ) کیطرف نسبت کی وجہ سے ایسا کہا گیا تھا ۔ سورہ تحریم میں آپ کو ابْنَتَ عِمْرَانَ (۶۶/۱۲) کہا گیا ہے ۔

آپ کی والدہ نے آپ کی پیدائش سے پہلے منت مانی تھی جس کی بنا پر آپکو ھیکل کی خدمت کے لئے مختص کر دیا گیا (۳/۳۵۔۳۶) ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ح ۔ ر ۔ ر)

حضرت عیسیٰؑ کو قرآن کریم میں عام طور پر ”ابن مریم“ کہکر پکارا گیا ہے ۔ رینان اپنی کتاب (Life of Jesus) میں اس ضمن میں لکھتا ہے ۔

”آپ (حضرت عیسیٰؑ) طبقۂ عوام سے متعلق تھے ۔ آپکے والد ، یوسف اور والدہ ، مریم ، دونوں غریب گھرانے کے افراد تھے ۔ دستکاری ان کا پیشہ تھا ۔ . . . . آپ کے والد کا انتقال جلدی ہو گیا ۔ اس کے بعد حضرت مریمؑ ہی خاندان کی سرپرست رہ گئیں ۔ یہ وجہ ہے کہ حضرت مسیحؑ عام طور پر ”ابن مریم“ کے نام سے موسوم ہوئے ۔ یعنی جب آپکو آپکے ہمنام بچوں سے متمیز کرنا ہوتا تھا تو ”یسوع ابن مریم“ یا ابن مریم کہا جاتا تھا“ ۔

حضرت مریمؑ کی زندگی کے متعلق تفصیلی حالات میری کتاب ”شعلۂ مستور“ میں ملیں گے ۔

م ز ج

اَلْمَزْجُ ۔ ملانا ۔ مَزَجَ الشَّرَابَ بِالْمَاءِ ۔ اس نے شراب میں پانی ملا دیا ۔ مِزَاجٌ ۔ وہ شے جو (شراب میں) ملائی جائے** ۔ مِزَاجُ الْخَمْرِ کَافُوْرٌ ۔ اس شراب میں کافور کی خوشبو ہے*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

دو ملی ہوئی چیزوں میں سے ہر شے دوسری کیلئے مِزَاجٌ کہلاتی ہے۔ قرآن کریم میں مومنین کے متعلق ہے کہ ۔ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاْسٍ کَانَ مِزَاجُهَا کَافُوْرًا (۷۶/۵) ۔ وہ ایسے پیالہ سے پیتے ہیں جس میں کافور کی آمیزش ہوتی ہے ۔ کَافُوْر (دیکھئے ک ۔ ف ۔ ر) کی تاثیر یہ ہے کہ وہ حدت کو برودت (ٹھنڈک) میں تبدیل کر دیتا ہے ۔ ایک منظم اور بامقصد جماعت کی پہلی منزل اپنے اوپر پابندیاں عائد کرکے ڈسپلن پیدا کرنے کی ہوتی ہے ۔ پھر اس کے بعد اگلی منزل یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کی مدافعت میں ، نظامِ خداوندی کے مخالفین کے مقابلہ میں سخت گرم جوشی دکھاتے ہیں ۔ اس کے لئے کہا کہ وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا (۷۶/۱۷) یہ اس پیالہ سے پیتے ہیں جس میں زنجبیل (سونٹھ) کی آمیزش ہوتی ہے ۔ سونٹھ کی تاثیر حدت پیدا کرنا ہوتی ہے ۔ اس جماعت کے لئے یہ دونوں منزلیں ضروری ہیں ۔ یا یہ کہ وہ اپنوں کے ساتھ ٹھنڈک کا برتاؤ کرتے ہیں اور مخالفین کے مقابلہ میں گرمی کا ۔ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹) ۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان (اقبال)

متضاد اور مخالف قوتوں میں صحیح صحیح امتزاج سے مومن کی سیرت تعمیر ہوتی ہے ۔ اسی کو اپنے اندر الاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى کا منعکس کرنا کہتے ہیں ۔ یعنی مختلف صفات خداوندی کا خاص تناسب و توازن سے اپنے اندر اجاگر کئے جانا ۔

م ز ق

مَزَقَهٗ ۔ يَمْزِقُهٗ ۔ اس نے اسکو پھاڑ دیا ۔ یا اس میں سوراخ کردیا ۔ فَتَمَزَّقَ ۔ پس وہ پھٹ گیا ۔ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ۔ اَلْمِزَقُ ۔ پھاڑے ہوئے کپڑے وغیرہ کے ٹکڑے ۔ تَمَزَّقَ الْقَوْمُ ۔ قوم منتشر اور پراگندہ ہو گئی * ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (۳۴/۷) ۔ جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو کر منتشر ہو جاؤ گے ۔ اس دنیا میں قومی ضعف و انتشار ، اور مرنے کے بعد طبعی انتشار ، دونوں کو محیط ہو سکتا ہے ۔

*تاج ۔ **محیط ۔ *تاج و محیط ۔

م ز ن

اَلْمُزْنُ ۔ وہ سفید اور روشن بادل جس میں پانی ہو۔ اس قسم کے بادل کا ٹکڑا مُزْنَۃٌ کہلائیگا*۔ فُلَانٌ یَتَمَزَّنُ۔ فلاں آدمی بادل کی مشابہت اختیار کرتا ہے۔ یعنی بتکلف سخاوت کرتا ہے**۔ قرآن کریم میں پانی کے متعلق ہے۔ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْہُ مِنَ الْمُزْنِ ..... (۵۶/۶۹)۔ کیا اُسے بادل میں سے تم نیچے لاتے ہو...؟ یعنی سامان رزق سب کا سب خدا کی طرف سے ملتا ہے۔

م س ح

اَلْمَسْحُ ۔ پونچھنا۔ کسی لتھڑی ہوئی چیز پر ہاتھ پھیر کر اس کی آلائش کو صاف کر دینا، جیسے مَسَحْتُ رَاْسِیْ مِنَ الْمَاءِ وَجَبِیْنِیْ مِنَ الرَّشْحِ۔ میں نے پانی کو اپنے سر سے اور پسینے کو اپنی پیشانی سے پونچھ ڈالا۔ ابو زید نے کہا ہے کہ کلام عرب میں مَسْحٌ کے معنی تر کرنے یا دھونے کے بھی ہیں۔ یعنی آلائش کو پانی کے ساتھ صاف کردینا۔ مَسَحْتُ یَدِیْ بِالْمَاءِ۔ میں نے اپنے ہاتھ کو پانی سے دھویا۔ اور تَمَسَّحْتُ بِالْمَاءِ۔ میں نے غسل کیا*۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ مَسَحْتُہٗ بِیَدِیْ کے معنے ہیں، میں نے اس پر اپنا ہاتھ پھیرا۔ سورۃ صٓ میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق ہے کہ جب ان کے گھوڑے ان کے سامنے آئے فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ (۳۸/۳۳)۔ تو وہ ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ (جیسے سوار اپنے گھوڑوں پر ہاتھ پھیرتے ہیں)۔

اَلْمَسْحُ ۔ اَلْمِسَاحَۃُ۔ ناپنا۔ مَسَحَ الْاَرْضَ۔ اس نے زمین کی پیمائش کی*۔ اس کا (Survey) کیا۔ اَلْمِسْحُ۔ راستے کو کہتے ہیں اور اَلْمَسِیْحُ اس شخص کو جو بہت چلنے والا (سیر و سیاحت کرنے والا) ہو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو پھیلا کر کسی چیز پر چلانا۔

حضرت عیسیٰؑ کو مَسِیْحٌ بھی کہتے ہیں (۳/۴۴)۔ صاحب قاموس نے اس کے اشتقاق میں قریب پچاس اقوال نقل کئے ہیں*۔ ان میں ایک یہ بھی ہے (اور راغب نے اس کی تائید کی ہے کہ) چونکہ آپ بہت چلنے والے تھے اس لئے آپ کو مَسِیْحٌ کہا گیا ہے۔ اس کے بعد راغب لکھتا ہے

*تاج۔ **راغب۔

کہ اُن کے زمانہ میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو ہمیشہ گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ انہیں مَشَّائِیْنَ اور سَیَّاحِیْنَ کہا جاتا تھا**۔ اور حضرت مسیحؑ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے، اس لئے انہیں مَسِیْح* کہا گیا ہے***۔ لیکن صاحب محیط نے کہا ہے کہ قدیم زمانہ میں کاہنوں اور بادشاہوں کے بدن پر تیل وغیرہ کی مالش کی جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے بدن پر بھی مالش کی گئی تھی اس لئے آپ کو مَسِیْح* کہا گیا (The Annointed)****۔ (نیز دیکھئے عنوان س۔ی۔ح جس میں لکھا گیا ہے کہ مَسِیْح* غالباً عربی لفظ نہیں)۔

سورۃ مائدہ میں ہے کہ جب تم صلٰوۃ کے لئے اٹھو تو فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ۔ اپنے چہروں کو اور کہنیوں تک ہاتھوں کو دھو لیا کرو۔ اس کے بعد ہے وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ (۵/۶)۔ یہاں چونکہ وَ امْسَحُوْا۔ فَاغْسِلُوْا سے الگ آیا ہے اس لئے اس کے معنی دھونے کے نہیں ہونگے۔ صرف پونچھ لینے کے ہونگے۔

اس سے آگے ہے کہ اگر تم بیمار ہو یا حالت سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے، یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو۔ فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا۔ تو پاکیزہ مٹی کا قصد کرو۔ فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِنْهُ (۵/۶ و ۴/۴۳)۔ "پاکیزہ مٹی کا قصد کرو"۔ بات تو قرآن کریم نے اتنی ہی کہی ہے لیکن اس اشارہ سے مقصود یہ ہے کہ بدن کی آلائش کو پاکیزہ مٹی سے صاف کر لیا کرو۔ اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کر لیا کرو"۔ یعنی پونچھ لیا کرو۔

اصل یہ ہے کہ صلٰوۃ سے پہلے وضو سے جہاں مقصود ہاتھ پاؤں کو پاک اور صاف کرنا ہے وہاں اس سے مراد ایک نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنا بھی ہے جو کسی کام کے شروع کرنے سے پہلے تمہیداً ضروری ہوتی ہے۔ پانی نہ ملنے (یا اس سے پرہیز) کی صورت میں ہاتھ پاؤں دھونے کا مقصد حل نہیں ہو سکتا، لیکن "تیمم" سے صلٰوۃ کی تیاری کا نفسیاتی پہلو ضرور سامنے آجاتا ہے۔ یعنی اس سے انسان کے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے۔

م س خ

اَلْمَسْخُ۔ کسی کی شکل و صورت بدل دینا اور بگاڑ دینا۔ یعنی پہلی شکل کے مقابلہ میں زیادہ بد نما اور قبیح بنا دینا*****۔ راغب نے کہا ہے کہ

---

*تاج۔ **راغب۔ ***اس فرقہ کا نام (Essenes) ایسینی تھا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب شعلۂ مستور (تذکرہ حضرت عیسیٰؑ)۔ ****محیط۔ *****تاج و راغب و محیط

بگاڑنے اور قبیح بنانے کا یہ عمل جسمانی ساخت میں بھی ہوتا ہے اور عادات و اخلاق میں بھی ۔ لیکن دونوں صورتوں میں ، یہ تبدیلی قباحت کو لئے ہوئے ہوگی ۔ اس نہج سے اَلْمَسِیْخُ مِنَ النَّاسِ اس آدمی کو کہتے ہیں جس میں حسن اور ملاحت نہ ہو ۔ یا جو کمزور اور احمق ہو ۔ لَحْمٌ مَسِیْخٌ ۔ وہ گوشت جس میں کوئی مزہ نہ ہو* ۔ طَعَامٌ مَسِیْخٌ ۔ وہ کھانا جس میں نہ نمک ہو ، نہ رنگ نہ مزہ ۔ اِنْمِسَاخٌ حَمَاةِ الْفَرَسِ ۔ گھوڑے کی ٹانگ کی مچھلی کا لاغر ہو جانا (تاج) ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰی مَکَانَتِهِمْ (٣٦/٦٧) ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم ان کی قوت و مقدرت کے باوجود انہیں کمزور و عاجز کر دیں ۔ ان کی قوت و مقدرت مبدل بہ ضعف و درماندگی ہو جائے ۔

م س د

اَلْمَسْدُ ۔ بٹنا ۔ مَسَدَ الْحَبْلَ ۔ اس نے رسی کو بٹ دیا ۔ اَلْمَسَدُ ۔ کھجور کے پٹھے جنہیں بٹ کر رسی بنائی جاتی ہے ۔ اس طرح بٹی ہوئی رسی کو بھی کہتے ہیں** ۔

قرآن کریم میں حَبْلٌ مِنْ مَسَدٍ (١١١/٥) آیا ہے ۔ یعنی کھجور کے پٹھوں کی بٹی ہوئی رسی ۔ قانونِ مکافات کی محکم گرفت مراد ہے ۔

م س س

مَسٌّ ۔ چھونا ۔ کسی چیز تک پہنچنا** ۔ راغب نے لکھا ہے کہ مَسٌّ لَمْسٌ کے ہم معنی ہے ۔ فرق یہ ہے کہ لَمْسٌ تلاش کرنے اور ٹٹولنے کو بھی کہتے ہیں اور اس میں یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کو تلاش کیا جارہا ہو وہ مل بھی جائے ، برخلاف مَسٌّ کے کہ اس کا استعمال اسی وقت ہوتا ہے جب کہ حاسّهٔ لَمْس کے ذریعہ اس چیز کا ادراک بھی کر لیا جائے ۔

(١) کسی چیز کا جو ابتدائی اثر ہو اسے بھی مَسٌّ کہتے ہیں ۔ وَجَدَ فُلَانٌ مَسَّ الْحُمّٰی ۔ اسے بخار کی ابتدائی کیفیت محسوس ہوئی ۔ لَمْ یَجِدْ مَسًّا مِنَ النَّصَبِ ۔ اسنے ذرا سی بھی تھکن محسوس نہ کی ۔ نیز ، ہر پیش آنے والی چیز اور اذیت کو مَسٌّ سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ مجازاً اس کا اطلاق جنون پر بھی ہوتا ہے** ۔

*تاج و محیط و راغب ۔ نیز ابن فارس ۔ **تاج و راغب ۔

اَلتَّمَاسُّ باہم ایک دوسرے کو چھونا ۔ کنایۃً مجامعت کو کہتے ہیں * (۵۸/۳)۔ مجامعت کے لئے مَسٌّ اور مَاسٌّ بھی استعمال ہوتا ہے** ۔ (۲/۲۳۶) میں مجامعت کے لئے تَمَسُّوْهُنَّ آیا ہے ۔

سورہ طٰہٰ میں ہے کہ جس سامری نے بنی اسرائیل کے لئے بچھڑا بنایا تھا اسے سزا یہ دی گئی تھی اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ (۲۰/۹۷)۔ تاج العروس میں ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تو کہتا رہے کہ میں کسی کو نہیں چھوتا اور کوئی مجھے نہ چھوئے ۔ مطلب یہ ہے کہ اسے برادری سے خارج کر دیا گیا تھا اور اسطرح وہ ”اچھوت“ (Un- Touchable) بن گیا تھا ۔ یعنی اُس سے سب نے معاشرتی تعلقات منقطع کر لئے تھے ۔

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ لَمْسٌ ہاتھ سے چھونے کے لئے خاص ہے اور مَسٌّ عام ہے ۔ یعنی ہاتھ سے چھونے اور بدن کے کسی عضو سے چھونے کے لئے بھی آتا ہے ۔

قرآن کریم میں ہے لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۵۶/۷۹) ۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں کے علاوہ جو پاکیزہ سیرت اور پاکیزہ خیال ہوں دوسرے لوگ قرآنی حقائق پر مطلع نہیں ہو سکتے ۔ یعنی یہاں قرآن کریم کو مس کرنے کے معنی اسے چھونا نہیں، اس کے حقائق سے باخبر ہونا ہے** ۔ روح المعانی سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے فکر و نظر کی تطہیر اور قلب و دماغ کی پاکیزگی اولین شرط ہے ۔ جو شخص غیر قرآنی خیالات اور نظریات کو لیکر قرآن کریم کی طرف آئیگا، قرآنی حقائق اس پر کبھی بے نقاب نہیں ہونگے ۔ فکر و ادراک کی پاکیزگی کے ساتھ ہی قلب و نگاہ کی عفت و تطہیر بھی ضروری ہے ۔ جو قلب انسانیت سوز خیالات کی آماجگاہ ہو وہ قرآن کریم کی روشنی سے منور نہیں ہو سکتا ۔ قرآن کریم سے راہ نمائی وہی حاصل کر سکتا ہے جو خالی الذہن ہو کر اسکی طرف آئے اور اس کے دل میں تلاش حقیقت کی سچی تڑپ ہو ۔ پاکبازوں کے سوا کسی کو قرآن کریم سے مس نہیں ہو سکتا ۔

م س ک

اَلْمَسْكُ ۔ کھال (جس میں گوشت اور ہڈیاں وغیرہ بند رہتی ہیں یا جس کی مشک وغیرہ بنائی جاتی ہے) ۔ چونکہ مشک وغیرہ پانی کو روک لیتی ہے اس لئے مَسَكَ بِهٖ ۔ اَمْسَكَ ۔ تَمَاسَكَ ۔ اِسْتَمْسَكَ ۔ تَمَسَّكَ ۔ مَسَّكَ کے معنی ہیں کسی کو پکڑ لینا ۔ کسی چیز سے چمٹ

*تاج و راغب ۔ **محیط و تاج ۔

جانا * ۔ اَلْاِمْسَاکُ ۔ بخل کرنا ** ۔ اَلْمِسْکُ ۔ مُشْک * (کیونکہ وہ اُس خون سے ترتیب پاتی ہے جو ہرن کے نافہ میں رک گیا ہو) ۔

سورۂ بقرہ میں اِمْسَاکٌ بمقابلہ تَسْرِیْحٌ آیا ہے (۲/۲۲۹) ۔ یعنی نکاح میں رکھنا ۔ سورۂ بنی اسرائیل میں یہ اِنْفَاقٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۷/۱۰۰) ۔ سورۂ فاطر (۳۵/۲) میں یہ فَتَحَ (کھولدینے) کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ اور (۳۵/۴۱) میں زَالَ کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ اور زَالَ کے معنی اپنی جگہ سے ہٹ جانا ہیں ۔ سورۂ ص (۳۸/۳۹) میں مَنَّ (احسان کرنے) کے مقابلہ میں اَمْسَکَ آیا ہے ۔ اس میں بھی بخل کا مفہوم پایا جاتا ہے ۔ سورۃ تطفیف میں جنت کی ''شراب'' کے متعلق ہے خِتٰمُهٗ مِسْكٌ (۸۳/۲۶) ۔ اس کی مہر مشک کی ہے ۔

سورۃ مائدہ میں شکاری جانوروں کے شکار کے سلسلے میں ہے فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ ...... (۵/۴) ۔ ''جس شکار کو وہ تمہارے لئے پکڑ رکھیں ۔ اس میں سے کھاؤ'' ۔

م س و (ی)

اَلْمَسَاءُ ۔ شام کے وقت کو کہتے ہیں ۔ صَبَاحٌ کی ضد ہے ۔ مَسَاکَ فُلَانٌ وَاَمْسٰی وَمَسّٰی ۔ فلاں آدمی نے تجھ سے کسی بات کا وعدہ کیا مگر پھر اس نے اس کے پورا کرنے میں دیر لگا دی ۔ مَسَّاکَ اللّٰهُ بِالْخَيْرِ ۔ خدا تمہاری شام بھلائی کے ساتھ گزارے ۔ اَلْمُمْسٰی وَالْمِسٰی ۔ شام کا وقت *** ۔ اَمْسٰی ۔ وہ شام کے وقت میں داخل ہوا ۔

ابن القوطیہ نے کہا ہے کہ اَلْمَسَاءُ ظہر سے مغرب تک کے درمیانی وقت کو کہتے ہیں ۔ محمد نے کہا ہے کہ اَلْمَسَاءُ کا لفظ دو وقتوں پر بولا جاتا ہے ۔ ایک تو زوالِ آفتاب کے وقت پر اور دوسرے اس وقت پر جب آفتاب غروب ہو ** ۔ عرب کے لوگ مَسَاءٌ کا لفظ کِنَایَۃً تباہی اور شر کے لئے ، اور صَبَاحٌ کا لفظ مسرت اور خیر و برکت کے لئے بولتے ہیں ** ۔

قرآن کریم میں ہے فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ (۳۰/۱۷) ''پس اللہ کے لئے پاکیزگی ہے جب تم شام کے وقت میں داخل ہوتے ہو اور جب تم صبح کرتے ہو'' ۔ یہ اس کا عام ترجمہ ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذات زمان (Time) کے تعینات سے بلند ہے ۔ صبح ، شام (یا رات دن) کے امتیازات تمہارے لئے ہیں ۔ خدا کی ذات ان تحدیدات اور تعینات سے بہت بلند ہے ۔

* تاج و محیط ۔ ** محیط ۔ *** تاج ۔

۴

مسیح

حضرت عیسیٰؑ کا دوسرا نام (۳/۴۵) یا لقب - تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان م - س - ح - نیز عیسیٰؑ - (آپ کی زندگی کے تفصیلی حالات میری کتاب شعلۂ مستور" میں ملینگے)۔

م ش ج

مَشَجَ بَیْنَهُمَا - اس نے دونوں کو باھمدگر خلط ملط کر دیا - ملا دیا*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ھیں - شَیْئٌ مَشِیْجٌ وَمَشْجٌ - ملی ھوئی چیز - اسکی جمع اَمْشَاجٌ ھے*۔

قرآن کریم میں ھے - اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ اَمْشَاجٍ (۷۶/۲) - ھم نے انسان کو اس نطفہ (مادہ) سے پیدا کیا جس میں مختلف جوھر امکانی شکل میں(Potentialities)مخلوط ھوتے ھیں - اس سے رحم مادر میں جنین وجود میں آجاتا ھے - نَبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا (۷۶/۲)- پھرھم ایسا انتظام کر دیتے ھیں کہ جنین کے ان مضمر جوھروں کی نمود ھو جائے تا آنکہ وہ صاحب سماعت و بصیرت بن جائے -

م ش ی

مَشْیٌ - پیدل چلنا - راغب نے کہا ھے کہ مَشْیٌ کے معنی ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف اپنے ارادے سے منتقل ھونے کے ھیں - مجازاً مَشْیٌ کے معنی راہ پا جانے اور رھنمائی حاصل کرنے کے بھی آتے ھیں **- اَلْمَاشِیَةُ (جمع اَلْمَوَاشِی) اونٹ بکری وغیرہ چوپایوں کو کہتے ھیں - تاج العروس میں ھے کہ دراصل مَشَاءٌ کے معنی کثرت اور نشوو نما کے ھیں - چنانچہ اِمْرَاَۃٌ مَاشِیَةٌ اس عورت کو کہتے ھیں جس کے بہت بچے ھوں **- ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) انسان وغیرہ کی حرکت - اور (۲) نمو اور زیادتی کے ھیں -

قرآن کریم میں قَامُوْا کے مقابلہ میں مَشَوْا آیا ھے (۲/۲۰)- یعنی چلنا- سورہ اعراف میں ھے - اَلَهُمْ اَرْجُلٌ یَّمْشُوْنَ بِهَا (۷/۱۹۵)- کیا ان کے پاؤں ھیں جن کے ذریعہ وہ چل سکتے ھیں ؟

*تاج و راغب- **تاج و محیط-

سورہ قلم میں مَشَّآءٍ بِنَمِیۡمٍ آیا ہے (۶۸/۱۱)۔ اسکے معنی ہیں وہ شخص جو بہت زیادہ ادھر کی باتیں ادھر پہنچاتا رہے ۔ کبھی اس کے پاس پہنچے کبھی اُس کے پاس جائے ، اور اسطرح لوگوں کی چغلیاں کھاتا پھرے ۔

م ص ر

اَلْمِصْرُ ۔ دو چیزوں کے درمیان حد کو کہتے ہیں ۔ شہر کو مِصْرٌ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ مَمْصُوْرٌ یعنی محدود ہوتا ہے ۔ اس کے گردا گرد حد بندی کی جاتی ہے ۔ مِصْرٌ کے معنی ہیں کوئی شہر یا علاقہ ۔ اور مِصْرُ ۔ ملک مصر (Egypt) کو کہتے ہیں ۔ سرخ مٹی کو بھی مِصْرٌ کہتے ہیں *۔

قرآن کریم میں مِصْرٌ (بمعنی شہر) سورہ بقرہ (۲/۶۱) میں آیا ہے ۔ میدانوں کی بے پایاں وسعتوں کے مقابلہ میں ، محدود بستی ۔

مُصَیۡطِرٌ

اسکا مادہ س ۔ ط ۔ ر ہے ۔ اسے اُسی عنوان کے تابع دیکھئے ۔

م ض غ

اَلْمُضْغَةُ ۔ گوشت کا ٹکڑا ۔ (گوشت کے علاوہ دوسری چیزوں کے ٹکڑے کو بھی کہہ سکتے ہیں)۔ مُضْغَةٌ مِنَ اللَّحْمِ ۔ گوشت کی اتنی مقدار کو کہتے ہیں جو چبانے کے لئے منہ میں ڈالی جا سکے ۔ اَلْمَضَاغُ ۔ جو چیز چبائی جائے ۔ مَضَغَهٗ یَمْضَغُهٗ مَضْغًا ۔ کسی چیز کو دانتوں سے چبانا *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں ۔

قرآن کریم میں جنین (رحم میں بچے) کی مختلف حالتوں میں سے ایک حالت کو مُضْغَةٌ (۲۲/۵) کہا گیا ہے ۔ یعنی وہ حالت جس میں جنین ایک گوشت کے لوتھڑے کے مانند ہوتا ہے (اور اس میں ہنوز ہڈیاں سخت نہیں ہوتیں) ۔

م ض ی

مَضَی الشَّیْءُ ۔ یَمْضِیْ ۔ کسی چیز کا (پہلے) گزر جانا اور چلے جانا ۔ مَضَی السَّیْفُ مَضَاءً ۔ تلوار نے کاٹ دیا (تیز ہونے کی وجہ سے)۔

*تاج و محیط و راغب ۔

اَلْمَاضِيْ - شیر ، کیونکہ وہ اپنی جرأت کی وجہ سے آگے ہی آگے رہتا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے اسے کر گزرتا ہے۔ تلوار (جو تیز ہو) کیونکہ وہ جس چیز پر ماری جاتی ہے اُسے کاٹ دیتی ہے*۔

قرآن کریم میں ہے۔ فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ (۸/۳۸) - امم سابقہ کی سنت گذر چکی ہے۔ تاریخی وقائع و حوادث سے مراد ہے۔

م ط ر

اَلْمَطَرُ - بارش * - (۲/۱۰۲) - الإِمْطَارُ - عذاب کی بارش کے لئے بھی بولتے ہیں * - راغب نے کہا ہے کہ مَطَرَ اس بارش کے لئے بولتے ہیں جسکے نتائج خوش گوار اور بھلے ہوں - اور اَمْطَرَ اس کے لئے جو نقصان رساں ہو**۔ ابن فارس کہتا ہے کہ اُمْطِرَ (مجہول) صرف عذاب ہی کے لئے آتا ہے۔ قرآن کریم میں قوم لوط کے عذاب کے متعلق ہے۔ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا (۷/۸۴) '' اور ہم نے ان پر ایک بارش برسائی۔ مُمْطِرٌ۔ بارش لانے والا۔ هٰذَا عَارِضٌ مُمْطِرُنَا (۴۶/۲۴)۔ یہ بادل ہم پر مینہ برسانے والا ہے۔

م ط ی (و)

مَطَا۔ مَطْوًا - اس نے چلنے میں پورا زور لگایا اور تیز چلا۔ مُطَوَاءٌ۔ انگڑائی۔ بیشتر بخار کے وقت آنے والی انگڑائی کو کہتے ہیں - اسی سے مَطَّاوَ تَمَطّٰى کے معنی بڑھنا ، لمبا ہونا ، دراز ہونا ، ہو گئے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں - چنانچہ تَمَطَّى النَّهَارُ کے معنی ہیں دن نے انگڑائی لی - یعنی طلوع آفتاب کے بعد اس نے بڑھنا شروع کیا۔ اَلتَّمَطِّيْ کے معنی ہیں اکڑ کر چلنا۔ اتراتے ہوئے جانا۔ چلنے میں ہاتھوں کو بڑھانا اور پھیلانا ***۔ راغب نے لکھا ہے کہ المَطَا پشت کو کہتے ہیں اور تَمَطّٰى کے معنے ہیں اپنی پیٹھ کو اونچا کرنا اور بڑھانا۔ (اکڑنے میں یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے)۔ قرآن کریم میں ہے۔ ذَهَبَ اِلٰى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى (۷۵/۳۳)۔ '' وہ اپنے ساتھیوں کی طرف اتراتا ہوا گیا ''۔

مع

مَعَ - ساتھ - یہ لفظی و معنوی دونوں معینوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ جسمانی معیت کے لئے قرآن کریم میں ہے۔ دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ (۱۲/۳۶)۔ ''اس کے ساتھ قید خانہ میں دو جوان داخل ہوئے''۔ اور معنوی معیت

---

*تاج　**راغب۔　***تاج و راغب۔

کے لئے - وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (۸/۶۶) - ''اور اللہ صابرین کے ساتھ ہے''۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ اور صابرین کسی مقام پر (ایک جگہ) اکٹھے ہوجاتے ہیں - یا اللہ صابرین کے زمرے میں شامل ہوجاتا ہے - اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ کی تائید و نصرت صابرین کے ساتھ ہوتی ہے -

کبھی یہ عِنْدَ - یعنی ''پاس'' - کے معنوں میں بھی آتا ہے - جیسا کہ کہتے ہیں - جِئْتُ مِنْ مَعِ الْقَوْمِ - میں قوم کے پاس سے آیا

م ع ز

مَعْزٌ (جمع - واحد مَاعِزٌ) بکری* - (۶/۱۴۴) - گٹھیلے بدن والے قوی آدمی کو بھی اَلْمَاعِزُ کہتے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں شدت اور صلابت کے ہیں - اور بکری کو اَلْمَعْزُ اس لئے کہتے ہیں کہ ضَانٌ (بھیڑ) کے مقابلہ میں اس میں ایک طرح کی سختی ہوتی ہے -

م ع ن

اَلْمَعْنُ - معمولی اور حقیر چیز - ایک طرف یہ قصیر اور قلیل کے لئے استعمال ہوتا ہے اور دوسری طرف، طویل اور کثیر کو بھی کہتے ہیں - زمین کے اوپر بہنے والا پانی - اَلْمَاعُوْنُ - ہر بھلائی - بارش - کیونکہ وہ خدا کی طرف سے بلا مشقت مل جاتی ہے - پانی - ہر وہ چیز جس سے نفع اٹھایا جائے - ہر وہ چیز جو یونہی بلا مشقت مل جائے اور اس سے نفع اٹھایا جائے - وہ چیزیں جو مانگنے والوں سے روکی نہ جائیں - سامانِ نشو و نما - مَعَنَ الْفَرَسُ - گھوڑا دوڑتے ہوئے دور نکل گیا - مَعَنَ الْمَاءُ - پانی بہا - مَعَنَ النَّبْتُ - پودے پانی سے سیراب ہو گئے - مَعِیْنٌ - جاری پانی جو کھلا ہوا بہ رہا ہو** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے بہنے یا چلنے وغیرہ میں سہولت کے ہیں - یعنی آسانی سے کسی کام کا ہو جانا -

قرآن کریم میں ہے - ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیْنٍ (۲۳/۵۰) - ایسی سر زمین جو ہموار ہو اور اس میں پانی جاری ہو - سورۃ ماعون میں ہے وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۱۰۷/۷) - وہ ان چیزوں کو روک رکھتے ہیں جو خدا کی طرف سے منفعتِ عامہ کے لئے ملی ہیں - یعنی سامان نشو و نما جسے بہنے پانی کی طرح عام ہونا چاہئے*** - جیسے آبِ رواں کی طرح ہر ضرورتمند کے دروازے کے سامنے سے گزرنا چاہئے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق لے لے -

---

*تاج - **تاج و محیط و لطائف اللغۃ - ***ابن قتیبہ (القرطین - ج/۲ صفحہ ۲۱۹)

بعض نے کہا ہے کہ مَعِیْنٌ عَیْنٌ سے ہے* - اسی لئے اسے عَیْنٌ (ع - ی - ن) کے عنوان کے تحت بھی لکھا گیا ہے ۔ وہاں بھی دیکھ لینا چاہئے۔

م ع ی

اَلْمَعْیُ ۔ اَلْمِعیٰ - آنت ۔ (جمع اَمْعَاءٌ) ۔ اَلْمَاعِیَةُ ۔ ٹکڑے ٹکڑے کاٹی ہوئی چیز ۔ تَمَعَّی الشَّرُّ فِیْمَا بَیْنَھُمْ ۔ شر اُن کے درمیان پھیل گیا** ۔ قرآن کریم میں جہنم کے گرم پانی کے متعلق ہے کہ وہ حیات بخش ہونے کی بجائے ہلاکت آفریں ہوگا ۔ فَقَطَّعَ اَمْعَاءَھُمْ (۴۷/۱۵) ۔ اور اُن کی انتڑیاں کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیگا ۔ ان کی حیاتِ انسانی منقطع ہو جائیگی ۔ یا زندگی بخش ذرائع ختم ہو جائینگے ۔ سامان و ذرائعِ نشوونما سے محرومی ہو جائیگی ۔ (غذا کو جزوِ بدن بنانے کا بڑا ذریعہ انتڑیاں ہوتی ہیں) ۔

م ق ت

اَلْمَقْتُ ۔ سخت بغض اُس شخص کے خلاف جسے تم دیکھو کہ وہ برے کام کا خوگر ہوگیا* ۔ نِکَاحُ الْمَقْتِ ۔ باپ کے مر جانے پر اسکی منکوحہ سے نکاح کر لینا ، جاہلیت میں عربوں میں ایسے نکاح ہوتے رہتے تھے*** ۔ قرآن کریم نے اسکی سخت ممانعت کی ہے (۴/۲۲) ۔ ویسے عام نفرت اور بیزاری کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے ۔ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَکْبَرُ مِنْ مَقْتِکُمْ اَنْفُسَکُمْ (۴۰/۱۰) ۔ اللہ کی بیزاری تمہاری اپنی بیزاری سے کہیں بڑھ کر ہے ۔ لیکن مَقْتُ اللّٰهِ کے معنی ہونگے انسان کے برے اعمال کے ناخوش گوار نتائج جو قانون خداوندی کے مطابق مرتب ہوتے ہیں ۔ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۶۱/۳) ۔ "اللہ کے نزدیک یہ نہایت ناپسندیدہ بات ہے کہ تم وہ کچھ کہو جو کچھ کرتے نہیں ہو"۔
(مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوانات غ - ض - ب اور س - خ - ط وغیرہ)۔

م ک ث

اَلْمَکْثُ ۔ کسی جگہ پر انتظار کے ساتھ جم کر رہنا ۔ اَلْمَاکِثُ ۔ کسی جگہ انتظار میں ٹھہرنے والا ۔ اَلْمُتَمَکِّثُ ۔ منتظر ۔ اَلْمَکَاثُ ۔ دیر کرنا ۔ ٹھہرنا ۔ انتظار کرنا ۔ اَلتَّمَکُّثُ ۔ کسی کے انتظار میں ٹھہرے رہنا**** ۔

---

* راغب ۔ ** تاج و محیط ۔ *** تاج ۔ **** تاج و محیط و راغب ۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم بقا چاہتے ہو - تمہاری آرزو یہ ہے کہ جریدۂ عالم پر تمہارا دوام ثبت ہو جائے - تم زندۂ جاوید ہو جاؤ - تمہارے کارنامے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہیں - تو اس کے لئے اس بنیادی اصول کو سمجھ لو کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷) - جو چیز تمام نوع انسانی کے لئے نفع رساں ہوگی وہی دنیا میں باقی رہے گی - طبعی دنیا میں بقائے اصلح (Survival of the fittest) کا قانون کارفرما ہے - لیکن دنیائے انسانیت میں ''بقائے نافع'' کا قانون نفاذ پذیر ہے - لہذا باقی رہنا چاہتے ہو تو وہ کچھ کرو جو انسانیت کے لئے منفعت بخش ہو - جس سے ربوبیتِ عامہ ہو جائے - اسکی نفع بخشیاں کسی خاص گروہ ، خاص قوم ، خاص ملک تک محدود نہ ہوں بلکہ وہ تمام نوع انسانی کے لئے یکساں طور پر کھلی ہوں - یہی اسلام کا مقصود اور قرآنی نظام ربوبیت کا مطلوب ہے - کیونکہ اس کا خدا ''رب العالمین'' ہے -

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے - وَ قُرْآنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَأَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا (۱۷/۱۰۶) - قرآن کریم کو ہم نے بتدریج نازل کیا ہے - اور اس کے مضامین کو الگ الگ بیان کیا ہے تاکہ تو اسے اسی طرح سے ، ٹھہر ٹھہر کر ، بتدریج لوگوں کے سامنے پیش کرے - سورۃ نمل میں ہے - فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ (۲۷/۲۲) - وہ تھوڑا عرصہ ٹھہرا - سورۃ قصص میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے اہل سے کہا اُمْكُثُوْا (۲۸/۲۹) - تم یہاں ٹھہرو -

م ک ر

اَلْمَكْرُ - خفیہ تدبیر - چنانچہ جب غلہ کو گھروں میں چھپا کر رکھ لیا جائے (احتکار) تو اسے بھی اَلتَّمَكُّرُ کہتے ہیں - جنگ کی تدبیر اور حیلہ کو بھی اَلْمَكْرُ کہتے ہیں* -

صاحب المنار نے لکھا ہے کہ مَكْرٌ اس خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں جو اس شخص کو جس کے خلاف یہ تدبیر کی جائے اس مقام تک پہنچا دے جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو** -

قرآن کریم میں ، نظام خداوندی کی مخالفت کرنے والوں کی سازشوں کو مَكْرٌ کہا گیا ہے - اور جماعتِ مومنین کی طرف سے ان کے جواب یا خدا

---

*تاج - **المنار ج/۳ صفحہ ۳۱۵ -

کے قانون مکافات کی رو سے ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج کو بھی مَکْرٌ ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وَ يَمْكُرُونَ وَ يَمْكُرُ اللهُ ۔ وَ اللهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ (۸/۳۰)۔ وہ تمہارے خلاف تدبیریں کر رہے تھے اور خدا (کا قانون) ان کے خلاف تدبیریں کر رہا تھا۔ خدا کی تدبیریں بہترین ہوتی ہیں۔ بڑی مؤثر اور کارگر۔

م ک ک

مَكَّ الْعَظْمَ ۔ اس نے ہڈی کو اس طرح چوس لیا کہ اس کا گودا سب صاف کر دیا* ۔ (ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں ۔) مَكَّ الْفَصِيْلُ مَا فِيْ ضَرْعِ أُمِّهِ ۔ اونٹنی کے بچے نے وہ تمام دودھ چوس لیا جو اس کی ماں کے تھن میں تھا ۔ مَكَّهُ ۔ اس نے اسے ہلاک کر دیا ۔ کم کر دیا* ۔

مَكَّةُ ۔ یعقوب نے کہا ہے کہ مَكَّةُ پورے حرم کو کہتے ہیں ۔ اور بَكَّةُ شہر مکہ کو کہتے ہیں ۔ مَكَّةُ کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے ۔ مثلاً (۱) اسے اس لئے مَكَّةُ کہتے ہیں کہ وہ گناہوں کو کم کر دیتا یا فنا کر دیتا ہے ۔ (۲) چونکہ اس شہر میں پانی بہت کم تھا اس لئے یہاں کے باشندے یہاں کا پانی گویا چوس ڈالتے تھے یا سب کا سب نکال لیتے تھے ۔ (۳) مَكَّ کے معنی جذب کرنے اور کھینچنے کے بھی آتے ہیں ۔ یہ شہر چونکہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا اور جذب کرتا ہے اس لئے اسے مَكَّةُ کہتے ہیں ۔ (۴) بَكَّ کی طرح مَكَّ بھی اژدھام کو کہتے ہیں ۔ اور چونکہ اس شہر میں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے اس لئے اسے مَكَّةُ یا بَكَّةُ کہتے ہیں ۔ (۵) مُكَاكٌ اور مُكَاكَةٌ* ۔ ہڈی سے نکالے ہوئے مغز اور گودے کو کہتے ہیں* جو ہڈی کے وسط میں ہوتا ہے ۔ چونکہ یہ شہر دنیا کے شہروں کا مغز ہے اس لئے اسے مَكَّةُ کہتے ہیں ۔ قرآن کریم میں مَكَّةُ اس شہر کے لئے آیا ہے جس میں مسجد حرام ہے ۔ (۴۸/۲۴) ۔ اسی کو بَكَّةُ بھی کہا گیا ہے (۳/۹۵) ۔ [دیکھئے عنوان ب ۔ ک ۔ ک] ۔

مَكَّة

مکہ معظمہ ۔ (دیکھئے عنوان م ۔ ک ۔ ک اور ب ۔ ک ۔ ک) ۔

*تاج و راغب ۔

م ک ن

المَکِینَۃُ - تمکن و اقتدار کو اور المُکْنَۃُ - قدرت و استطاعت کو کہتے ہیں - اَلْمَکَانَۃُ - وقار اور سکون کو کہتے ہیں ، اور المَکَانُ اس جگہ کو جو کسی چیز کو محیط اور اس پر حاوی ہو*- ابن فارس نے لکھا ہے کہ اَلْمَکِنَاتُ پرندوں کے گھونسلوں کو کہتے ہیں - [بعض کے نزدیک مَکَانٌ کا مادہ (ک - و - ن) ہے] - نیز اس کے معنی سمت اور جہت کے بھی آتے ہیں - قرآن کریم میں ہے وَ یَاْتِیْہِ الْمَوْتُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ (۱۴/۱۷) - ہر سمت سے اس کی طرف موت آ رہی ہوگی - (یہ مَکَانٌ ک - و - ن سے ہے) -

سورۃ نساء میں ہے زَوْجٍ مَکَانَ زَوْجٍ (۴/۲۰) ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی - سورۃ یونس میں مَکَانَکُمْ (۱۰/۲۸) - اپنی جگہ پر ٹھہرنے کے لئے آیا ہے -

مَکُنَ الشَّیْءُ - چیز قوی اور مضبوط ہوگئی - راسخ ہوگئی - اپنی جگہ پر جم گئی - اَمْکَنَ فُلَانًا الْاَمْرُ - فلاں آدمی کے لئے وہ کام آسان اور سہل ہوگیا - اسے اس پر قدرت حاصل ہوگئی - تَمَکَّنَ مِنَ الْاَمْرِ - وہ اس پر قادر اور کامیاب ہوگیا** -

اس اعتبار سے مکان کے معنی قدر و منزلت اور رتبہ اور درجہ کے آتے ہیں - وَ رَفَعْنٰہُ مَکَانًا عَلِیًّا (۱۹/۵۷) - اور ہم نے اسے بلند مرتبہ عطا کیا - استطاعت اور مقدرت کے معنوں میں سورۃ انعام میں ہے - اِعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ (۶/۱۳۵) - تم اپنی استطاعت بھر، اپنی پوری پوری طاقت کے مطابق، جو کچھ کرنا چاہتے ہو اپنے پروگرام کے مطابق کرو - سورۃ یٰسٓ میں ہے - لَمَسَخْنٰہُمْ عَلٰی مَکَانَتِہِمْ (۳۶/۶۷) - ہم ان کی طاقت اور مقدرت کے باوجود انہیں مٹا ڈالیں - ان کی قوت و مقدرت کو کمزور و ناتواں بنا دیں - مَکِیْنٌ - زبردست قدرت اور منزلت والا - جو اپنی جگہ پر مضبوطی سے جم کر بیٹھ جائے - عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ (۸۱/۲۰) - صاحب عرش کے نزدیک قدر و منزلت والا - مَکَّنَ - جما دینا - مضبوط بنا دینا - قرار گیر بنا دینا - وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَہُمْ دِیْنَہُمْ (۲۴/۵۵) - وہ ان کے دین کو ان کے لئے قائم اور مضبوط کردیگا - جو نظام زندگی ان کے لئے تجویز کیا گیا ہے اسے متمکن فی الارض کردیگا - نیز اس کے معنی حکومت عطا کرنا بھی ہیں - کَذٰلِکَ مَکَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ (۱۲/۵۶) - اسطرح ہم نے یوسف کو اس

*تاج - **محیط -

ملک میں حکمرانی عطا کر دی۔ اسے صاحب اختیارات بنا دیا ۔ اَمْكَنَهُ
مِنَ الشَّيْءِ۔ اسے کسی چیز پر غلبہ اور قابو دے دیا ۔ سورہ انفال میں ہے ۔
فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ (۸/۷۱) سو اللہ نے ان پر قابو پا لیا ۔

قرآن کریم نے اپنی صداقت کے پرکھنے کے لئے تین معیار بتائے ہیں۔
یا تو اپنے دور کے علمی دلائل سے اس پر غور کرو۔ یا تاریخی شواہد سے
دیکھو کہ سابقہ اقوام نے جب غلط روش اختیار کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلا۔
اور یا استنتاجی طریق (Pragmatic test) کے ذریعے اسکی صداقت کو پہچانو (۱۰/۳۹)۔
استنتاجی طریق کے معنی یہ ہیں کہ اس نظام کو قائم ہو کر اپنے نتائج پیدا
کرنے دو۔ نتائج سے خود بخود معلوم ہو جائیگا کہ اس کا دعوی سچا ہے یا
نہیں ۔ اسے اپنے دعوی کی صداقت پر اسقدر محکم یقین ہے کہ وہ اس استنتاجی
طریق پر بڑا زور دیتا ہے ۔ چنانچہ نبی اکرمؐ اپنے مخالفین سے بار بار
کہتے ہیں کہ اِعْمَلُوا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۔ تم اپنی طاقت اور
استطاعت کے مطابق اپنی جگہ، اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ۔
اِنِّي عَامِلٌ۔ میں اپنی جگہ، اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں۔ فَسَوْفَ
تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ (۶/۱۳۶) - عنقریب (نتائج سے)
معلوم ہو جائے گا کہ انجام کار اس گھر (دنیا) کی کامیابی و کامرانی کس کے
حصہ میں آتی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ
الظّٰلِمُوْنَ (۶/۱۳۶) - تم دیکھ لوگے کہ خدا کا یہ قانون کسقدر سچا ہے کہ
جو قوم نوع انسانی کے حقوق میں کمی کرتی ہے اور خدا کے قوانین سے سرکشی
برتتی ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ اسلام کو سچا ثابت کرنے کا
یہ طریقہ تھا ۔ یعنی اس کے عملی نظام کے نتائج سے دنیا پر واضح کر دینا
کہ یہ نظام کسطرح بے مثل و بے نظیر ہے ۔ یہ تھا اسلام کا دعوی ۔ اور اب
حالت یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کے نظری دلائل سے کچھ متاثر بھی ہوتے
ہیں وہ مسلمانوں کی عملی حالت دیکھ کر اس سے منہ پھیر لیتے ہیں کہ جس
"مذہب" پر چلنے والوں کی یہ حالت ہو وہ کس طرح نوع انسانی کی فلاح
و فوز کا ضامن بن سکتا ہے ؟ اور اس پر بھی جب مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ
تم جس "مذہب" پر چل رہے ہو یہ خدا کا وہ دین نہیں جو اس نے رسول اللہؐ
کی وساطت سے بھیجا تھا تو انہیں اسقدر غصہ آجاتا ہے کہ وہ مرنے مارنے
پر تیار ہو جاتے ہیں ۔ اس لئے کہ انہوں نے اعمال کو ان کے نتائج سے
پرکھنے کے قرآنی معیار کو نظر انداز کر رکھا ہے ۔ اب ان کے پاس کوئی
کسوٹی ہی نہیں جس سے اس کا فیصلہ کیا جاسکے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ

ٹھیک ہے یا غلط - اسکی کسوٹی صرف ایک ہے - اور وہ یہ کہ اعمال کے جو نتائج قرآن کریم نے بتائے ہیں ، اگر ہمارے اعمال سے وہ نتائج مرتب ہو رہے ہیں تو وہ اعمال صحیح طور پر سرانجام پا رہے ہیں - اگر وہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے ، تو وہ اعمال صحیح طور پر سرانجام نہیں پا رہے - یہ ٹھیک ہے کہ بعض اعمال کے نتائج مرنے کے بعد مرتب ہونگے لیکن یہ صحیح نہیں کہ تمام اعمال کے نتائج مرنے کے بعد ہی مرتب ہونگے اور اس دنیا میں کسی عمل کا نتیجہ سامنے نہیں آئیگا - قرآن کریم کی رو سے اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی نتیجہ خیز ہوتے ہیں اور یہی وہ نتائج ہیں جن سے اعمال کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے - اس دنیا کی ذلت و خواری خدا کا عذاب ہے اور قرآنی پروگرام پر عمل پیرا ہونے کے بعد یہ باقی نہیں رہ سکتی -

م ک و

مَکَا - یَمْکُوْ - مُکَاءً - سیٹی بجانا * - ابن فارس نے کہا ہے کہ ہاتھوں کو ایک خاص ہیئت سے اکھٹا کرکے سیٹی کی آواز نکالنے کو کہتے ہیں - راغب نے مَکَا الطَّیْرُ کے معنی پرندہ کے سیٹی جیسی آواز نکالنے کے لکھے ہیں** - اَلْمُکَّاءُ - ایک چھوٹا سا پرندہ ہوتا ہے جو باغات میں رہتا ہے * - (اس کا یہ نام اس لئے پڑا ہے کہ اسکی آواز سیٹی کی آواز سے مشابہ ہوتی ہے) - قرآن کریم میں عہد جاہلیہ کے عربوں کے متعلق ہے - مَا کَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُکَاءً وَّ تَصْدِیَةً (۸/۳۵) - خانہ کعبہ کے قریب ان کی صلوۃ بے معنی آوازوں اور بے مطلب حرکتوں کے سوا کچھ نہیں - یعنی ایسی نماز جس میں محض چند الفاظ (بلا سمجھے) دھرا لئے جائیں اور چند حرکات ادا کر دی جائیں - سوچئے کہ کیا آج ہماری نمازیں بھی بالعموم یہی کچھ بن کر نہیں رہ گئیں ؟ چند الفاظ کا دھرانا جنکا مفہوم نہ سمجھا جائے- اور چند حرکات جن کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو کہ ایسا کیوں کیا جاتا ہے- حالانکہ قرآن کریم نے جس صلواۃ کا حکم دیا تھا وہ قلب و دماغ کی تطہیر اور معاشرہ میں صالح انقلاب لانے کا ذریعہ تھی - اس میں ہر شخص کو معلوم ہوتا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں - کیوں ایسا کر رہا ہوں - اور اس کا نتیجہ کیا مرتب ہوگا - دین (نظام خداوندی) کے پروگرام کی ہر کڑی ایک غایت لئے ہوتی ہے اور انسانیت کے بلند مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے - لیکن جب دین کا مقصود نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو اس کے پروگرام کی یہ

*تاج - **راغب -

حیات بخش کڑیاں ، محض رسم بنکر رہ جاتی ہیں جن کی ادائیگی مقصود بالذات سمجھ لی جاتی ہے ۔ اس مقام پر دین ، '' مذہب '' بنکر رہ جاتا ہے ۔

م ل أ

مَلَأَ الشَّيْءَ يَمْلَأُهُ مَلْأً ۔ کسی چیز کو بھر دیا ۔ فَامْتَلَأَ ۔ پس وہ بھر گئی ۔ لَأَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ (۷/۱۸) ۔ میں ضرور جہنم کو بھر دونگا ۔ مِلْءٌ ۔ وہ مقدار جس سے کوئی چیز بھر جائے* ۔ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا (۳/۹۰) ۔ زمین بھر سونا ۔ مَالِئُوْنَ ۔ بھرنے والے (۳۷/۶۶) ۔

اَلْمَلَأُ ۔ باہم مشورہ کرنا ۔ نیز جماعت ۔ جتھا ۔ قوم کے سردار و شرفاء ۔ رؤساء و امراء و اکابر وغیرہ* ۔ اَلْمَلَأُ الْأَعْلٰی (۳۸/۶۹) ۔ بڑے بڑے سردار ۔ بالاتر گروہ کے افراد ۔ لیڈر قسم کے لوگ ۔ دوسری جگہ نجومیوں اور کاہنوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اَلْمَلَاِ الْأَعْلٰی کی باتیں نہیں سن سکتے (۳۷/۸) ۔ یہاں اس سے مراد ہے عالم بالا کی بلند جماعتیں ۔ یعنی خدا کے عالم امر کے متعلقین ۔ مدبرات امور السمیہ ۔ المیلاءُ و المَلَاءُ ۔ مال دار لوگ ۔ وہ جن کے پاس ضرورت کی تمام چیزیں بھری ہوئی ہوں ۔ جن کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں* ۔ قرآن کریم میں اَلْمَلَأُ بھی انہی معنوں میں آیا ہے ۔ یعنی وہ لوگ اَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۲۳/۳۳) ۔ جنہیں سامان زیست کی فراوانیاں حاصل تھیں ۔

قرآن کریم میں ہے کہ جس قوم میں بھی کوئی رسول آیا سب سے پہلے اس قوم کے دولت مند طبقہ نے اس کی مخالفت کی ۔ وَمَا أَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۳۴/۳۴) ۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ ایسا پیغام لاتے تھے جس کی سب سے بڑی زد دولت مند طبقہ پر پڑتی تھی ۔ اسی لئے وہ بڑھ چڑھ کر ان کے پیغام کی مخالفت کرتے تھے ۔ اگر محض '' پوجا پاٹ '' کا سوال ہوتا تو دولت مندوں کا اس سے کیا بگڑتا تھا جو وہ اس کی مخالفت کرتے ۔ دولت مند تو بلکہ ایسے کاموں میں پیش از پیش حصہ لیتے ہیں اور چندے دیتے ہیں ۔ قرآن کریم کی تصریحات اس پر شاہد ہیں کہ حضرات انبیاء کرامؑ جس انقلاب آفریں پروگرام کو لیے کر آتے تھے اس میں رزق کے سرچشمے دولت مندوں کے ہاتھوں سے چھن

*تاج ۔

کر خدا کے قانونِ ربوبیت کے ہاتھوں میں آجاتے تھے ۔ یہ وجہ تھی کہ یہ طبقہ ہمیشہ اس انقلاب کی مخالفت کرتا تھا کیونکہ اس کی کامیابی میں انہیں اپنی موت دکھائی دیتی تھی ۔

یہی ہوتا چلا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ آج بھی جہاں قرآنی انقلاب کی آواز اٹھیگی سرمایہ دار طبقہ اس کی مخالفت کرے گا اور مذہبی پیشوائیت اس مخالفت میں ان کے ساتھ ہوگی ۔

(نیز دیکھئے عنوان ت ۔ ر ۔ ف) ۔

م ل ح

اَلْمِلْحُ ۔ نمک ۔ سخت نمکین (کڑوا) پانی جو شیریں پانی کی ضد ہوتا ہے ۔ اَلْمَلَّاحُ ۔ نمک فروخت کرنے والا ۔ کشتی چلانے والا کیونکہ وہ ہمیشہ شور پانی میں رہتا ہے ۔ عرب ، نمک کو بڑی اہمیت دیتے تھے اس لئے ذمہ داری اور پاس خاطر کے لئے بھی اَلْمِلْحُ کا لفظ بولتے تھے ، اور حسن لطیف کے لئے بھی* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سفید ہونے کے ہیں اور نمک کو مِلْحٌ اس کے سفید ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں ۔

قرآن کریم میں کڑوے ، سخت نمکین پانی کے لئے مِلْحٌ کا لفظ آیا ہے۔ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ (۲۵/۵۳) ۔ وہ بہت سخت کھاری ہے ۔

م ل ق

مَلَقَ ۔ يَمْلِقُ ۔ مٹا دیا ۔ نرم کیا ۔ اَلْمَالَقُ ۔ اس لکڑی کے تختے کو کہتے ہیں جس سے ہل چلائی ہوئی زمین کو ہموار کیا جاتا ہے ۔ مَلَّقَ الْاَرْضَ تَمْلِيْقًا ۔ لکڑی کے تختے سے زمین کو ہموار کرنا ۔ اسی سے ، کسی شخص کو ہموار (یا خوش) کرنے کے لئے جو چاپلوسی کی جاتی ہے اسے بھی تَمَلُّقٌ و مَلَقٌ کہتے ہیں ۔ اِنْمَلَقَ کے معنے ہیں چکنا اور ہموار ہونا ۔ اَلْمَلَقَةُ ۔ چکنے پتھر کو کہتے ہیں**۔ اَلْمَلِقُ ۔ ضعیف اور کمزور کو کہتے ہیں جسے حوادث زمانہ نے رگید کر نرم و خوار کردیا ہو ۔ اور اَلْمُمْلِقُ اس شخص کو جس کے پاس کچھ نہ ہو ۔ اَمْلَقَ مَا مَعَهُ ۔ جو کچھ اس کے پاس تھا اسے خرچ کر دیا اور اس میں سے کچھ بھی نہ روکا ۔ اسی سے رَجُلٌ اَمْلَقُ مِنَ الْمَالِ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے پاس کچھ مال و دولت نہ رہے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے کسی چیز سے عاری ہونے اور کسی چیز کے نرم ہونے کے ہیں۔ اِمْلَاقٌ ۔ مفلسی۔

*تاج ۔ **تاج و محیط ۔

قرآن کریم میں ہے کہ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ (6/152)۔ اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے۔ یعنی اس خدشہ سے کہ تم اس سے مفلس ہو جاؤ گے (17/31) مار نہ ڈالو یا علم و تربیت سے محروم نہ رکھو۔ یاد رکھو! قرآنی نظام میں یہ ذمہ داری نظام کی ہوگی کہ تمہارے رزق کا بھی کفیل ہو اور تمہاری اولاد کے رزق کا بھی۔ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (6/152)۔ ''ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں (تمہاری اولاد کو) بھی''۔ خدا کی اس قسم کی ذمہ داریاں، اس نظام کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں جو اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہو۔

م ل ک

مُلْكٌ۔ قوت رکھنا۔ کسی چیز پر قادر اور مستولی ہو جانا *۔ اختیار و ارادہ۔ اتھارٹی۔ (Authority)۔ بنیاد محکم۔ وہ سہارا جس پر کوئی چیز قائم ہو **۔ اسی لئے پانی اور غذا نیز دیگر اسباب و ذرائع کو بھی مِلْكٌ کہا جاتا ہے۔ عرب، لِيْ فِي الْوَادِيْ مِلْكٌ کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس وادی میں چراگاہ، پانی، مویشی، سب موجود ہیں۔ چونکہ صحرا میں زندگی کا سب سے بڑا سہارا پانی ہوتا ہے اس لئے پانی کو مِلْكٌ کہتے ہیں۔ لَيْسَ لَهُمْ مِلْكٌ کے معنی ہیں ان کے پاس پانی نہیں۔ ان کے ہاں محاورہ ہے اَلْمَاءُ مَلَكَ اَمْرَهُ۔ پانی ہر معاملہ کو درست کر دیتا ہے۔ یعنی جس کے پاس پانی ہو وہ اپنے معاملات میں آزاد ہوتا ہے اور اس کے سب کام ٹھیک ہو جاتے ہیں***۔

جس ذریعے (یا چیز) سے کوئی معاملہ درست ہو جائے اور کمال کو پہنچ جائے۔ اسے مِلَاكُ الْاَمْرِ کہتے ہیں۔ اسی لئے مِلَاكٌ گارے کو بھی کہتے ہیں***۔ (کیونکہ اس سے پتھروں کو جوڑتے اور درست کرتے ہیں تاکہ حوض یا تالاب کا پانی ضائع نہ ہونے پائے)۔

مَلَكَ الْعَجِيْنَ يَمْلِكُهُ۔ آٹے کو اچھی طرح گوندھنے کو کہتے ہیں جس سے اس کے سب اجزا یکساں ہو جائیں***۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ (م۔ ل۔ ک) کا خاصہ قوت اور شدت ہے****۔

مَلْكُ الطَّرِيْقِ (میم کی تینوں حرکات کے ساتھ)۔ راستہ کی حد، نیز راستے کے درمیانی یا بڑے اور واضح حصے کو کہتے ہیں***۔ مَلَكُوْتٌ۔

*محیط۔ **لین۔ ***تاج و ابن فارس۔ ****العلم الخفاق۔

عزت و اقتدار ۔ حکومت و سلطنت ۔ نیز ملکِ عظیم کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔ لیکن یہ اللہ تعالی کی مملکت کے لئے مخصوص ہے * ۔ اس لئے کہ کائنات میں تمام اختیار و اقتدار اُسی کا ہے ۔ وہی اسکی بنیاد اور سہارا ، اور اسکی تمام کار فرمائیوں کا مالک ہے ۔

مَالِکٌ کے معنی ہیں صاحب اختیار واقتدار ۔ سورہ نحل میں لَا یَمْلِکُ کی تفسیر لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ (۱۶/۷۳) نے کر دی ہے ۔ اسی طرح مَمْلُوْکٌ کی تشریح لَا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ (۱۶/۷۵) نے کر دی ۔ یعنی جسے کسی چیز پر کوئی اختیار نہ ہو ۔ اور سورہ یٰس میں فَھُمْ لَھَا مَالِکُوْنَ کے بعد وَذَلَّلْنٰھَا (۳۶/۷۲) نے واضح کر دیا کہ مَالِکٌ وہ ہے جس کے تابع دوسرا ہو جائے ۔ سورہ بقرہ میں (حضرت طالوت کے تذکرہ کے ضمن میں) جہاں بنی اسرائیل نے کہا ہے کہ وَابْعَثْ لَنَا مَلِکًا ۔ (۲/۲۴۶) ۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا کوئی کمانڈر مقرر کر دیجئے (نُقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ) تاکہ ہم اس کی زیر کمان خدا کی راہ میں جنگ کریں ۔ کمانڈر، صاحبِ اقتدار ہی کو کہتے ہیں ۔ اس سے متصل آیت (۲/۲۴۷) میں بھی مُلْکٌ کے معنی اقتدار و اختیار (Authority) کے ہیں ۔ اسی طرح مَا اَخْلَفْنَا مَوْعِدَکَ بِمَلْکِنَا (۲۰/۸۷) کے معنی ہیں " ہم نے جو وعدہ تیرے ساتھ کیا تھا اسکی خلاف ورزی اپنے اختیار و ارادے سے نہیں کی " * ۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ خدا کے مَالِکٌ ہونے میں جہاں اس کے کامل اختیار و اقتدار کا تصور ہے اسکے ساتھ ہی یہ تصور بھی ہے کہ اسکی یہ مالکیت استبداد کے لئے نہیں بلکہ کائنات کی اصلاح اور درستگی کے لئے ہے تاکہ اس کا نظم و نسق ٹھیک ٹھیک قاعدے اور قانون کے مطابق چلتا رہے اور ہر شے کو اسکی زندگی کی بنیادی ضروریات بہم پہنچتی رہیں ۔

قرآن کریم میں ایک اصطلاح آتی ہے ۔ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ۔ اس کے لفظی معنی ہیں " جن کے مالک تمہارے دائیں ہاتھ ہوئے " ۔ یہ اصطلاح متعدد معانی میں استعمال ہوئی ہے ۔ مثلاً —

(۱) ان لوگوں کے لئے جو کسی کی ماتحتی میں کام کر رہے ہوں ۔ (Subordinates) ۔ جو کسی کی اسکیم کو بروئے کار لانے کے لئے اُس کی ہدایات کے مطابق کام کریں ۔ گھر کے ملازم وغیرہ بھی اسی ضمن میں آجاتے ہیں ۔ (دیکھئے (۴/۳۶ ; ۱۶/۷۱ ; ۲۳/۶ ; ۲۴/۵۸ ; ۳۰/۲۸) ۔

*تاج ۔

(۲) اُن عورتوں کے لئے جو نکاح میں آچکی ہوں (۳۳/۵۲)۔ اسی طرح سورہ نساء میں جہاں محرمات کی فہرست کے بعد کہا ہے کہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ (۴/۲۴)۔ تو اس میں اگر مُحْصَنٰتٌ کے معنی ''پاک دامن عورتیں'' لئے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم پر تمام پاک دامن عورتیں حرام ہیں بجز ان کے جو تمہارے نکاح میں آجائیں۔ اور اگر ''مُحْصَنٰتٌ'' کے معنی شوہر دار عورتیں ہوں (دیکھئے عنوان ح۔ص۔ن) تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم پر تمام شوہردار عورتیں حرام ہیں بجز ان لونڈیوں کے جو اس سے پہلے تمہارے ہاں آچکی ہوں اگرچہ ان کے پہلے شوہر کہیں موجود ہوں۔ (دیکھئے شق نمبر ۳)۔

لیکن سورہ ممتحنہ میں ہے کہ اگر کفار مکہ کی مومن عورتیں تمہاری طرف آجائیں تو انہیں ان کافروں کی طرف نہ لوٹاؤ۔ صرف ان کا خرچ کیا ہوا مال انہیں دیدو اور ان سے نکاح کر لو۔ (۶۰/۱۰) یہ وہ ''شوہر دار عورتیں'' ہیں جن سے (اُن کے شوہروں کے ہوتے ہوئے) نکاح کی اجازت دی گئی تھی۔ اس اعتبار سے (۴/۲۴) میں اِلَّا مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ سے مراد یہ عورتیں بھی ہو سکتی ہیں جن سے اسطرح نکاح کیا گیا تھا۔

(۳) مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ۔ لونڈیوں کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے (مثلاً ۲۳/۶ ؛ ۷۰/۳۰ ، ۳۳/۵۰)۔ لونڈیوں کے ضمن میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں کے معاشرہ میں غلام اور لونڈیوں کا رواج عام تھا۔ جب یہ لوگ مسلمان ہوئے تو وہ لونڈیاں جو ان کے معاشرہ کے رواج کے مطابق ان کے گھروں میں موجود تھیں اسی طرح ان کے گھروں میں رہیں۔ اگر ان لونڈیوں کو گھروں سے نکال دیا جاتا تو اس سے معاشرہ میں بڑی خرابیاں پیدا ہوجاتیں۔ اس لئے انہیں علی حالہ رہنے دیا گیا۔ قرآن کریم نے ان لونڈیوں کے لئے بھی مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

یہ غلام اور لونڈیاں جنگ کے قیدی ہوتے تھے۔ سورہ محمد میں جنگ کے قیدیوں کے متعلق واضح حکم آگیا کہ انہیں احساناً یا فدیہ لیکر رہا کرنا ہوگا (۴۷/۴)۔ اس حکم کے بعد جنگ کے قیدیوں کو غلام بنانے کا رواج ختم ہو گیا اور اس طرح اسلام نے غلامی کے دروازے کو یکسر مسدود کر دیا۔ کسی انسان کو خرید کر غلام بنا لینے کا تصور ہی اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے جو شرف و تکریم آدمیت کا علمبردار (۱۷/۷۰) ہے اور جو کسی انسان کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ دوسرے انسان پر اپنا حکم چلائے (۳/۷۸)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں جہاں مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کے الفاظ لونڈیوں کے لئے آئے ہیں وہ انہی لونڈیوں کے لئے ہیں جو نزول قرآن کے وقت عربوں کے معاشرہ میں موجود تھیں - ان لونڈیوں کو آہستہ آہستہ آزاد معاشرہ کا جزو بنا لیا گیا ، اور نئی لونڈیاں بنانے کا سلسلہ از روئے قرآن ختم ہو گیا - لہذا اب مسلمانوں کے ہاں لونڈیوں کا سوال ہی باقی نہیں رہا - اب جو لوگ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ سے لونڈیوں کے جواز کی سند لاتے ہیں وہ قرآن کریم پر ظلم کرتے ہیں - اب قرآن کریم میں مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ سے متعلق ہدایات کا فائدہ یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی قوم حلقہ اسلام میں داخل ہو جس کے ہاں لونڈیاں موجود ہوں تو قرآن کریم کی یہ ہدایات ان کے لئے خضر راہ بنینگی -

(مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کے ضمن میں ی - م - ن - کا عنوان بھی دیکھئے)

[مَلٰٓئِكَةٌ کے لئے دیکھئے عنوان ا - ل - ک]

م ل ل

اَمْلَلْتُ الْكِتَابَ عَلَى الْكَاتِبِ - میں نے کاتب کو کتاب املاء کرائی - لکھائی* - اس معنی میں یہ مادہ قرآن کریم میں (۲/۲۸۲) میں آیا ہے - راغب نے کہا ہے کہ مِلَّةٌ کی اصل اسی سے ہے** - اس صورت میں مِلَّةٌ کے معنی ہونگے لکھا ہوا قانون -

طَرِيقٌ مَلِيلٌ - اس واضح راستے کو کہتے ہیں جس پر بکثرت آمد و رفت ہوتی ہو - اس اعتبار سے مِلَّةٌ کے معنی طریقہ اور راستہ کے ہونگے - ان معانی کو ابو اسحٰق نے لکھا ہے - اور اساس میں بھی اس کی تائید آئی ہے - یہیں سے مَلَّةٌ کا لفظ نکالا گیا ہے جس کے معنی ایسی جگہ کے ہیں جہاں روٹی پکائی جاتی ہے کیونکہ اس جگہ پر آمد و رفت کی کثرت سے راستہ کے نشان پڑ جاتے ہیں - نیز اَلْمَلَّةُ - گرم ریت کو بھی کہتے ہیں جس میں روٹی پکائی جاتی ہے*** - مناوی نے لکھا ہے کہ مَلَالٌ اس تکان اور دل برداشتگی کو کہتے ہیں جو کسی کام کو مسلسل کرنے سے پیدا ہو جائے*** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اکتا جانے اور تھک جانے کے ہیں -

قرآن کریم میں مِلَّةٌ کا لفظ مشرب و مسلک اور دینی طریقہ کے لئے آیا ہے - حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (۲/۱۲۰) - تا آنکہ تو ان کے طریقے (یا دین) کی پیروی کرنے لگے - اسلام کو مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ (۲/۱۳۵) کہا گیا ہے - یعنی وہ طریقہ جسے وحی خداوندی کی رو سے حضرت ابراہیم ؑ نے اختیار کیا تھا -

*محیط - **راغب - ***تاج -

م ل و (ی)

اِمْلَاءٌ کے معنی بڑھانے (ڈھیلا چھوڑنے اور مہلت دینے) کے آتے ہیں۔ اس لئے مدت طویلہ کو مَلَاوَۃٌ مِنَ الدَّھْرِ وَ مَلِیٌّ مِنَ الدَّھْرِ کہتے ہیں*۔ اَلْمَلِیُّ۔ زمانہ کی طویل مدت**۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی بھی لکھے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے وَاھْجُرْنِیْ مَلِیًّا ($\frac{۴۶}{۱۹}$)۔ تو ایک طویل مدت تک مجھ سے الگ ہو جا۔ اَمْلَیْتُ الْبَعِیْرَ۔ میں نے اونٹ کی پیکڑی میں (جس سے وہ بندھا تھا) کشادگی پیدا کر دی۔ یعنی اسے ڈھیلا کر دیا**۔ اس سے یہ لفظ مہلت دینے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ وسعت کے معنوں میں سورۃ محمد میں شیطان کے متعلق ہے وَ اَمْلٰی لَھُمْ ($\frac{۲۵}{۴۷}$)۔ وہ ان سے لمبے لمبے وعدے کرتا رہتا ہے۔ بڑی اور لمبی چوڑی امیدیں بندھاتا رہتا ہے۔ مہلت کے معنوں میں سورۃ اعراف میں ہے۔ وَ اُمْلِیْ لَھُمْ ($\frac{۷}{۱۸۳}$) میں انہیں مہلت دیتا ہوں۔

اَمْلَیْتُ الْکِتَابَ۔ میں نے کتاب کو لکھوایا۔ املاء کروایا۔ یہ اصل میں اَمْلَلْتُ ہے*۔ سورۃ بقرۃ میں ہے فَلْیُمْلِلْ ($\frac{۲}{۲۸۲}$)۔ چاہئے کہ وہ لکھوائے۔ سورۃ فرقان میں ہے فَھِیَ تُمْلٰی عَلَیْہِ ($\frac{۲۵}{۵}$)۔ (اس کے لئے م۔ ل۔ ل کا عنوان بھی دیکھئے)۔

مِمَّا

دیکھئے عنوان مِنْ اور عنوان مَا۔ (مِنْ + مَا = مِمَّا) کبھی اس کے آخر کا الف حذف ہو جاتا ہے اور یہ مِمَّ رہ جاتا ہے۔

مَنْ

مَنْ۔ جو۔ جس۔ جو کوئی۔ وَ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ($\frac{۲۶}{۳۰}$)۔ جو کوئی (یا جو کچھ) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہے وہ اللہ کے لئے ہے۔

(۲) استفہامیہ معنوں میں۔ یعنی کون، کس۔ جیسے مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ($\frac{۳۶}{۵۲}$)۔ ہمیں کس نے ہماری خوابگاہ سے اٹھا دیا؟

---

*راغب۔ **تاج۔

مِنْ

مِنْ ۔ حسب ذیل معانی کے لئے آتا ہے :—

(۱) ''سے'' کے معنوں میں ۔ مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۱/۱۷) ۔ مسجد حرام سے (یعنی وہ آغاز سفر کا مقام تھا) ۔
اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمَانَ (۳۰/۲۷) ۔ وہ سلیمان کی طرف سے ہے ۔

(۲) کل میں سے بعض (اسے تبعیض کہتے ہیں) ۔ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ (۲۵۳/۲) ۔ ان میں سے (بعض) وہ بھی ہیں جن سے خدا ہم کلام ہوا ۔

(۳) پوری جنس کے لئے (اسے تبیین کہتے ہیں) ۔ مثلاً ۔ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ (۲/۳۵) ۔ اللہ جو رحمت بھی انسانوں کے لئے کھولتا (بھیجتا) ہے ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ رحمت میں سے کوئی ایک حصہ بھیجتا ہے ۔ رحمت جو بھی ہوگی اسے رحمت ہی کہا جائے گا ۔ رحمت کا حصہ نہیں کہا جائے گا ۔ اسی طرح سورۃ اعراف میں ہے ۔ مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ (۱۳۲/۷) جو نشانی بھی تو ہمارے پاس لائے ۔ . . . . . یعنی ہم تمام نشانیوں سے ایسا ہی برتاؤ کرینگے ۔ لہذا تبیین میں کل کا مفہوم ہوتا ہے ۔ یعنی اس قسم کی پوری کی پوری چیز ۔ (مِنْ کے استعمال میں تبعیض اور تبیین کے فرق کا ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے) ۔

(۴) ''کی وجہ سے'' کے مفہوم کے لئے ۔ مِمَّا خَطِيْٓـئٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا (۲۵/۷۱) ۔ وہ اپنی خطا کاریوں کی وجہ سے غرق کئے گئے ۔ یعنی ان کے غرق ہونے کی وجہ ان کی خطا کاریاں تھیں ۔

(۵) ایک دوسرے سے تمیز کرنے کے لئے ۔ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (۲۲۰/۲) ۔ اللہ جانتا ہے کہ کون مفسد ہے اور کون مصلح ۔ یعنی وہ مفسدین اور مصلحین کو الگ الگ پہچانتا ہے ۔

(۶) ایک کے بدلے میں دوسرا ۔ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ (۳۸/۹) ۔ کیا تم مستقبل کے بدلے میں (یا اس کے مقابلہ میں) قریبی مفاد پر رضا مند ہوگئے؟ نیز (۶۰/۴۳) ۔

(۷) نفی (نہیں) کی تاکید کے لئے ۔ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ (۶۲/۳) ۔ اللہ کے سوا کوئی بھی الٰہ نہیں ۔

(۸) ب (کے ساتھ) کے معنوں میں ۔ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ (۴۲/۴۵) ۔ وہ دزدیدہ نگاہ سے (یا خفی نگاہ سے یا گوشۂ چشم سے) دیکھتے ہونگے ۔ (نیز ۹۹/۴) ۔

(۹) عَلٰى (پر) کے معنوں میں ۔ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ . . . . . . (۲۱/۷۷) ۔ اور ہم نے اسے اس قوم پر غالب کردیا ۔

(۱۰) فِیْ (میں) کے مفہوم میں ۔ اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ (۶۲/۹) ۔ جب جمعہ کے دن تمہیں صلٰوۃ کے لئے آواز دی جائے ۔

(۱۱) عَنْ (سے) کے مفہوم کے لئے ۔ قَدْ كُنَّا فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا (۲۱/۹۷) ۔ ہم اس کی طرف سے غفلت میں رہے ۔

(۱۲) عِنْدَ (کے نزدیک ۔ کے ہاں) کے معنوں میں ۔ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا (۳/۱۰) ۔ اللہ کے ہاں (یا اللہ کے مقابلہ میں) ان کے اموال و اولاد ان کے کسی کام نہ آسکینگے ۔

(۱۳) زائد بھی ہوتا ہے ۔ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ (۶/۵۹) ۔ کوئی پتا نہیں گرتا کہ . . . . . . (اسے تاکید کے لئے بھی کہہ سکتے ہیں) ۔

م ن ع

مَنْعٌ کے معنی ہیں کسی شخص اور اس چیز کے درمیان حائل ہو جانا جسے وہ حاصل کرنا چاہتا ہے ۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ یہ اِعْطَاءٌ کی ضد ہے ۔ یعنی نہ دینا ۔ راغب نے بھی اسکی تائید کی ہے ۔ اِمْتَنَعَ اِمْتِنَاعًا ۔ باز رہنا ۔ رک جانا ۔ مَانِعٌ ۔ مَنَّاعٌ ۔ مَنُوْعٌ ۔ روکنے والا * ۔ مَنَّاعٌ اور مَنُوْعٌ میں (بمقابلہ مَانِعٌ) مبالغہ پایا جاتا ہے ۔ یعنی بہت زیادہ روکنے والا ۔ روکنے کی جہت سے بخیل آدمی کو مَانِعٌ اور مَنَّاعٌ کہتے ہیں** ۔ المَنْعَةُ ۔ رکنا ۔ محفوظ ہو جانا ۔ مَنُعَ الرَّجُلُ ۔ آدمی محفوظ ہو گیا ۔ حِصْنٌ مَنِيْعٌ ۔ محفوظ اور مضبوط قلعہ ۔ اَلْمُمَانَعَةُ ۔ ایک دوسرے کو روکنے کے لئے جھگڑنا * ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ (۲/۱۱۴) ۔ " اس سے بڑھ کر زیادتی کرنے والا کون ہے جو (لوگوں کو) اس سے روکتا ہے کہ وہ مساجد میں اللہ کا نام لیں " ۔ اس میں مَنْعٌ کے معنی رکاوٹ ڈالنا ، حائل ہونا ہیں ۔ سورۂ نساء میں ہے

*ت ۔ **راغب ۔

وَنَمْنَعْكُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۴/۱۴۱) - اسکے معنی حفاظت یا مدافعت کرنے کے ھیں - " (کیا) ھم نے مومنوں سے تمہاری حفاظت نہیں کی ؟ "

سورۂ الماعون میں ھے - وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۱۰۷/۷) - جو چیزیں بہتے پانی کی طرح عام ھونی چاھئیں یہ ان کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتے ھیں اور انہیں روک کر اپنی ملکیت میں لے لیتے ھیں - سورہ معارج میں انسان کی عام نفسیاتی کیفیت کے متعلق ھے کہ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا (۷۰/۲۱) - جب اسکے پاس مال و دولت آتا ھے تو وہ اسے نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھنے کے بجائے اسے روک کر بیٹھ جاتا ھے - اس سے اگلی آیت میں ھے کہ اس ذھنیت کا علاج نظام صلٰوۃ کی رو سے ھو سکتا ھے - جیسا کہ (۲۴/۲۵) میں بھی کہا گیا ھے - اسی کو سورہ قٓ میں مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ (۵۰/۲۵) کہا گیا ھے - اسکے برعکس جنّتی معاشرہ کے متعلق ھے کہ اس میں سامان خور و نوش بڑی کثرت سے ھوگا (۳/۳۵ ; ۲۰/۱۱۸) - اور کوئی اسکے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالے گا - کوئی اسے روک کر نہیں رکھے گا - (۷/۱۰۷ ; ۱۰/۲۰) وہ سب کی پرورش کے لئے عام ھوگا (۴/۱۰) -

م ن ن

مَنٌّ - ھر اس احسان الٰہی کو کہتے ھیں جس کے حاصل کرنے میں کسی قسم کی محنت و مشقت نہ اٹھانی جائے - مَنَّ عَلَيْهِ - اس پر احسان کیا - یعنی بلا مزد و معاوضہ کچھ عطا کر دیا - اِمْتَنَّ عَلَيْهِ کے بھی یہی معنی ھیں - نیز مَنٌّ کے معنی احسان جتلانے کے بھی ھیں ، جو معیوب ھے - اَلْمَنُوْنُ - بہت احسان جتانے والا - نیز زمانہ اور موت کو بھی کہتے ھیں - اسی سے رَيْبُ الْمَنُوْنِ - حوادث روزگار کو کہتے ھیں - اَلْمَنَّانُ - بہت زیادہ انعامات عطا کرنے والا * -

قرآن کریم میں وحی کو بھی مَنٌّ سے تعبیر کیا گیا ھے کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے بلا کسب و ھنر محض وھبی طور پر عطا ھوتی ھے (۱۴/۱۱) - یہ مَنٌّ رسول پر ھے - اور رسول کا اس وحی کو لیکر انسانوں کے پاس آنا ، ان انسانوں پر خدا کا مَنٌّ ھے (۳/۱۶۴) - قوم بنی اسرائیل کا فرعون کے استبداد سے نجات پا لینا خدا کا مَنٌّ تھا (۲۸/۵) -

سورہ محمد میں جنگ کے قیدیوں کے متعلق ھے کہ انہیں مَنًّا چھوڑ دو ، یا فِدَاءً (۴۷/۴) - یعنی بطور احسان (بلا معاوضہ) یا فدیہ لیکر - سورہ

* تاج و محیط - اقرب الموارد

ص ؔ میں یہ لفظ اَمْسِکْ ؔ کے مقابل میں آیا ہے جسکے معنی روک رکھنے کے ھیں (۳۸/۳۹) ۔ اس سے ظاھر ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو بہرحال چھوڑنا ہوگا ۔ زرفدیہ لیکر ہو یا احساناً ۔ سورہ المدثر میں ہے وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (۷۴/۶) ۔ ''اس نیت سے احسان نہ کر کہ اسکے بدلے میں تجھے اس سے زیادہ واپس ملے گا'' ۔ یہاں سے مَنٌّ کے معنی واضح ھو جاتے ھیں ۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ مومن وہ ھیں جو ''اللہ کی راہ'' میں اسطرح صرف کرتے ھیں کہ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى (۲/۲۶۲) ۔ وہ نہ اس کے معاوضہ کا خیال کرتے ھیں اور نہ ھی احسان جتا کر وجہ اذیت بنتے ھیں ۔ مَنٌّ دراصل ایک بھاری وزن ہوتا ہے *۔ لہٰذا احسان جتانے کے معنی یہ ھیں کہ انسان کو (احسان کے) بھاری بوجھ کے نیچے دبا دیا جائے ۔

اس بوجھ کے اعتبار سے مَنٌّ کے معنی ھوتے ھیں تھکا دینا ۔ لاغر اور کمزور کر دینا ۔ مَنَّ النَّاقَةَ ۔ اونٹنی کو سفر کی تکلیف سے تھکا دیا اور لاغر اور کمزور کر دیا ۔ مَنَّ السَّيْرُ فُلَانًا ۔ اسے چلنے نے کمزور کر دیا ۔ ذَهَبَ بِمُنَّتِهٖ ۔ اسکی طاقت زائل کر دی ۔ اَلْمَنِيْنُ ۔ کمزور رسی یا کمزور آدمی ۔ ثَوْبٌ مَنِيْنٌ ۔ کمزور اور بوسیدہ کپڑا ۔ اَلْمَنِيْنَةُ ۔ مکڑی ۔ مَنَّ الشَّيْءُ ۔ چیز کم ہو گئی ۔ اسی اعتبار سے مَنُوْنٌ موت کو کہتے ھیں، نیز زمانہ کو ۔ مَنَّ الْحَبْلَ کے معنی ھیں رسی کو کاٹ دیا ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) کاٹنا اور (۲) احسان کرنا ، لکھے ھیں ۔ قرآن کریم میں ہے فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (۸۴/۲۵ ؛ ۹۵/۶ ؛ ۴۱/۸) ۔ ان کے لئے ایسا اجر ہے جس میں کمی نہیں ہوگی ۔ غیر منقطع ۔ مسلسل جاری رہنے والا ۔ (سلسلہ ارتقاء میں کوئی چیز آگے بڑھ کر پیچھے نہیں آسکتی ۔ یا وہ رک جائیگی اور یا آگے بڑھتی جائیگی) ۔ اس کے یہ معنی بھی ھو سکتے ھیں کہ یہ اجر انہیں بطور احسان نہیں ملے گا بطور استحقاق ملے گا ۔

رَيْبُ الْمَنُوْنِ (۵۲/۳۰) ۔ زمانے کی اضطرابی کیفیتیں ۔ گردش زمانہ ۔ مرور وقت ۔ حوادث روزگار ۔ واضح رہے کہ یہ لفظ متضاد معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ یعنی اَلْمُنَّةُ ۔ قوت کو بھی کہتے ھیں ۔ بالخصوص دل کی قوت کو ۔ اسلئے مَمْنُوْنٌ کے معنی کمزور اور قوی دونوں آتے ھیں * ۔ الرمانی نے اَلْمَمْنُوْنُ کے معنی موت لکھے ھیں*** ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے اسکے معنی اَلدَّهْرُ یعنی زمانہ کے دئے ھیں ۔

---

*تاج و محیط و اقرب الموارد ** تاج و راغب ۔ ***الالفاظ المترادفۃ ۔

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ ان پر مَنّ نازل ہوتا تھا۔ (۲/۵۷)۔ یہ شیر خشت یا ترنجبین کی قسم کی ایک میٹھی گوند تھی جو درختوں پر جم جاتی تھی *۔ (یہ اب بھی ہوتی ہے اور لذیذ ہوتی ہے۔) لیکن راغب نے اس معنے کے ساتھ دوسرا مفہوم یہ بھی بتایا ہے کہ مَنّ اور سَلْوٰی سے خدا کے انعامات کی طرف اشارہ ہے۔ مَنّ۔ احسان اور سَلْوٰی۔ تسلی کا سامان *۔

مَنٰوۃ

مَنٰوۃ۔ جاہلیت عرب میں قبیلہ ہذیل و خزاعہ کا بت تھا **۔ (۵۳/۲۰)۔ لات قبیلہ ثقیف کا اور عزّٰی قبیلہ غطفان کا۔ ان تینوں کا ذکر (۵۳/۱۹-۲۰) میں آیا ہے۔

م ن ی

مَنَاہُ یَمْنِیْہِ مَنْیًا۔ اس کا اندازہ کیا۔ اَلْمَانِیْ۔ اندازہ کرنیوالا۔ اَلْمَنٰی۔ اللہ کا اندازہ۔ اَلْمَنِیَّۃُ۔ موت کو کہتے ہیں کیونکہ اس کا اندازہ مقرر کردیا گیا ہے*۔ اَلْمُنٰی (واحد مُنْیَۃٌ) مقاصد۔ خواہشات۔ آرزوئیں۔ یعنی وہ کام جن کا پہلے سے اندازہ کر لیا جائے۔ تَمَنَّاہُ تَمَنِّیًا۔ اس کا ارادہ کیا۔ اس کی تمنا کی۔ اُمْنِیَّۃٌ (جمع اَمَانِیُّ)۔ خواہش۔ آرزو۔ ارادہ*۔ نیز اس کے معنی جھوٹ اور کذب کے بھی ہیں۔ تَمَنَّی الْحَدِیْثَ۔ بات گھڑلی۔ اَلْاَمَانِیُّ۔ وہ باتیں جن کی تمنا کی جائے اور اکاذیب۔ دونوں معنی ہیں*۔

اَلْمَنِیُّ۔ نطفہ (خواہش اور ارادہ کے اعتبار سے۔ یا اس اعتبار سے کہ اس سے انسان کی پیدائش کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ ابن فارس)۔

تَمَنَّی الْکِتَابَ۔ کتاب کو پڑھا۔ اُمْنِیَّۃٌ۔ کتاب کی تلاوت۔ جو کچھ پڑھا جائے***۔ اس معنی کے لئے تاج العروس نے خاص طور پر اشعار بطور سند نقل کئے ہیں۔ اور ابن فارس نے کہا ہے کہ پڑھنے سے کتاب کے مفہوم کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے وَ مِنْھُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتٰبَ اِلَّا اَمَانِیَّ (۲/۷۸)۔ "ان میں ان پڑھ لوگ بھی ہیں جو صرف کتاب کی تلاوت کر سکتے ہیں"۔ (اس کے مطالب کو سمجھ نہیں سکتے)۔ سورۃ حج میں ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِہٖ فَیَنْسَخُ اللّٰہُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ (۲۲/۵۲)۔ اور ہم نے تجھ سے

*تاج و راغب۔ **تاج و محیط۔ ***ابن قتیبہ (القرطین ج/۲ صفحہ ۳۱) نیز ابن فارس۔

پہلے جس رسول اور نبی کو بھیجا تو اس کے ساتھ یہی ہوا کہ (اس کے جانے کے بعد) شیطان (دین سے منحرف کرنے والے لوگ) اس کی کتاب میں (یعنی جس کی وہ تلاوت کرتا تھا**۔ اس وحی میں) اپنی طرف سے کچھ ملا دیتے۔ اس کے لئے اللہ پھر ایک رسول بھیجتا جو اس غیر خدائی تبدیلیوں اور اضافوں کو مٹاتا اور اس طرح وحی کو پھر اس کی منزہ شکل میں پیش کردیتا۔ اس آیت میں اللہ نے بتایا ہے کہ کس طرح مفاد پرست اور سرکش لوگ وحی میں رد و بدل کر دیتے تھے اور کس طرح دوسرا رسول آ کر ان تبدیلیوں کو مٹاتا تھا۔ یہ سلسلہ جاری رہا تاآنکہ قرآن کریم آیا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے لی۔ اب اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہوسکتا۔ یہ ہے اس آیت کا صحیح مفہوم۔ لیکن بہت سے مفسرین نے پہلے، اُمْنِيَّتِهٖ کے معنی ”آرزو“ کر کے خود ہی ایک مشکل پیدا کرلی اور پھر اس مشکل سے نکلنے کے لئے اس قسم کا قصہ وضع کیا جس کے تصور سے بھی روح کانپتی ہے۔ چونکہ اس قصہ سے حضور رسالتمآب ؐ کی شان اقدس پر طعن پڑتا ہے اس لئے ہم اسے یہاں دہرانا نہیں چاہتے۔

مَنِيٌّ۔ نطفہ۔ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى (۷۵/۳۷)۔ ”کیا وہ (انسان) منی کا ایک نطفہ نہیں تھا جو ڈالی جاتی ہے“۔

م و ت

مَوْتٌ*۔ در اصل حیات کی ضد ہے۔ مجازاً یہ سکون کے لئے بھی بولا جاتا ہے*۔ ہر وہ چیز جس میں جمود کی وجہ سے حرکت و ارتقاء رک جائے، مردہ ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں مَاتَتِ الرِّيْحُ۔ یعنی ہوا رک گئی اور ساکن ہو گئی۔ مَاتَتِ النَّارُ۔ آگ بجھ گئی۔ مَاتَتِ الْخَمْرُ۔ شراب کا جوش جاتا رہا۔ نیند پر بھی اسکا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ مَاتَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں وہ سو گیا*۔ دراصل حیات کے مقابلہ میں موت کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً (۱) قوتِ نامیہ (بڑھنے پھولنے کی قوت) کا زائل ہو جانا۔ جیسے وَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۳۰/۱۹)۔ اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے۔ (۲) محسوس کرنے کی قوت کا زائل ہو جانا۔ جیسے قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا (۱۹/۲۳)۔ مریم نے کہا کہ اے کاش میں اس سے پہلے ہی مرجاتی اور بھولی بسری ہو جاتی۔ اور اس درد و کرب کو محسوس نہ کرسکتی۔ (۳) عقل و شعور کا زوال۔ جیسے فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى (۲۷/۸۰)۔ تو مردوں کو نہیں سنا سکتا۔ یعنی ان لوگوں کو جو عقل و شعور

*تاج و محیط نیز راغب۔ **ابن قتیبہ القرطین ج ۲/ ص ۴۱

سے کام نہیں لیتے - (۴) حزن اور خوف جو زندگی کو مکدر کردے - یعنی ہر مشقت حالات ، افلاس ، ذلت ، محکومی کی زندگی وغیرہ جیسے - وَ یَاْتِیْہِ الْمَوْتُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ وَمَا ھُوَ بِمَیِّتٍ (۱۴/۱۷) - یعنی چاروں طرف سے ذلت و افلاس اور تباھیاں اور بربادیاں امنڈ امنڈ کر آرھی ہونگی لیکن موت نہیں آئے گی - اس لئے کہ بھیک کے ٹکڑوں سے اتنا کچھ مل جائے گا جس سے طبیعی زندگی باقی رہے* - (یہ جہنم کی زندگی کا نقشہ ھے) - مَوْتٌ - غشی اور جنون کو بھی کہتے ھیں - اَلْمَیْتَۃُ - وہ جانور جو بلا ذبح کئے مر جائے* - اَلْمَوْتَۃُ - جنون کے مشابہ ایک کیفیت ہوتی ھے جو بعض آدمیوں کی ہو جاتی ھے - (ابن فارس) -

قرآن کریم میں موت کا لفظ حیات (زندگی) کے مقابلہ میں آیا ھے (۲/۲۸) - جس طرح حیات صرف سانس لینے کا نام نہیں بلکہ اس کے گونا گوں پہلو ھیں اسی طرح موت بھی صرف سانس بند ہو جانے کا نام نہیں - اس کے بھی مختلف پہلو ھیں - اور بدترین موت ھے قوموں کی اجتماعی زندگی کی موت جس میں وہ نہ زندہ ہوتی ھیں اور نہ مرتی ھی ھیں - یہ زندگی جہنم کی زندگی ھے - ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی (۸۷/۱۳) - قرآن کریم کا پیغام حیات آور انہی اقوام کے لئے ھے جن میں زندگی کی صلاحیت باقی ہو - لِیُنْذِرَ مَنْ کَانَ حَیًّا (۳۶/۷۰) -

قرآن کریم میں جہاں یہ لفظ آئے ، اس کے سیاق و سباق سے یہ متعین کرنا ہوگا کہ وہاں اس کے کون سے معانی مراد ھیں - ہر مقام پر موت کے معنی طبیعی موت (Physical Death) نہیں ہونگے -

(نیز دیکھئے عنوان ح - ی - ی) -

م و ج

اَلْمَوْجُ - لہر - مَاجَ الْمَوْجُ - لہر بلند ہوئی - اَلْمَوْجُ - سمندر کی موجوں کا اضطراب - مَاجَ یَمُوْجُ - اضطراب اور تحیر کو کہتے ھیں** - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی اضطراب کے ھیں - مَوْجَۃُ الشَّبَابِ - جوانی کی لہر کو کہتے ھیں - عنفوان شباب** -

قرآن کریم میں مَوْجٌ کا لفظ دریا یا سمندر کی لہروں کے لئے آیا ھے - (۲۴/۱) -

*تاج و محیط نیز راغب - ** تاج -

م و ر

مَارَ الشَّیْئُ یَمُوْرُ۔ کسی چیز کا بار بار آنا۔ متردد ہونا۔ اَلْمَوْرُ۔ گھومنا۔ موج و اضطراب۔ زمین پر تیزی سے بہنا اور بہ سرعت متحرک ہونا۔ مَارَ مَوْرًا۔ وہ آنے جانے لگا۔ اَلْمَوْرُ۔ روندا ہؤا ، ہموار راستہ۔ تیز رفتاری۔ سرعت۔ نیز نرم روی۔ اَلْمُوْرُ۔ مٹی جسے ہوا اڑائے*۔

قرآن کریم میں ہے یَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَاءُ مَوْرًا (۵۲/۹)۔ جس (انقلاب کی گھڑی میں) بلندیوں والے اپنے مقام سے ہل کر سخت مضطرب اور اور متردد ہوجائیں گے۔ (یہ مفہوم سماء کے مجازی معنی کی رو سے لیا گیا ہے)۔

موسیٰ علیہ اسلام

اَلْمُوْسٰی۔ اُسترا۔ مَاسَ رَأْسَہٗ۔ اس نے اس کے سر کو استرے سے مونڈ دیا**۔

مُوْسٰی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ یہ عبرانی لفظ مُوْشَی کا معرب ہے جسکے معنی کھینچکر نکالا ہوا ہوتے ہیں**۔ چونکہ فرعون کے لوگوں نے حضرت موسیٰؑ کو دریا سے نکالا تھا اس لئے آپ کا یہ نام قرار پا گیا***۔

حضرت ابراہیمؑ کے پوتے، حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل تھا۔ آپ کی اولاد سے جو نسل آگے بڑھی اسے بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ آپ کے ایک بیٹے کا نام یہودہ (Juda) تھا۔ یہودہ اور بن یامین) کا قبیلہ ، فلسطین کے علاقہ (Judea)) میں آباد تھا۔ ان دونوں قبائل کے افراد کو اسی نسبت سے یہودی کہتے تھے اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل۔ لیکن بعد میں یہ تفریق باقی نہ رہی۔ اب بنی اسرائیل اور یہودی سے بالعموم ایک ہی مفہوم لیا جاتا ہے۔

حضرت یعقوبؑ کا وطن کنعان (فلسطین) تھا۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے (جو مشیت کی تدبیر کے ماتحت عجیب حالات میں مصر پہنچ گئے تھے۔ دیکھئے عنوان یوسفؑ) اپنے والدین اور دیگر اہل خاندان کو مصر بلا لیا تھا۔ اس طرح بنی اسرائیل مصر میں آباد ہوئے اور بڑھتے بڑھتے ایک کثیر التعداد قوم بن گئے۔

مصر میں فراعنہ کی حکومت تھی۔ "فرعون" کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں تھا بلکہ شاہان مصر کا لقب تھا۔ مصر کے لوگ دیوتاؤں کی پرستش

*تاج و راغب۔ **تاج۔ ***محیط۔

کرتے تھے "آمن رع" (سورج کا دیوتا) ان سب میں بڑا تھا۔ مصر کے بادشاہ دیوتاؤں کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا لقب فارا ع (یعنی سورج دیوتا کا اوتار) قرار پا گیا۔ قریب تین ہزار سال قبل مسیح سے لیکر اسکندر کے زمانہ (۳۳۲ - ق - م) تک فراعنہ کے قریب تیس خاندان مصر پر حکمران رہے۔ حضرت یوسف[ؑ] کے زمانہ میں ہیکسوس (Hyksos) کا خاندان برسر حکومت تھا جنہیں عمالقہ کہتے تھے۔

مصر میں بنی اسرائیل کی ابتداء تو ایک معزز گھرانے کی حیثیت سے ہوئی لیکن رفتہ رفتہ یہ قوم فرعون کے محکوم ہو گئے اور ان کے ساتھ وہی سلوک ہونے لگا جو دنیا کا ہر فرعون، محکوم قوم کے ساتھ کرتا ہے۔ جب ان پر ظلم و تشدد اپنی انتہا تک پہنچ گیا تو ان میں حضرت موسیٰ[ؑ] پیدا ہوئے جو خدا کے برگزیدہ رسول اور عظیم الشان داعی انقلاب تھے۔

آپ[ؑ] پیدا تو ہوئے محکوم بنی اسرائیل کے گھرانے میں لیکن مشیت ایزدی نے آپ کی تربیت کا انتظام فرعون کے محلات میں کر دیا تاکہ آپ[ؑ] اسرار و رموز مملکت و سیاست سے اچھی طرح باخبر ہو جائیں (۲۸/۷-۱۲)۔ یہاں سے آپ نکلے تو مدین کے علاقہ میں پہنچے (۲۸/۲۲)۔ جہاں آپ کی شادی ہوئی اور آپ نے آداب شبانی سیکھے۔

مدین سے واپسی پر، کوہ طور پر آپ نبوت سے سرفراز فرمائے گئے (۲۰/۱۲-۱۳) اور آپ کو حکم ہوا کہ آپ فرعون کیطرف جائیں اور بنی اسرائیل کو اسکے پنجۂ استبداد سے نجات دلائیں۔ آپ آئے اور اپنے بھائی ہارون[ؑ] کے ساتھ فرعون کے پاس پہنچے (۲۸/۳۲ ؛ ۲۰/۴۳-۴۴)۔ فرعون اور اسکے پیشوایانِ مذہب کے ساتھ آپ کے معرکے رہے اور بالآخر آپ، بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر فلسطین کیطرف آگئے (۲۰/۷۷) اور وہاں ان کی تعلیم و تربیت کی۔ اور خدا نے بنی اسرائیل کو اُس با برکت زمین کے مشارق و مغارب کا مالک بنا دیا (۷/۱۳۷)۔ تورات کے بیان کے مطابق حضرت موسےٰ[ؑ] نے موآب کی سرزمین میں ۱۲۰ سال کی عمر میں وفات پائی (دیکھئے استثناء ۳۴/۵)۔ حضرت ہارون[ؑ] کی وفات اس سے پہلے ہو چکی تھی۔ (قرآن کریم نے ان تفاصیل کا ذکر نہیں کیا)۔

تورات کے بیان کے مطابق حضرت یوشع بن نون آپ کے جانشین ہوئے۔ اس کے بعد، قوم بنی اسرائیل کا عروج، طبقاً عن طبقٍ بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ یہی وہ دور تھا جس میں یہ سطوت داؤدی[ؑ] اور شوکت سلیمانی[ؑ] کے وارث ہوئے۔ پھر انہوں نے حبل اللہ سے تمسک، یعنی قوانین خداوندی کا اتباع

چھوڑ دیا تو ذلت و مسکنت کی لعنت ان کے پیچھے لگ گئی - ان کی پہلی تباہی بخت نصر (بابلی) کے ہاتھوں ۵۹۹ ق - م میں ہوئی - اس نے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور یہودیوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا - قریب ایک سو سال کے اندر، فارس کے تین شہنشاہ، خورس (ذوالقرنین) دارا اور ارتخششتا ان کی امداد پر آمادہ ہوگئے اور اسطرح یہ پھر یروشلم میں آکر آباد ہوگئے - (سورہ بقرہ آیت ۲۵۹ میں تمثیلی انداز میں ان کی اس تباہی اور باز آفرینی کا ذکر کیا گیا ہے) - ۳۳۲ ق - م میں اسکندر (یونانی) نے یہودیوں کی مرکزیت پر پھر ایک کاری ضرب لگائی - پھر ۳۲۰ ق - م میں بطلیموس نے مصر کے راستے یروشلم پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کر لیا - انٹی گونس کے عہد میں یہ تمام علاقہ یونانیوں کے قبضہ میں آگیا اور یہودیوں پر سخت مظالم شروع ہوگئے - ۶۶ ق - م میں ان کی آخری تباہی کی تمہید شروع ہوگئی - پامپئی رومی بڑھا اور اس نے یروشلم پر قبضہ کر لیا - اس تاخت و تاراج میں قریب بارہ ہزار یہودی تباہ ہوگئے - پھر ۵۰ ق - م کے قریب ایک اور یورش میں قریب تیس ہزار یہودی غلام بنا لئے گئے - فطرت کی طرف سے انہیں باز آفرینی کا موقعہ دیا گیا جب ان میں حضرت عیسیٰؑ جیسے جلیل القدر رسول مبعوث ہوئے لیکن انہوں نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ دنیا پر روشن ہے - اس اتمام حجت کے بعد ان کی تباہی کا آخری وقت آگیا - چنانچہ رومیوں کے گورنر طیطوس (ٹائٹس) نے ۷۰ء میں ایسا وار کیا جس سے اس قوم پر اجتماعی ہلاکت کی مہرثبت ہوگئی -

سورہ بنی اسرائیل میں بخت نصر کے ہاتھوں پہلی بربادی اور اس آخری بربادی کے متعلق ذکر آیا ہے (دیکھئے ب ک ل م) -

حضرت موسیٰؑ خدا کے نبی تھے - انہیں اللہ نے کتاب دی تھی - وَاِذْ آتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ (۲/۵۳) حضرت ہارونؑ بھی نبی تھے - انہیں بھی کتاب ملی تھی - چنانچہ سورہ صٰفٰت میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں کے تذکرہ کے سلسلہ میں ہے وَآتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ (۳۷/۱۱۷) "اور ہم نے ان دونوں کو واضح کتاب عطا فرمائی" - قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ یا حضرت ہارونؑ کی کتاب کا نام مذکور نہیں - اَلتَّوْرَاةَ کا ذکر ہے (۵/۴۴) - لیکن تورات درحقیقت ان کتابوں کے مجموعہ کا نام ہے جو حضرت موسیٰؑ سے لیکر حضرت عیسیٰؑ سے پہلے مختلف انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہوتی رہیں - ان کے مجموعہ کو عہد نامہ عتیق (Old Testament) کہتے ہیں -

یہودیوں نے اس کتاب میں تحریف کر دی تھی۔ لفظی تحریف بھی (۴۶/۴) اور معنوی بھی (۵/۱۳)۔ نیز اس میں اپنی طرف سے اضافے بھی کردئیے تھے (۲/۷۹)۔ اور یوں تلبیس حق و باطل ہوگئی تھی (۳/۷۱)۔ اس لئے اس میں سخت اختلافات پیدا ہو گئے تھے (۱۱/۱۱۰)۔ ان کی تبئین و توضیح قرآن کریم نے آکر کی (۵/۱۵)۔ [نیز دیکھئے عنوان ''تَوْرَات'']

م و ل

اَلْمَالُ۔ ہر وہ چیز جس کے تم مالک ہو جاؤ۔ اس کی جمع اَمْوَالٌ آتی ہے۔ ابن الاثیر نے کہا ہے کہ دراصل مَالٌ اس سونے چاندی کو کہتے ہیں جس کا کوئی مالک بن جائے۔ اس کے بعد دوسری چیزوں کے ذخیرہ کو بھی مَالٌ کہنے لگ گئے۔ ویسے عربوں کے ہاں زیادہ تر اونٹوں کے گلے کو مَالٌ کہتے تھے کیونکہ ان کے مال زیادہ تر اونٹوں ہی کی شکل میں ہوتے تھے۔ رَجُلٌ مَیِّلٌ۔ بڑا مال دار آدمی۔ مُلْتُهُ۔ میں نے اسے مال دے دیا۔ تَمَوَّلْتُ اور اِسْتَمَلْتُ کے معنے ہیں، میں بہت مالدار ہوگیا۔ مَوَّلَهُ۔ اس نے اسے مال دار کر دیا*۔ عام ائمہ لغت کے نزدیک اَلْمَالُ کے مادہ کا درمیانی لفظ واو ہی ہے۔ لیکن راغب نے اسے اَلْمَیْلُ کے تحت لکھا ہے اور بتایا ہے کہ مال کو مال اس لئے کہتے ہیں کہ وہ کبھی ایک کی طرف مائل رہتا ہے اور کبھی دوسرے کی طرف**۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے اس لئے مال کہا گیا ہو کہ اس کی خاطر انسان کو کسی ایک طرف جھکنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر راغب کی تحقیق صحیح ہوتی تو مَالٌ کی جمع اَمْیَالٌ ہوتی نہ کہ اَمْوَالٌ۔

نظام خداوندی کے قیام کے لئے جد و جہد کرنے میں جماعت مومنین کو جن مشکلات سے دو چار ہونا پڑتا ہے ان میں نَقْصٍ مِنَ الْاَمْوَالِ (۲/۱۵۵) بھی ہے۔ یعنی مال و دولت میں کمی ہو جانا۔ لیکن اس کے بعد اس جماعت کو، ان کے مخالفین کے اَمْوَالٌ کا مالک بنا دیا جاتا ہے اور انہیں ہر طرح کی فراوانی حاصل ہو جاتی ہے (۳۳/۲۷)۔ لہذا مال کی فراوانی، نظام خداوندی کا لازمی نتیجہ اور خدا کی رحمت ہے۔ لیکن وہی مال جو نظام ربوبیت کی اجتماعی تحویل میں ہو (۹/۱۱۱)۔ اگر ہر فرد اپنا اپنا مال اپنے ہی مفاد کی خاطر جمع کرے تو اس مال سے وہ جہنم تیار ہوتی رہتی ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں (۱۰۴/۲-۷)۔ اسی کا نام سرمایہ داری ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن کریم آیا تھا۔ (۹/۳۴-۳۵)۔

---

*تاج و محیط۔ **راغب۔

م و ہ

مَاءٌ ۔ دراصل مَوَہٌ تھا ۔ واو کو الف سے بدل دیا اور ھاء کو ھمزہ سے ۔ اس طرح یہ لفظ مَاءٌ بن گیا ۔ اس کے معنی ھیں ۔ پانی ۔ اس کی جمع مِیَاہٌ آتی ھے ۔ مَاھَتِ السَّفِیْنَۃُ کے معنی ھیں کشتی میں پانی بھر گیا ۔ بَنُوْ مَاءِ السَّمَاءِ ۔ عربوں کو کہتے تھے کیونکہ وہ بارش کی تلاش میں رہتے اور جہاں بارش کا پانی ملتا وھیں پہنچ جاتے* ۔

قرآن کریم میں ھے کَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَاءِ (۱۱/۷) ۔ خدا کا عرش پانی پر تھا ۔ اس کے مفہوم کے لئے ع ۔ ر ۔ ش کا عنوان دیکھئے ۔

م ھ د

مَھْدٌ کے معنی ھیں جگہ کو ھموار اور نرم بنانا ۔ اَلْمَھْدُ ۔ نرم اور ھموار زمین ۔ اَلْمِھَادُ ۔ بستر کو کہتے ھیں کیونکہ وہ نرم اور ھموار ھوتا ھے** ۔ بچھی ھوئی اور ھموار ھونے کی جہت سے قرآن کریم میں زمین کو مِھَادًا کہا گیا ھے (۷۸/۶) ۔ یعنی وسیع بچھائی ھوئی اور ھموار ۔ چونکہ بچے کا بستر ھموار اور نرم ھوتا ھے اس لئے اسے اَلْمَھْدُ کہتے ھیں ۔ یعنی گہوارہ*** ۔

تَمْھِیْدُ الْاَمْرِ کے معنی ھیں کسی معاملہ کو ھموار کرنا اور درست کرنا ۔ تاج نے راغب کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ھے کہ مجازاً اس سے مراد مال و جاہ میں فراخی کرنے کے ھو جاتے ھیں** ۔ یعنی نرم اور پُرآسائش زندگی بنانا ۔ قرآن کریم میں ھے ۔ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِھِمْ یَمْھَدُوْنَ (۳۰/۴۴) ۔ جو صلاحیت بخش کام کرتے ھیں وہ اپنی ذات کے لئے آسائشیں بہم پہنچاتے ھیں اور اسکی اصلاح اور ھمواری کی کوشش کرتے ھیں ۔ سورۃ بقرہ میں جہنم کو بِئْسَ الْمِھَادُ (۲/۲۰۶) کہا ھے ۔ یہاں اس کے معنی رھنے یا ٹھہرنے کے مقام کے ھیں ۔

قرآن کریم میں اللہ کو مَاھِدٌ کہا گیا ھے ۔ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰھَا فَنِعْمَ الْمَاھِدُوْنَ (۵۱/۴۸) ۔ اور ھم نے زمین کو بچھایا اور ھم کیا اچھے آسائشیں بہم پہنچانے والے ، یا ٹھکانا مہیا کرنے والے ھیں ۔

سورۃ مریم میں ھے کہ حضرت مریمؑ اپنے بیٹے حضرت عیسیٰؑ کو ساتھ لے کر ھیکل کے پجاریوں کے پاس آئیں تو وہ (احبار و رھبان) ان کے پیچھے پڑ گئے (کہ انہوں نے ھیکل کی راھبہ کی زندگی چھوڑ کر آئین خانقاھیت کے خلاف

---

*تاج نیز ابن فارس ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

متاهل زندگی کیوں اختیار کرلی تھی) ۔ انہوں نے خود جواب دینے کی بجائے حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کردیا کہ تمہارے اعتراضات کا یہ جواب دیں گے ۔ اس پر ھیکل کے شیوخ نے نہایت طنز آمیز لہجے میں کہا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا (۱۹/۲۹) ۔ ''ہم اس سے کسطرح بات کریں جو ابھی کل کا بچہ ہے'' ۔ یہ ہمارے شایانِ شان نہیں کہ اس سے (جو ہماری سِن رسیدگی کے مقابلہ میں یوں ہے جیسے گود میں کھیل رہا ہو) جو کل ابھی ہمارے سامنے بچہ تھا ۔ جو ہمارے ہاتھوں کا کھلایا ہوا ہے ۔ اس سے ہم مناظرہ شروع کردیں ۔ اس سے ''فی المهد'' (جھولے میں) کے معنی واضح ہیں ۔ ہمارے ہاں بھی کہتے ہیں ''ابھی تو اس کے دودھ کے دانت ہیں'' ۔ یا ''جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش'' ۔ خود صَبِيًّا کے معنی بھی دودھ پیتا بچہ نہیں ۔ (دیکھئے عنوان ص ۔ ب ۔ و)

یہی ''تکلم فی المهد'' ہے (یعنی کم عمری میں لوگوں سے اہم حقائق پر گفتگو کرنا) جس کی طرف (۵/۱۱۰ و ۳/۴۵ میں) اشارہ کیا گیا ہے ۔

احبار و رهبان کے سوال کے جواب میں حضرت عیسیٰؑ نے جو کچھ کہا وہ خود اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ باتیں سچ مچ گھوارے میں لیٹے ہوئے نہیں کی گئی تھیں ۔ آپ نے فرمایا إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا .... (۱۹/۳۰) ۔ میں خدا کا بندہ ہوں ۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب حضرت عیسیٰؑ کو نبوت مل چکی تھی ۔

[مزید تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ''شعلہ مستور''] ۔

م ه ل

اَلْمَهْلُ ۔ اَلْمَهَلُ ۔ اَلْمُهْلَةُ ۔ سکون ۔ اطمینان ۔ نرمی ۔ اَمْهَلَهُ ۔ اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا ، اس پر سختی نہیں کی ۔ اسے مہلت دے دی ۔ ڈھیل دیدی ۔ تَمَهَّلَ فِي عَمَلِهِ ۔ اس نے اپنے کام میں جلدی نہ کی ، اطمینان اور سکون سے کام لیا ۔ اَلْمَهْلُ ۔ سکینت اور وقار ۔ نیز اچھے کام میں آگے بڑھنا ۔ اَلْمَاهِلُ ۔ تیز رو ۔ آگے بڑھنے والا* ۔ سورۃ طارق میں ہے فَمَهِّلِ الْكَافِرِينَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا (۸۶/۱۷) ۔ ان مخالفین سے نرمی کا برتاؤ کرو اور انہیں تھوڑی سی مہلت دے دو ۔ عمل اور اس کے نتیجہ کے ظہور میں ایک وقفہ ہوتا ہے ۔ اسی کو مہلت کہتے ہیں ۔ یہ خدا کے قانونِ تدریج و امہال کے مطابق طے پاتا ہے ۔

*تاج و راغب ۔

(غالباً) سکون و جمود کے لحاظ سے ، ہر دھات کو اَلْمُھْلُ کہتے ہیں - بعض نے کہا ہے کہ یہ پگھلے ہوئے پیتل ، تانبے یا لوہے کے لئے آتا ہے- دوسروں کے نزدیک یہ زیتون کے تیل اور اس کی تلچھٹ کے لئے آتا ہے - نیز یہ اس راکھ اور انگاروں کو بھی کہتے ہیں جو روٹی سے اس وقت جھڑتی ہے جب اسے بھوبھل سے نکالتے ہیں - قبیلہ عامر اس لفظ کو زہر کے لئے بولتا ہے* - بہر حال اس میں ہلاکت کا پہلو نمایاں ہے - سورۃ معارج میں ہے یَوْمَ تَکُوْنُ السَّمَآءُ کَالْمُھْلِ (۷۰/۸) - یہاں مُھْلٌ کے معنی پگھلی ہوئی دھات کے لئے جائیں تو زیادہ موزوں ہوگا - یعنی بڑے بڑے فلک نشین سرداروں کی قوتیں پگھل کر پانی ہو جائیں گی - سورۃ کہف میں ہے یُغَاثُوْا بِمَآءٍ کَالْمُھْلِ (۱۸/۲۹) - اہل جہنم کو جو پانی دیا جائے گا وہ مُھْلٌ کیطرح ہوگا - یہاں اس کے معنی زہر کئے جائیں تو بھی ٹھیک ہے اور اگر آتشین لاوا کئے جائیں تو بھی مناسب ہے - مطلب یہ ہے کہ مُمِدٌّ حیات چیزیں بھی ان کے حق میں ہلاکت آفریں ہونگی -

مَھْمَا

مَھْمَا - (کہتے ہیں کہ یہ مَا اور مَا کا مرکب ہے اور پہلے مَا کا الف ھاء سے بدل دیا گیا ہے) - ”جو کوئی (چیز) بھی“ - ”جو کچھ بھی“ - وَقَالُوْا مَھْمَا تَاْتِنَا بِہٖ مِنْ اٰیَۃٍ (۷/۱۳۲) - انہوں نے کہا کہ جو کوئی نشانی بھی تو لائے گا . . . . نیز اس کے معنی ”جب کبھی“ بھی ہوتے ہیں -

م ہ ن

مَاھَنَہٗ - اُس نے اسے اچھی طرح استعمال کیا - خوب رگڑا - اِمْتَھَنَہٗ - اس نے اس سے خدمت یعنی کام لیا اور اسطرح اسے کمزور کر دیا - اَلْمَھِیْنُ - اُس اونٹ کو کہتے ہیں جو کثرت محنت سے اسقدر کمزور ہو چکا ہو کہ اس سے اونٹنی کو حاملہ نہ کرایا جائے تا کہ کمزور بچے پیدا نہ ہوں - اَلْمَاھِنُ - غلام اور خدمتگار - اَلْمِھْنَۃُ - خدمت کرنے میں مہارت و ہوشیاری - اَلْمَھِیْنُ مِنَ الرِّجَالِ - حقیر آدمی - ذلیل آدمی - قلیل الرائے - قلیل التمیز* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بے وقعتی اور حقارت کے ہوتے ہیں -

قرآن کریم میں اس مادہ کے لئے جس سے انسان کی (رحم میں) تخلیق ہوتی ہے سُلٰلَۃٍ مِنْ مَّآءٍ مَّھِیْنٍ (۳۲/۸) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں -

---

*تاج و محیط -

یعنی کمزور اور حقیر پانی سے نکالے ہوئے جوہر کے ذریعے۔ تقابل کی غرض سے ایسا کہا گیا ہے۔ یعنی اس قسم کے حقیر سے قطرہ سے، اس قسم کا جیتا جاگتا، خوبصورت، ہونہار، سمیع و بصیر بچہ پیدا کر دینا، خدا کے قانونِ تخلیق کا کرشمہ ہے۔ کہاں وہ قطرۂ آب، کہاں یہ دُرِّ شاہوار!

م ی د

مَادَ قَوْمَهٗ۔ وہ اپنی قوم کے لئے سامان خوراک لایا۔ مَادَهُمْ يَمِيْدُهُمْ بمعنی مَارَهُمْ ہے۔ یعنی انہیں سامان خوراک دیا۔ اسی سے اَلْمُمْتَادُ۔ سامان خوراک لینے والے کو کہتے ہیں۔ مِدْتُهٗ۔ وَ اَمَدْتُهٗ۔ میں نے اسے عطا کیا۔ مَادَنِیْ فُلَانٌ۔ فلاں نے مجھ پر احسان کیا*۔ راغب نے اسکے معنے "اس نے مجھے کھلایا" بھی لکھے ہیں**۔ مَادَ کے معنی شدت سے ہلنا اور حرکت کرنا بھی ہیں، نیز جھکنا۔ مَادَتْ بِهِ الْاَرْضُ کے معنی ہیں زمین اسے لیکر گھومی۔ اَلْمَائِدَةُ۔ کھانا۔ خواہ اس کے ساتھ خوان ہو یا نہ ہو۔ بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ اَلْمَائِدَةُ اس خوان کو کہتے ہیں جس پر کھانا ہو۔ اگر اس پر کھانا نہ ہو تو اسے مائدۃ نہیں بلکہ خِوَانٌ کہیں گے۔ ابو عبید نے کہا ہے کہ اسے مَائِدَةٌ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ میزبان کی طرف سے عطا اور تفضل کے طور پر مہمان کو دیا جاتا ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں (۱) حرکت اور (۲) نفع پہنچانا ہیں۔

اَلْمَائِدَةُ کے ان معانی کو سامنے رکھنے سے قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ ($\frac{۵}{۱۱۲}$) "وہ ہم پر آسمان سے مائدہ نازل کرے"۔ ہر نبی کی طرح، حضرت عیسیٰؑ بھی اپنی جماعت سے کہ رہے تھے کہ اگر وہ وحی کا اتباع کرتے رہے تو خدا انہیں رزق کریم دیگا۔ دنیا کی سرفرازیاں عطا کریگا۔ لیکن وہ جماعت جس قسم کے نامساعد حالات کا شکار ہو رہی تھی ان کے پیش نظر، یہ بعید دکھائی دیتا تھا کہ انہیں اس کشائش سے سامان زیست مل سکیگا۔ چنانچہ اس احساس کے ماتحت انہوں نے کہا کہ کیا ایسے حالات میں بھی یہ ممکن ہے کہ ایسا نظام قائم ہو جائے جس میں سب کو سامان نشو و نما انسانوں کی طرف سے نہ ملے بلکہ نظام خداوندی کی طرف سے ملے تاکہ انہیں روٹی کے بدلے انسانوں کی

*تاج۔ **راغب۔

غلامی اختیار نہ کرنی پڑے۔ حضرت عیسیٰؑ نے کہا کہ تم مومن ہو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اِتَّقُوا اللّٰہَ (۵/۱۱۲)۔ تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ خدا نے کہا کہ وہ یقیناً ایسا انتظام کردیگا (یعنی تقویٰ کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا) لیکن فَمَنْ یَّکْفُرْ بَعْدُ مِنْکُمْ فَاِنِّیْ اُعَذِّبُہٗ عَذَابًا . . . . . . (۵/۱۱۵) جو ہمارے اسطرح کے دئے ہوئے رزق پر پردہ پوشی کرنے لگیگا اور اس نظام سے سرکشی برتیگا، تو اسے سخت عذاب دیا جائیگا۔ لہذا مَآئِدَۃٌ مِنَ السَّمَآءِ، نظامِ ربوبیت کا دوسرا نام ہے اور تقویٰ کا لازمی نتیجہ۔

ویسے ان آیات کے جو عام معنی لئے جاتے ہیں انہیں قرآن کریم کے کسی اردو ترجمہ سے دیکھ لیا جا سکتا ہے۔ ہم نے ان کا مفہوم بیان کیا ہے۔

سورہ نحل میں زمین کے متعلق ہے۔ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ (۱۶/۱۵)۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ تم اس پر اطمینان سے سکونت پذیر رہو اور یہ تمہیں لیکر گھومتی رہے*۔

کھلی اور فراخ جگہ کو اَلْمَیْدَانُ۔ اَلْمِیْدَانُ کہتے ہیں*۔ لہذا مَآئِدَۃٌ میں فراخی کا پہلو بھی ہے۔

م ی ر

اَلْمِیْرَۃُ۔ کھانے کی چیزیں جنہیں کوئی شخص لاد کر لائے۔ مَارَ عِیَالَہٗ یَمِیْرُ۔ مَیْرًا۔ وہ اپنے گھر والوں کے لئے کھانے پینے کی چیزیں لایا*۔ سورۃ یوسف میں ہے وَ نَمِیْرُ اَھْلَنَا (۱۲/۶۵)۔ ہم اپنے گھر والوں کے لئے غلہ (سامان خوراک) لائینگے۔

م ی ز

مَازَ یَمِیْزُ۔ کسی چیز کو الگ کرلینا۔ علیحدہ کرلینا۔ فَامْتَازَ۔ پس وہ چیز الگ ہوگئی*۔ راغب نے اس کے معنے ملتی جلتی چیزوں کو ایک دوسری سے الگ کرنے کے کئے ہیں**۔ قرآن کریم میں ہے حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ (۳/۱۷۸)۔ تاآنکہ (خدا) خبیث کو طیب سے الگ کردے۔ سورۃ یٰسٓ میں ہے۔ وَ امْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّھَا الْمُجْرِمُوْنَ (۳۶/۵۹)۔ اے مجرمو! تم اب الگ ہو جاؤ۔ تَمَیَّزَ۔ الگ الگ ہو جانا۔ تَمَیَّزَ الرَّجُلُ مِنَ الْغَیْظِ۔ وہ غصہ کی شدت سے پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوا*۔ تَکَادُ تَمَیَّزُ مِنَ الْغَیْظِ (۶۷/۸)۔ قریب ہے کہ وہ جوش میں پھٹ پڑے۔ اَلتَّمْیِیْزُ۔ ملتی جلتی چیزوں میں فصل کرنا**۔

---

*تاج و محیط۔ **راغب۔

مِیْکَالُ

سورۃ بقرہ میں جِبْرِیْلَ وَ مِیْکٰلَ آیا ہے (۲/۹۸)۔ اس فرشتہ (Michael) کو یہودی اپنا دوست سمجھتے تھے۔

م ی ل

مَالَ۔ وہ جھکا۔ مَالَ اِلَیْہِ۔ وہ اس کی طرف جھکا۔ اس کی طرف مائل ہوا۔ متوجہ ہوا۔ مَالَ عَلَیْہِ۔ وہ اس کے خلاف جُھکا۔ اس پر ظلم کیا۔ اُس پر حملہ آور ہوا (۴/۱۰۲)۔ مَالَ عَنِ الْحَقِّ۔ وہ انصاف کی راہ سے ہٹ گیا۔ اعراض برتا۔ اَمَالَہٗ۔ اسے جھکا لیا۔ مَالَتِ الشَّمْسُ۔ سورج مغرب کی طرف جھک گیا۔ زوال آفتاب سے مراد ہے۔ مَیَّلَ بَیْنَ الْاَمْرَیْنِ۔ اس نے دو معاملوں میں تردد کیا کہ اس کام کو کرے یا اس کام کو۔ یعنی اس کا دل کبھی اس کی طرف جُھکا اور کبھی اُس کی طرف*۔ مَیْلَۃً۔ ایک بار جھکنا (۴/۱۰۲)۔

اَلْمِیْلُ۔ میل۔ زمین کا ایک معین فاصلہ (مختلف مقامات پر اس فاصلہ کے تعین میں اختلاف ہے)۔ وہ مینار جو راستہ پر مسافروں کی راہ نمائی کے لئے بنا دیا جاتا ہے۔ نیز زمین کی طویل اور لامحدود مسافت کو بھی کہتے ہیں۔ اور سرمہ کی سلائی کو بھی*۔

راغب نے اَلْمَالُ کو بھی مَیْلٌ کے تحت ہی لکھا ہے اور بتایا ہے کہ مال کو اس لئے مَالٌ کہتے ہیں کہ وہ کبھی ایک کی طرف مائل رہتا ہے اور کبھی دوسرے کی طرف**۔ لیکن ہم نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ (دیکھئے عنوان م۔ و۔ ل)۔

---

*تاج۔ **راغب۔

ن

ن

دیکھئے عنوان ، (ن ۔ و ۔ ن)

ن أ ی

نَـاَیْتُهٗ وَ نَـاَیْتُ عَنْهُ ۔ میں اس سے دور ہوا ۔ نَـاٰیٰ بِـهٖ ۔ اسے ہٹایا ، دور کیا ، ایک طرف کیا* ۔ قرآن کریم میں ہے وَ هُمْ یَنْهَوْنَ عَنْهُ وَ یَنْئَوْنَ عَنْهُ (۶/۲۶) ۔ وہ (لوگوں کو اس قرآن کریم سے) روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور رہتے ہیں ۔ اَلْمُنْتَاٰیٰ ۔ مقام بعید کو کہتے ہیں ۔ اَلنُّؤٰیُ ۔ دراصل اس گڑھے یا نالے کو کہتے ہیں جو خیمہ کے ارد گرد اس غرض سے کھودا جاتا ہے کہ بارش کا پانی خیمہ کے اندر نہ آنے پائے ۔ اس سے دور دور رہے ۔ اسی سے اس کے معنی مفارقت کے بھی آتے ہیں* ۔ اور اعراض برتنے کے بھی** ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ اَعْرَضَ وَ نَـاٰ بِجَانِبِهٖ (۱۷/۸۳) ۔ اعراض برتا اور سرکشی کرتے ہوئے اپنے آپ کو دور لے گیا ۔ پہلو تہی کی ۔ نَـاٰیٰ فِی الْاَرْضِ ۔ وہ ملک میں دور چلا گیا* ۔

نـا (ضمیر)

نَا ۔ (۱) ضمیر مرفوع متصل ہے ۔ جیسے فَعَلْنَا ۔ ہم نے کیا ۔ یہ تثنیہ ۔ جمع ۔ مذکر ۔ مؤنث ۔ سب کے لئے آتی ہے ۔

(۲) ضمیر منصوب متصل ہے ۔ تثنیہ و جمع متکلم کے لئے آتی ہے ۔ اور مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتی ہے ۔ اَضَلَّانَا ۔ ان دو نے ہمیں گمراہ کیا ۔

(۳) نیز یہ ضمیر مجرور متصل بھی ہے ۔ رَبَّنَا ۔ اے ہمارے رب ۔ (تثنیہ و جمع ۔ مذکر و مؤنث ۔ متکلم کیلئے) ۔

---

*تاج ۔ **راغب نیز ابن فارس ۔

قرآن کریم میں ہے وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَا اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ....... (۲۹/۴۱) - ''اور جو کافر ہیں وہ کہینگے - ''اے ہمارے رب! ان کو، جنہوں نے جن و انس میں سے ہمیں گمراہ کیا تھا ہمیں دکھا'' - دوسری جگہ ہے كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ..... (۲۵/۱۴)- ''ہم نے ان سے کیا معاملہ کیا...'' -

ن ب أ (ن ب و)

نَبَأٌ کے معنی ہیں خبر دینا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے کے ہیں - خبر کو بھی النَّبَأُ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہے - راغب نے کہا ہے کہ نَبَأٌ - ہر خبر کو نہیں کہتے ، بلکہ اس خبر کو کہتے ہیں جسمیں بڑا فائدہ ہو، اور اس سے علم حاصل ہو جائے یا وہ کم از کم ظن غالب تک پہنچ جائے - یہ خبر جھوٹ سے خالی ہونی چاہئے - جیسے تواتر یا خدا یا رسول کی دی ہوئی خبر* - لیکن یہ کلیہ صحیح نہیں - قرآن کریم میں ہے اِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا... (۴۹/۶) - ''اگر کوئی فتنہ جو تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اسکی تحقیق کرلیا کرو'' - یہاں فاسق کی لائی ہوئی خبر کو بھی نَبَأٌ کہا گیا ہے - اَنْبَاَ اور نَبَّاَ کے معنی خبر دینے کے ہیں* - نَبِّئْ عِبَادِيْ (۱۵/۴۹)- میرے بندوں کو یقینی طور پر بتا دے - وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ (۲۶/۶۹)- انہیں (کتاب اللہ سے) ابراہیم کی خبر (سرگزشت ، یقینی واقعات) بتا دے -

نَبَاَ - نَبُوْءًا - کے معنی ہیں بلند ہونا - مرتفع ہونا - اَلنَّبْاَۃُ - اونچی زمین کو کہتے ہیں - اَلنَّبِيْئُ - مرتفع جگہ اور واضح راستے کو کہتے ہیں جو ابھر کر سامنے آجاتا ہے* -

یہاں تک بات ن - ب - أ (مادہ) کے متعلق تھی - لیکن عربی زبان میں ایک مادہ نبو (ن - ب - و) بھی ہے - نَبْوٌ - نَبْوَۃٌ کے معنی ہیں بلند ہونا - مرتفع ہونا** - اَلنَّبَاوَۃُ - اس زمین کو کہتے ہیں جو دوسری زمینوں سے اونچی ہو - اَلنَّبِيُّ - بلند جگہ کو کہتے ہیں - نیز بلند نشان راہ جس سے رہنمائی حاصل کی جائے* -

قرآن کریم میں اَلنَّبِيُّ کا لفظ رسول کے لئے آیا ہے - بعض کا خیال ہے کہ یہ نَبَأٌ سے مشتق ہے اور اسلئے اس کے معنی ہیں خبریں دینے والا - لیکن یہ تورات کا

*تاج و لطائف اللغۃ نیز اقرب الموارد - **تاج و ابن فارس -

دیا ہوا تصور ہے۔ یہودیوں میں نَبِیؐ ہیکل کے ایک خاص منصبدار کا لقب تھا۔ جو پیش گوئیاں کیا کرتا تھا۔ اسی لئے انگریزی میں نبی کو (Prophet) کہتے ہیں۔ یعنی پیش گوئیاں (Prophecies) کرنے والا۔ لیکن قرآن کریم نے نبوت کا جو تصور پیش کیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ نَبَاوَۃٌ سے مشتق ہے جس کے معنے ہیں بلند مقام۔ لہذا نبیؐ کے معنے ہیں مقام بلند پر کھڑا ہونے والا۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرمؐ سے کہا یا نَبِیُّ اللہ (ہمزہ سے، جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ لفظ نبأٌ سے مشتق ہے) تو حضورؐ نے فرمایا لَسْتُ بِنَبِیءِ اللہ وَ لٰکِنْ نَبِیُّ اللہ۔ اس سے واضح ہے کہ یہ لفظ نَبَاوَۃٌ سے مشتق ہے۔ نبی اس مقام بلند پر ہوتا ہے جہاں سے اسے عالمَ الغیب و الشھادۃ (دنیائے محسوس و غیر محسوس) دونوں کا مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے۔ وہ ایک طرف (وحی کے ذریعے) کائنات کے بنیادی حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے اور دوسری طرف ان حقائق کو دنیائے محسوسات تک پہنچاتا اور انہیں انسان کی تمدنی زندگی پر منطبق کرتا ہے۔ رسول اللہؐ نے جب اپنی نبوت کا اعلان قریش کے سامنے کیا تو اس سے اسی حقیقت کا اظہار مقصود تھا۔ آپ ایک پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے ہو گئے اور قوم سے کہا کہ یہ بتاؤ کہ اگر میں یہ کہوں کہ پہاڑ کی دوسری طرف ایک دشمن کا لشکر جرار تم پر حملہ آور ہونے کے لئے چلا آرہا ہے تو تم میری بات کا یقین کرو گے یا نہیں؟ انہوں نے کہا کہ ضرور کرینگے۔ (ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ ایسے مقام پر کھڑے ہیں جہاں سے آپ پہاڑ کی دوسری جانب بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اور ہم دامن کوہ سے اسکی دوسری سمت نہیں دیکھ سکتے)۔ اور دوسرے اس لئے کہ آپ نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ آپ نے فرمایا کہ پھر اسی طرح اس حقیقت کو بھی مان لو کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری موجودہ روش زندگی کے نتائج، ہلاکتوں اور بربادیوں کا ایک لشکر جرار اپنے ساتھ لئے تمہاری طرف بڑھے چلے آرہے ہیں۔ لہذا تم اس روش کو چھوڑ کر زندگی کی صحیح روش اختیار کرو۔

اس سے مقامِ نبوت کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ یعنی نبی، علم کے اس مقام بلند پر ہوتا ہے جہاں وہ (وحی کے ذریعے) حقائق کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ یہ مقام نبوت ہے۔ پھر وہ اس علم (وحی) کو لیکر انسانوں کی دنیا کی طرف آتا ہے تاکہ ان تک ان حقائق کو پہنچائے۔ اور عملاً متشکل کرکے دکھائے۔ یہ منصب رسالت ہے (یعنی وحی کا دوسروں تک پہنچانا)۔ نبوت، رسول اللہؐ پر ختم ہو گئی۔ اب کوئی انسان خدا کی طرف سے وحی نہیں پا سکتا۔ (اسلئے کہ جسقدر وحی کی ضرورت تھی وہ دیدی

گئی اور اسے قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دیا گیا)۔ باقی رہا فریضۂ رسالت۔ یعنی اس وحی کو عملاً متشکل کرنا اور دوسروں تک پہنچانا ۔ تو یہ فریضہ اس امت کے سپرد ہو گیا جسے کتاب اللہ کا وارث قرار دیا گیا ۔ (اسے تبلیغ اور اقامت دین کہا جائیگا ۔ '' رسالت '' کہنے سے غلط فہمی کا امکان ہوتا ہے)۔ یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا ۔ رسول میں نبوت اور رسالت ایک ہی ذات کے اندر مجتمع ہوتی ہے اس لئے قرآن کریم کی رو سے ہر نبی رسول ہوتا ہے اور ہر رسول نبی ۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا ۔ ختم نبوت کے بعد اب کوئی نبی نہیں ہو سکتا ۔ نہ ہی اس معنی میں رسول ۔ لیکن تبلیغ (یعنی وحی کو دوسروں تک پہنچانے) کا فریضہ امت کے سپرد ہے ۔ لہذا امت اپنے نظام کی وساطت سے '' فریضۂ رسالت '' کی ادائیگی کے لئے رسول اللہ ؐ کی جانشین ہے ۔ قرآن کریم میں حضور ؐ خاتم النبیین کی نبوت محفوظ ہے اور امت کے قرآنی نظام کے ذریعے '' فریضۂ رسالت '' قیامت تک مسلسل آگے جاسکتا ہے ۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ رسول وہ ہے جو اپنے ساتھ کتاب بھی لائے اور نبی وہ ہے جو کتاب نہ لائے ۔ یہ خیال قرآن کریم سے بے خبری پر مبنی ہے ۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اللہ نے تمام انبیاء کو کتاب دی تھی ۔ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۔ ۔ ۔ ۔ (۲/۲۱۳) - یہی الفاظ رسولوں کے لئے آئے ہیں (۵۷/۲۵) ۔ انبیاء کی انہی کتابوں کو مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ (۲/۱۳۶) کہا گیا ہے اور اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے ۔ حضرت عیسےٰ ؑ نے کہا تھا اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا (۱۹/۳۰) '' اللہ نے مجھے الکتاب دی ہے اور (اسطرح) مجھے نبی بنایا ہے '' ۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ ہر نبی صاحب کتاب ہوتا ہے ۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ، نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں ۔ اسی لئے حضرات انبیاء کرام ؑ کو (مثلاً خود نبی اکرم ؐ کو) کہیں نبی کہا گیا ہے (۸/۶۵) اور کہیں رسول ۔ (۴۸/۲۹) ۔ حتکہ حضرت اسماعیل ؑ کے متعلق ہے وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا (۱۹/۵۴) ۔ '' ایک پیغامبر (رسول) جسے نبوت عطا کی گئی تھی '' ۔ ختم نبوت (۳۳/۴۰) کے معنی یہ ہیں کہ اب کسی شخص کے لئے ممکن نہیں کہ وہ خدا سے براہ راست علم حاصل کرے ۔ علم جسقدر وحی کے ذریعے دیا جانا مقصود تھا ، وہ سب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے ۔ لہذا الہام یا کشف وغیرہ کے ذریعے خدا سے براہ راست علم پانے کا عقیدہ ختم نبوت کے عقیدہ کے منافی ہے ۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ نَبِيٌّ کا لفظ نَبَاوَةٌ سے مشتق ہے ۔ لیکن اگر اسے نَبَأٌ سے مشتق مانا جائے تو اس میں بھی بلندیِ مقام اور اخبار

عن الغیب (غیب کی باتوں سے باخبر کرنے) کے دونوں مفہوم آجائینگے۔ اس "غیب" کے معنی وحی ہونگے جو نبی کو خدا کیطرف سے ملتی ہے۔ (دیکھئے عنوان غ۔ ی۔ ب)۔ نہ کہ پیش گوئیاں جن کے مدعی (مسلم اور غیر مسلم) ہر جگہ ملتے ہیں۔

ن ب ت

اَلنَّبْتُ۔ اَلنَّبَاتُ۔ ہر وہ چیز جو زمین سے اُگے *۔ اَلْمَنْبِتُ۔ اگنے کی جگہ۔ اس مادہ میں ابھرنے اور نمایاں ہونے کے معنی بھی ہیں۔ چنانچہ لڑکی کے سینہ کے ابھرنے کے لئے نَبَتَ ثَدْیُ الجَارِیَۃِ کہا جاتا ہے اور لڑکے کے بالغ ہو جانے کو بھی نَبَتَتْ عَانَۃُ الغُلَامِ اور اَنْبَتَ الغُلَامُ سے تعبیر کرتے ہیں۔ نیز التَّنْبِیتُ کے معنی تربیت کرنے کے آتے ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بوئی ہوئی چیز میں نشو و نما ہونے کے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے وَاَنْبَتَتْ مِنْ کُلِّ زَوْجٍ بَهِیْجٍ (۲۲/۵)۔ زمین ہر قسم کی خوشنما روئیدگی اگاتی ہے۔ سورہ آل عمران میں حضرت مریم کے متعلق ہے وَاَنْبَتَهَا نَبَاتاً حَسَناً (۳/۳۶)۔ (اس کے رب نے) اُسے عمدہ پرورش سے پروان چڑھایا۔ یہاں جسمانی پرورش اور اخلاقی تربیت دونوں مقصود ہیں۔

نوع انسان کے متعلق ہے وَاللّٰهُ اَنْبَتَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ نَبَاتاً (۷۱/۱۷)۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ اللہ تمہیں نباتات کی طرح نشو و نما دیتا ہے اور یہ بھی کہ اللہ نے نوع انسان کو تمام کرۂ ارض پر درخت کی شاخوں کیطرح پھیلا دیا ہے جس کی جڑ اور تنا ایک ہی ہوتا ہے۔ نیز اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اللہ نے انسانوں کو زمین سے اسی طرح اگایا ہے جسطرح نباتات اگتے ہیں۔ قرآن کریم کے دوسرے مقامات میں ہے کہ تخلیق انسانی کی ابتداء مٹی سے ہوئی۔ اور اسطرح یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ (انسانی تخلیق اور نظریۂ ارتقاء کے متعلق تفصیلات میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملیگی)۔

ن ب ذ

نَبَذَ۔ کسی چیز کو اسلئے پھینکدیا کہ اسکی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ چنانچہ اَلْمَنْبُوْذُ ایسے بچے کو کہتے ہیں جسے راستے میں پھینکدیا گیا ہو ***۔ (یعنی ولدالزنا)۔ لہذا اسکے معنی ہیں کسی چیز کو حقارت کی وجہ سے

*راغب۔ **تاج۔ ***تاج و راغب۔

توجه کے قابل نہ سمجھنا ۔ نَبَذَ العَھْدَ ۔ عہد کو توڑ دیا ۔ نَبَذَ الاَمْرَ ۔ کسی کام کو بیکار چھوڑ دینا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پھینکنے اور ڈالنے کے ہیں ۔

اَلْاِنْتِبَاذُ ۔ ایک طرف ہٹ جانا ۔ کنارہ کش ہو جانا ۔ (۱۹/۱۶) ۔ اَلنَّبْذُ ۔ کھجور یا کشمش کو پانی میں ڈال کر ایک طرف رکھ چھوڑنا تاکہ وہ نبیذ بن جائے**۔

کَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ (۱۰۴/۴) ۔ سرمایہ دار اور اُس کا تمام مال ایک بے قدرو قیمت متاع کی طرح بیکار رہ جائیگا ۔ (حُطَمَۃٌ کے لئے دیکھئے ح ۔ ط ۔ م)

سورہ انفال میں قوم مخالف سے معاہدات کے ضمن میں ہے کہ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ . . . (۸/۵۸) ۔ اگر تمہیں کسی قوم سے بدعہدی کا خدشہ ہو تو ان سے برابری کی حالت میں معاہدہ کو ان کی طرف پھینکدو ۔ یعنی خیانت کے خدشہ سے تم ، بلا تنبیہہ ، یونہی معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرنے لگ جاؤ ۔ نہ ہی انہیں نقصان پہنچانے کی فکر کرو ۔ بلکہ جس برابری کی حیثیت سے تم نے ان سے معاہدہ کیا تھا ، اسی حیثیت سے ان سے کہدو کہ ہمیں تم پر اعتماد نہیں رہا اس لئے تمہارا اور ہمارا معاہدہ کا لعدم سمجھا جائے ۔ عَلٰى سَوَاءٍ (یعنی انہیں برابری کی حیثیت دو ۔ یا یکبارگی معاہدہ کوکالعدم قرار دینے سے انہیں اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو از روئے عدل و انصاف انہیں اس نقصان سے بچاؤ) کی شرط جس اصولِ عدل کی گواہی دیتی ہے وہ قرآن کریم ہی کی خصوصیت ہو سکتی ہے ۔ اس کے برعکس ، غیر مسلموں (زمانہ نبوی کے اہل کتاب) کی حالت یہ تھی کہ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ . . . (۲/۱۰۰) " جب کبھی وہ کوئی معاہدہ کرتے ہیں تو ان میں کا ایک گروہ اس معاہدہ کو (ردی کی ٹوکری میں) پھینکدیتا ہے ۔ ان دونوں آیتوں میں خالی نَبَذَ اور نَبَذَ عَلٰى سَوَاءٍ کا فرق بین طور پر سامنے آجاتا ہے ۔

ن ب ز

اَلنَّبْزُ ۔ کسی کا نام دھرنا ۔ کوئی برا لقب دینا ۔ اَلتَّنَابُزُ ۔ ایک دوسرے کو عار دلانا ۔ ایک دوسرے کو عار دلانے والے القاب سے یاد کرنا ۔ ایک دوسرے کے مذموم نام رکھنا ۔ اَلنَّبِیْزُ ۔ اخلاق اور حسب کے اعتبار سے کمینہ ۔ اَلنَّبْزُ ۔ کھجور کے درخت کا بالائی چھلکا*۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **محیط ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَ لَا تَنَابَزُوا بِالْاَلْقَابِ (۴۹/۱۱) ۔ آپس میں ایک دوسرے کے طنز و تحقیر آمیز نام نہ دھرا کرو ۔

ن ب ط

اَلنَّبَطُ ۔ وہ پانی جو کنواں کھودنے پر پہلے پہل نکلے ۔ اَنْبَطَ الْحَافِرُ کھودنے والا کھودتے کھودتے پانی تک پہنچ گیا ۔ اسی سے اس کے معنی ہوتے ہیں بات کو گہرائی سے نکال لینا اور ظاہر کر دینا* ۔ تحقیقات کے بعد بات کی اصل تک پہنچ جانا اور اسے ظاہر کر دینا ۔ قرآن کریم میں ہے اَلَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (۴/۸۳) ۔ ان میں سے وہ لوگ جو تحقیقات کے بعد بات کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں ۔ زجاج نے کہا ہے اس کے معنی استخراج کے ہیں* ۔ یہی معنی ابن فارس نے بھی لکھے ہیں ۔ یعنی پیش نظر واقعات سے خاص نتیجہ نکالنا ۔ اس کے غوامض تک پہنچ جانا ۔

ن ب ع

اَلنَّبْعُ ۔ چشمہ سے پانی کا نکلنا ۔ اَلْیَنْبُوْعُ ۔ چشمہ ، جہاں سے پانی نکلتا ہو (جمع یَنَابِیْعُ)* ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْبُوْعًا (۱۷/۹۰) ۔ ''تو ہمارے لئے اس زمین سے چشمہ بہا دے'' ۔ سورۃ زمر میں ہے ۔ فَسَلَکَهٗ یَنَابِیْعَ فِی الْاَرْضِ (۳۹/۲۱) ۔ ''پھر اسے (پانی کو) چشمے بنا کر زمین میں بہاتا ہے'' ۔ مَنْبَعُ الْمَاءِ ۔ پانی پھوٹنے کی جگہ* ۔

ن ت ق

نَتَقَ ۔ یَنْتِقُ ۔ (یَنْتُقُ) ۔ کسی چیز کو سخت حرکت دینا ۔ اور ہلانا* ۔ وَ اِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ (۷/۱۷۱) ۔ جب ہم نے اس پہاڑ میں زلزلہ پیدا کیا جو ان کے سروں کے اوپر تھا ۔ اَلنَّاتِقُ مِنَ الْخَیْلِ ۔ وہ گھوڑا جو اپنے سوار کو اچھال اچھال کر اس کا کچومر نکال دے ۔ یا اُسے گرا دے ۔ اَلنَّتْقُ کے معنے اکھاڑ دینے کے بھی آتے ہیں اور ہلا کر جھاڑ دینے کے بھی* ۔ یہ سب حرکت ہی کے مظاہرے ہیں ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو اس طرح کھینچنے کے ہیں کہ وہ ڈھیلی ہوجائے** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو کھینچنے ، ہلانے اور اسے اس کی جڑ سے اکھاڑنے کے ہیں ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔

ن ث ر

نَثَرَ ۔ یَنْثُرُ ۔ نَثْرًا وَ نِثَارًا ۔ کسی چیز کو بکھیر دینا ۔ فَانْتَثَرَ ۔ پس وہ بکھر گئی ۔ اَلنَّثِرُ ۔ راز کی باتوں کو پھیلانا ۔ بہت زیادہ باتیں کرنا ۔ اَلْمُنْتَثِرُ ۔ کمزور آدمی جس میں کوئی بھلائی کی بات نہ ہو ۔ اَلْمِنْثَارُ ۔ اس کھجور کے درخت کو کہتے ہیں جس سے کچی کھجوریں گر جائیں ۔ یعنی وہ پکنے سے پہلے ہی گر جائیں اور اس طرح اس کا پھل کسی کام نہ آئے* ۔

قرآن کریم میں مجرمین کے اعمال کے متعلق ہے فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (۲۵/۲۳) ہم انہیں بے نتیجہ اور رائیگاں جانے والا بنا دینگے ۔ مکافاتِ عمل کی میزان میں ان کا کچھ وزن نہیں ہوگا ۔ وہ فضا میں منتشر ذرات کی طرح ہو جائیں گے ۔ یعنی وہ کوئی تعمیری نتیجہ پیدا نہیں کر سکینگے ۔ (''بے نتیجہ'' رہ جانے سے یہی مطلب ہے) ۔

بکھرنے کے معنوں میں سورۃ انفطار میں ہے ۔ اِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (۸۲/۲) ۔ جب ستارے بکھر جائینگے ۔ ان کا شیرازہ منتشر ہوجائیگا ۔

ن ج د

اَلنَّجْدُ ۔ زمین کا وہ حصہ جو بلند اور سخت ہو ۔ نیز بلند ، کھلے اور واضح راستے اور ، ماہر راہنما کو بھی کہتے ہیں** ۔

نَجَدَ الْاَمْرُ یَنْجُدُ ۔ معاملہ واضح اور ظاہر ہو گیا** ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰/۱۰) ہم نے انسان کو (حق و باطل کے) دونوں راستے (وحی کے ذریعے) دکھا دئے ۔ اب اس کے بعد وہ صاحب اختیار ہے کہ ان میں سے جونسا راستہ چاہے اپنے لئے اختیار کرلے ۔ واضح رہے کہ حق و باطل کے راستے ، وحی (قرآن) کی رو سے دکھائے گئے ہیں ۔ انسان کے اپنے اندر اس کی صلاحیت نہیں کہ وہ وحی کی روشنی کے بغیر از خود خیر و شر میں تمیز کر سکے ۔ (دیکھئے عنوان ل ۔ ھ ۔ م اور ف ۔ ط ۔ ر) ۔

نیز ، خدا کا کام صرف راستے دکھا دینا ہے ۔ صحیح راستہ پر چلا دینا نہیں ۔ یہ انسان کے اپنے اختیار کی بات ہے کہ وہ جونسا راستہ چاہے اختیار کر لے ۔ یہی اختیار ، انسان کو اس کے ہر فیصلہ اور عمل کا ذمہ دار بنا دیتا ہے اور اسی سے وہ اپنے اعمال کے (اچھے اور برے) نتائج کا مستحق قرار پاتا ہے ۔

---

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج و راغب ۔

ن ج س

اَلنَّجَسُ - یہ طَاھِرٌ کی ضد ہے (جس کے لئے دیکھئے عنوان ط - ھ - ر) قَدْ نَجِسَ ثَوْبُہٗ - اس کا کپڑا ناپاک ہوگیا* - راغب نے کہا ہے کہ نَجَاسَۃٌ - دو طرح کی ہوتی ہے - ایک تو وہ جس کا ادراک حاسہ (بصارت) سے کیا جا سکتا ہے - اور دوسرے وہ جس کا ادراک بصیرت سے کیا جا سکتا ہے۔ جیسے دل کی آلودگی - نگاہ کی ناپاکی - انہی معنوں میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ (۹/۲۸) ''مشرکین یقیناً آلودگیوں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں''۔ دَاءٌ نَاجِسٌ - ایسی بیماری جس سے انسان اچھا نہ ہو* -

اہل عرب اپنے بچوں کے گلے میں آسیب اور نظر بد وغیرہ سے بچنے کے لئے تعویذ پہنا دیا کرتے تھے - یہ تعویذ گندی چیزوں کے ہؤا کرتے تھے - مثلاً مُردوں کی ہڈیاں - یا حیض کا کپڑا وغیرہ - ایسے وہ اَلتَّنْجِیْسُ کہتے تھے** - یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ازالۂ نجاست کی وجہ سے اس عمل کو اَلتَّنْجِیْسُ کہا گیا ہو -

ن ج م

اَلنَّجْمُ - ستارہ جب وہ نکلا ہوا ہو - جمع اَنْجُمٌ اور نُجُوْمٌ - نیز اَلنَّجْمُ اُس پودے کو کہتے ہیں جسکا تنہ نہ ہو اور وہ زمین پر پھیل جائے - برخلاف اَلشَّجَرُ کے جسکا تنہ ہوتا ہے*** - اَلنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدَانِ (۵۵/۶) کے یہی معنی ہیں - (یہ دونوں لفظ اسم جمع ہیں - ان کا واحد '' ۃ '' سے بنتا ہے - اگرچہ، جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے، اَلنَّجْمُ کی جمع بھی آتی ہے - ویسے، اسم جمع بالعموم لفظاً واحد استعمال ہوتے ہیں اور معناً جمع - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی نکلنے اور ظاہر ہونے کے ہیں۔ اَلنَّجْمَۃُ کلمہ (لفظ اور بات) کو بھی کہتے ہیں*** - قرآن کریم کے آہستہ آہستہ بالاقساط نازل ہونے کو بھی اَلنَّجْمُ کہاجاتا ہے*** - لیکن قرآن کریم میں اس مفہوم کے لئے یہ لفظ نہیں آیا -

نَظَرَ فِی الْاَمْرِ - کسی معاملہ میں اس غرض سے غور و فکر کرنا کہ اسکی تدبیر کس طرح سے کی جائے - چنانچہ سورۂ صٰفّٰت میں حضرت ابراہیم[۴] کے متعلق جو ہے کہ فَنَظَرَ نَظْرَۃً فِی النُّجُوْمِ (۳۷/۸۸) تو اسکے معنی غور و فکر

*تاج - محیط - راغب - **محیط - ***تاج -

کرنے کے ہیں * ۔ لیکن ہمارے نزدیک اسکا صحیح مفہوم وہ ہے جسے ہم نے (ن ۔ ظ ۔ ر) کے عنوان میں لکھا ہے ۔ یعنی نکتہ چینی کرنا ۔ عیب نکالنا تنقید کرنا ۔

صاحب غریب القرآن نے لکھا ہے کہ اَلنُّجُوْمُ رؤسائے قوم یا چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو کہتے ہیں**۔ برخلاف اَلشَّمْسُ کے جس سے مراد ایران کی سلطنت ہے ($\frac{۸۱}{۱۰۲}$) ۔

ن ج و

نَجَاءٌ ۔ نَجَاۃٌ نَجَایَۃٌ ۔ کسی ایسی چیز سے محفوظ رہنا جس میں خطرہ ہو ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ نَجْوَۃٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں بلند جگہ ۔ اَلنَّجْوَۃُ وَالْمُنْتَجٰی ۔ اس بلند جگہ کو کہتے ہیں جس کی بلندی کی وجہ سے اس تک سیلاب کا پانی نہ پہنچ سکے ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلنَّجْوَۃُ وَالنَّجَاۃُ ۔ اس جگہ کو کہتے ہیں جو اپنی بلندی کی وجہ سے ارد گرد سے الگ اور ممتاز نظر آئے ***

نَجَا ۔ یَنْجُوْ ۔ نَجَاءٌ ۔ تیز چلنے اور آگے نکل جانے کو بھی کہتے ہیں ۔ ایک حدیث میں ہے اِذَا سَافَرْتُمْ فِی الْجَدْوَبَۃِ فَاسْتَنْجُوْا ۔ جب تم کسی خشک اور قحط زدہ زمین میں سفر کرو تو وہاں سے تیزی سے گذر جاؤ ۔ اسی لئے نَاقَۃٌ نَاجِیَۃٌ ۔ تیز رفتار اونٹنی کو کہتے ہیں ***۔

راغب نے کہا ہے کہ نَجَاءٌ کے اصلی معنی کسی چیز سے الگ ہو جانے کے ہیں **** ۔ نَجَا غُصُوْنَ الشَّجَرَۃِ ۔ درخت کی شاخیں کاٹ دیں ۔ نَجَا الْجِلْدَ کے معنی ہیں کھال کھینچ دی *** ۔ ابن فارس نے اس کے دو بنیادی معنی لکھے ہیں جو باہمدگر متضاد ہیں ۔ (۱) کسی چیز کو چھیل دینا اور کھول دینا ۔ اور (۲) چھپانا اور پوشیدہ کرنا ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اسکا استعمال بلندی کے معنوں میں بھی بتایا ہے ۔

اس لفظ کے بنیادی معنوں کو سامنے رکھنے سے نجات کا قرآنی مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ دوسرے مذاہب میں انسان کے متعلق تصور یہ ہے کہ وہ دنیا کے جیل خانے میں بری طرح قید ہے ۔ اسے اس قید سے رہائی مل جانے کا نام نجات ہے ۔ ہندو دھرم کا عقیدہ ہے کہ انسان دنیا میں ، اپنے سابقہ جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے آتا ہے ۔ اس سزا سے خلاصی مل جانے کا نام نجات ہے ۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر ابن آدم پیدائشی طور پر اپنے

*تاج ۔ **غریب القرآن (میرزا ابوالفضل ۔) ***تاج و محیط ۔ ****راغب ۔

اولین ماں باپ (آدم و حوا) کے گناهوں کو اپنی پیٹھ پر لادے هوئے آتا هے اور اس کثافت سے اسکا چھٹکارا ناممکن هے جب تک وہ حضرت عیسیٰؑ کے کفارہ پر ایمان نہ لائے ۔ ویدانت (یعنی هندوؤں کے تصوف) کا عقیدہ یہ هے کہ انسانی روح (آتما) اپنی اصل (پرماتما) سے الگ هو کر مادہ کی دلدل میں پھنسکر چیخ پکار کر رهی هے ۔ اس مصیبت سے چھٹکارا پاکر جزو کا اپنی اصل سے جا کر مل جانا نجات هے ۔ ایسا هی تصور بدھ مت میں هے جنکا عقیدہ هے کہ هر آرزو ایک مصیبت کا پیش خیمہ هوتی هے ۔ انسان، ترک آرزو سے اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر سکتا هے۔ اسے نروان کہتے هیں ۔ مختصراً یہ کہ ان مذاهب نے تصور یہ دیا هے کہ انسان اس دنیا میں آنے سے پہلے اچھی حالت میں تھا ۔ اس میں آ کر یہ مصیبت میں پھنس گیا ۔ اب اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرکے، پھر سے اپنی پہلی حالت میں پہنچ جانا (نجات) مقصود حیات هے ۔ قرآن کریم ان تمام تصورات کی تردید کرتا هے ۔ وہ کہتا هے کہ انسان نہ تو اپنے کسی سابقہ جنم کے گناهوں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں آتا هے اور نہ هی اپنے اولین ماں باپ کے گناهوں کی آلودگی کو اپنے ساتھ لاتا هے ۔ اس لئے دنیا جیل خانہ نہیں جس سے چھٹکارا حاصل کرنا مقصود حیات هو ۔ نہ هی انسانی روح، خدا کی روح کا جزو هے جو مادہ کی دلدل میں پھنسی هوئی هے اور یہاں سے خلاصی پا لینے کا نام نجات هے ۔ وہ کہتا هے کہ هر انسانی بچہ ایک سادہ لوح (Clean Slate) لیکر دنیا میں آتا هے ۔ اسے فطرت کیطرف سے کچھ صلاحیتیں ملتی هیں ۔ اس میں "کچھ بننے" کی امکانی وسعتیں (Realiseable Possibilities) هوتی هیں ۔ ان (Potentialities) کو مشہود بنانا (Actualised کرنا) مقصود حیات هے تاکہ انسان اس زندگی سے بلندتر زندگی بسر کرنے کے قابل هو سکے ۔ مقصود زیست (As you Were) هونا نہیں ۔ ترقی کرنا اور آگے بڑھنا هے ۔ زمین کی زندگی انسان کی تربیت گاہ هے ۔ اس میں اسکی ذات کی نشوونما (Development) هوتی هے جس سے یہ اس دنیا کی تمام خوشگواریاں اور شادکامیاں حاصل کر لیتا هے اور اس زندگی سے اگلی زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بھی هو جاتا هے ۔ لہذا دنیا سے چھٹکارا حاصل کر لینا مقصودِ حیات نہیں ۔ اس دنیا کو مسخر کرکے اسکی نعمتوں کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنا اور اسطرح اپنی ذات کی نشو و نما اور انسانیت کی فوز و فلاح حاصل کرنا مقصود حیات هے ۔

دنیا میں باطل کی قوتوں کے ساتھ کشمکش لازمی هے ۔ اور اس کشمکش هی سے انسانی ذات کا استحکام هوتا هے ۔ جو جماعت، قانون خداوندی کے

مطابق زندگی بسر کرتی ہے اسے ان مستبد قوتوں کی گرفت سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور تباہی اور بربادی سے معصُون ۔ اس کے لئے قرآن کریم نے نجات کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم اپنی غلط روش کی وجہ سے مستبد قوتوں کے فولادی پنجے میں گرفتار ہو جاتی ہے لیکن اسکے بعد پھر قوانین خداوندی کی طرف رجوع کر لیتی ہے تو اسے ان سرکش قوتوں کے دامِ بلا سے رهائی مل جاتی ہے ۔ اس کے لئے بھی نجات کا لفظ آیا ہے ۔ (جیسے بنی اسرائیل کو فرعون کے مظالم سے رستگاری نصیب ہو جانا ان کی نجات تھی)۔

اب رہی مرنے کے بعد جہنم کی سزا سے نجات ۔ سو اس کے متعلق یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ ہم اپنے اسلاف کی بعض لغزشوں کی وجہ سے کچھ وقت کے لئے جہنم میں رہیں گے اور اس کے بعد ، جب اس سزا کی مدت ختم ہو جائے گی یا ان گناہوں کی کثافتیں دور ہو جائینگی تو پھر جنت میں چلے جائینگے ($\frac{۳}{۲۴}$)۔ یعنی ان کے ہاں جہنم سے مفہوم یہ ہے کہ یا تو انسان اس میں ایک مدت معینہ تک سزا بھگتنے کے لئے بھیجا جائیگا اور یا اس لئے کہ اس کے گناہ دھل جائیں اور وہ پاک و صاف ہو کر جنت میں چلا جائے ۔ اسکا نام ان کے ہاں نجات ہے ۔

یہ دونوں تصور بھی قرآن کریم کے خلاف ہیں ۔ قرآن کریم کی رو سے انسان جہنم میں نہ تو ایک قیدی کی طرح ایک مدت معینہ تک سزا بھگتنے کے لئے جاتا ہے اور نہ ہی جہنم دھوبی کی بھٹی ہے جس میں گناہوں کی کثافتیں صاف ہوتی ہیں تاکہ انسان پاک و صاف ہو کر جنت میں جائے ۔ قرآن کریم کا تصور یہ ہے کہ جب قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کی مضمر صلاحیتوں (ذات) کی اتنی نشوونما ہو جائے کہ وہ زندگی کی اگلی منزل (یعنی سلسلۂ ارتقاء کی اگلی کڑی) تک پہنچنے کے قابل ہو جائے تو اسے جنت کی زندگی کہتے ہیں جس میں اسکی نشوونما مزید ترقی حاصل کرتی رہتی ہے ۔ لیکن اگر وہ غیر خداوندی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرے تو اسکی نشو و نما رک جاتی ہے ۔ اسے جہنم کی زندگی کہتے ہیں*۔ جس کی نشوونما رک جاتی ہے وہ زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل نہیں رہتا ۔ وہ اسی مقام پر رکا رہتا ہے ۔ اس لئے کسی کے "جہنم" سے نکلنے

*واضح رہے کہ جنت اور جہنم کی زندگی اس دنیا میں بھی ہوتی ہے اور اس کے بعد کی زندگی (آخرت) میں بھی ۔ اس مقام پر جس جنت اور جہنم کی زندگی کا ذکر ہے اس کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہے ۔

کا سوال ھی پیدا نہیں ھوتا۔ اس اعتبار سے نجات کا وہ تصور بھی غیر قرآنی ھے جسکی رو سے (یہودیوں کی طرح) سمجھا جاتا ھے کہ انسان اپنے گناھوں کی سزا بھگتنے (یا پاک و صاف ھونے) کے لئے کچھ وقت کے لئے جہنم میں جائیگا اور پھر وھاں سے چھٹکارا پا کر جنت میں چلا جائیگا۔ (اس مقام پر صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ھے تفصیل ان امور کی جہنم اور جحیم وغیرہ عنوانات میں ملے گی)۔

نَجْوٰی کے معنی سرگوشی اور رازداری کی باتیں کرنے کے ھیں۔ راغب نے کہا ھے کہ اسکی وجہ یہ ھے کہ وہ لوگ بستی سے باھر جا کر کسی بلند مقام پر بیٹھ کر آپسمیں رازداری کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اور اسکیمیں بنایا کرتے تھے۔ بعض نے کہا ھے کہ یہ نَجَاۃٌ سے ماخوذ ھے۔ اس طرح نَجْوٰی کا مطلب ھوگا، مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ اِنْتَجٰی کے معنی بلند مقام پر بیٹھنے کے ھیں*۔ نَجِیٌّ۔ ھم راز جس کے ساتھ سرگوشی کی جائے (۱۹/۵۲)۔ اسی سے فعل نَاجٰی وتَنَاجٰی۔ باھم سرگوشی کرنے کے لئے آتا ھے۔ قرآن کریم میں نجوٰی کا لفظ راز اور مشوروں کے معنی میں کئی جگہ آیا ھے (مثلاً۔ ۲۰/۶۲ ; ۵۸/۸)۔

سورہ یونس میں فرعون۔ حضرت موسٰےؑ کی غرقابی کے سلسلہ میں ھے فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوْنَ لِمَنْ خَلْفَکَ اٰیَۃً (۱۰/۹۲)۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ھے کہ اس میں نُنَجِّیْکَ کے معنی ھیں کسی بلند جگہ پر پھینکدینا۔ اس آیت میں بتایا گیا ھے کہ اگرچہ فرعون غرق ھو گیا تھا لیکن اس کی لاش کو محفوظ کر لیا گیا تھا تاکہ وہ بعد میں آنے والوں کے لئے آیۂ عبرت بن سکے۔ مصر کے تہ خانوں سے، فراعنہ کی جو لاشیں ملی ھیں اس میں فرعون حضرت موسٰےؑ کی لاش بھی موجود ھے (دیکھئے انسائکلوپیڈیا برٹانیکا۔ عنوان ممّی)۔ چونکہ یہ انکشاف حال ھی کا ھے اور ھمارے قدیم مفسرین کو اس کا علم نہیں تھا، اس لئے ظاھر ھے کہ وہ اس آیت کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتے تھے۔ (یہی وجہ ھے کہ صاحب کتاب الاشتقاق نے بھی اس آیت میں بَدَنٌ کے معنی زرہ کے کئے ھیں۔ یعنی فرعون کی زرہ پانی سے باھر، بلند جگہ پر پھینک دی گئی تھی۔ لیکن مذکورہ صدر انکشاف نے حقیقت حال کو بے نقاب کر دیا ھے کہ بَدَن سے مراد فرعون کی لاش ھی ھے)۔

---

*تاج۔

قرآن کریم نے اپنے حقائق کے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ جوں جوں انفس و آفاق میں خدا کی نشانیاں بے نقاب ہوتی جائینگی، قرآنی حقائق کی وضاحت ہوتی جائیگی (۴۱/۵۳)۔ ان ''نشانیوں'' کے بے نقاب ہونے کا ایک طریق تاریخی شواہد کا سامنے آنا بھی ہے، جیسا کہ فرعون کی لاش کے سلسلہ میں ہوا۔

ن ح ب

اَلنَّحْبُ۔ وہ نذر (منت) جس کے واجب ہونے کا فیصلہ کرلیا جائے*۔ نَحَبَ الرَّجُلُ یَنْحَبُ۔ آدمی نے نذر مانی**۔ اَلتَّنْحِیْبُ۔ لگاتار سرگرمی اور انہماک سے کام کرنا۔ اَلنَّحْبُ۔ موت۔ جوا اور قمار بازی کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں شرط باندھی جاتی ہے جس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

اَلنَّحْبُ۔ خطرۂ عظیم***۔ بلند آواز سے رونا***۔ ابن فارس نے بھی یہ دونوں معانی لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ۔ (۳۳/۲۳)۔ ان میں وہ بھی ہیں جنہوں نے اپنی نذر (واجبات) کو پورا کر دیا۔ حق کی خاطر جان دے دی۔

ن ح ت

نَحَتَ یَنْحَتُ و یَنْحِتُ۔ کسی چیز کو چھیلنا۔ تراش کر ہموار کرنا**۔ اَلنُّحَاتُ۔ بڑھئی کے لکڑی چھیلنے کو کہتے ہیں****۔

قرآن کریم میں ہے۔ وَ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُیُوْتًا (۷/۷۴)۔ تم پہاڑوں کو کاٹ اور تراش کر ان میں مکانات بناتے ہو۔

ن ح ر

نَحْرُ الصَّدْرِ۔ سینے کا اوپر کا حصہ۔ سینہ پر جہاں ہار پہنا جاتا ہے۔ نَحَرَ الْبَعِیْرَ یَنْحَرُهٗ نَحْرًا۔ اس نے اونٹ کے سینہ سے متصل اس جگہ پر نیزہ مارا جہاں سے حلق شروع ہوتا ہے۔ (اونٹوں کو اسی طرح ذبح کرتے ہیں)***۔ ابن فارس نے بھی لکھا ہے کہ اس مادہ سے کئی الفاظ آتے ہیں۔ سینے کو بھی کہتے ہیں اور سینے کے چیر دینے کو بھی۔

قرآن کریم میں ہے۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَ انْحَرْ (۱۰۸/۲)۔ اس میں وَ انْحَرْ کی بہت سی تفاسیر صاحب تاج نے لکھی ہیں۔ مثلاً (۱) نماز میں کھڑا

---

*راغب۔ **محیط۔ ***تاج۔ ****لسان العرب۔

ہو کر سینے کو باھر کی طرف نکالنا ۔ (۲) نماز میں دایاں ھاتھ بائیں پر رکھنا ۔ (۳) قربانی کے جانوروں (اونٹوں) کو ذبح کرلنا ۔ (۴) نماز میں سینے پر ھاتھ باندھنا ۔ (۵) نماز میں (نحرتک) ھاتھ اٹھانا ۔ (۶) اپنے سینہ کو قبلہ رخ رکھ کر کھڑے ہونا ۔ (۷) خواھشات کا قلع قمع کرنا ۔ (۸) دن کے ابتدائی حصہ میں (قبلہ رخ) کھڑے ہونا* ۔ لیکن نَحَرَ کے معنی ھیں دسترس پیدا کرنا ۔ کسی بات پر حاوی ہوجانا ۔ اسے اچھی طرح حاصل کرلینا ۔ نَحَرْتُ الشَّيْئَ عِلْمًا ۔ میں علم کے ذریعے اس معاملہ پر حاوی ہوگیا** ۔ نَحَرَ الْاُمُوْرَ عِلْمًا ۔ اس نے معاملات کو اچھی طرح سمجھ لیا*** ۔ چنانچہ اَلنِّحْرُ ۔ وَالنِّحْرِيْرُ کے معنی ھیں ماھر ۔ عقل مند ۔ تجربہ کار ۔ ھر چیز کو سمجھنے اور دیکھنے والا اور مضبوطی سے اس پر عمل کرنے والا*** ۔ اس لئے وَانْحَرْ (۱۰۸/۲) کے معنی ہونگے ، اس پروگرام کے متعلق تمام امور پر علم و عقل اور تجربہ و بصیرت سے پوری پوری طرح حاوی ہوکر ، اُن پر نہایت مضبوطی سے عمل پیرا رھو ۔

لیکن اگر اس آیت میں وَانْحَرْ سے مراد "اونٹ کا ذبح کرنا" لیا جائے تو اس سے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ھے ۔ ھجرت کے بعد جب رسول اللہؐ مدینہ تشریف لائے تو حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کی جماعت (انصار اور مہاجر دونوں) غریب اور کمزور تھی اور مدینہ میں یہودیوں کا بڑا زور تھا ۔ ایسے حالات میں کمزور جماعتیں ھمیشہ طاقتور جماعتوں کے سہارے ڈھونڈھتی ھیں اور اس کے لئے اپنے اصولوں تک کو قربان کردیتی ھیں ۔ یہودیوں کے ھاں اونٹ حرام تھا اور مسلمانوں کے ھاں حلال ۔ وہ اونٹ کے ذبیحہ کو قابلِ اعتراض سمجھتے تھے ۔ وہ مدینہ میں اپنی قوت کی بنا پر سمجھتے تھے کہ مسلمان ان سے دب کر رھینگے اور اونٹ کو ذبح کرنے سے محتاط رھینگے ۔ قرآن کریم نے ھین اس مقام پر حکم دیا کہ مدینہ میں "اونٹ ذبح کرو" ۔ یعنی دین کے معاملہ میں یہودیوں سے مفاھمت کا خیال نہ کرو ۔ چنانچہ اس کمزور جماعت نے تھوڑے ھی دنوں میں اتنی قوت پیدا کرلی کہ یہودی (جو اپنی فتنہ پردازیوں سے باز نہیں آتے تھے) مدینہ چھوڑنے پر مجبور ہوگئے ۔ [اس ضمن میں بعض نے کہا ھے کہ عبرانی زبان میں "کوشر" حلال ذبیحہ کو کہتے ھیں ۔ اَلْكَوْثَرَ (۱/۱۰۸) اسی سے معرب ھے اس اعتبار سے اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (۱/۱۰۸) کے معنے ہونگے "ھم نے تجھے (اونٹ) بطور حلال ذبیحے کے عطا کیا" ۔ لیکن ھم نے اس مفہوم کو ترجیح نہیں دی ۔ دیکھئے عنوان (ک ۔ ث ۔ ر)] ۔

*تاج ۔ **اساس زمخشری بحوالہ غریب القرآن مرزا ابو الفضل ۔ ***محیط ۔

ن ح س

اَلنُّحاس (نون پر تینوں حرکتیں جائز ہیں)۔ پگھلا ہوا تانبہ۔ پیتل یا لوہے کو جب کوٹا جائے تو اس میں سے جو چنگاریاں اڑتی ہیں انہیں بھی کہتے ہیں۔ نیز اس اونچے ہو جانے والے دھوئیں کو بھی کہتے ہیں جس میں خفیف حرارت ہو لیکن لپٹ اور شعلہ نہ ہو*۔ راغب نے اسکے معنے ایسے شعلہ کے لکھے ہیں جس میں دھواں نہ ہو۔ یہیں سے نَحْسٌ ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ افق آسمان نُحَاس کی طرح سرخ ہو جائے۔ اسے عرب نحوست کی نشانی سمجھتے تھے**۔ اسی سے اَلنَّحْسُ ہر تاریک معاملہ کو کہتے تھے۔ اور مشقت، تکلیف، نقصان، ضرر اور تکان کو بھی۔ چنانچہ کہتے ہیں نَحَسَتِ الْاِبِلُ فُلَانًا۔ اونٹوں نے فلاں آدمی کو تھکا دیا۔ اَلنَّحَسُ۔ اُن تین راتوں کو کہتے جن کا بڑا حصہ چاند نہ ہونے کی وجہ سے تاریک ہوتا ہے۔ تَنَاحَسَ فُلَانٌ۔ فلاں آدمی اوندھا ہوگیا۔ تَنَحَّسَ الرَّجُلُ۔ آدمی بھوکا رہا۔ نَحَسَهٗ نَحْسًا۔ اس نے اس کے ساتھ بے مروتی کی۔ جفا کی۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَیَّامٍ نَحِسَاتٍ سخت سردی کے دنوں کو بھی کہتے ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سعادت کی ضد ہیں۔ اَلنُّحَاسُ پیتل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ سونا چاندی کے مقابلہ میں قدر و قیمت کے لحاظ سے کم تر ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں نُحَاسٌ (۵۵/۳۵)۔ دھوئیں یا چنگاریوں کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ یعنی جہنم کا عذاب۔ سورہ قمر میں قوم عاد کے عذاب کے سلسلہ میں کہا ہے کہ ان پر سخت جھکڑ آیا فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (۵۴/۱۹) ان کی مسلسل مصیبت کے دن میں۔ (یَوْمِ نَحْسٍ مرکب اضافی ہے) اسی کو دوسری جگہ اَیَّامٍ نَحِسَاتٍ (۴۱/۱۶) کہا گیا ہے۔ پرمشقت ایام۔ (مرکب توصیفی)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے سعد و نحس کا مفہوم وہ نہیں جو ہمارے ہاں عام طور پر رائج ہے۔ ہمارے ہاں (مثلاً) کہتے ہیں کہ منگل کا دن منحوس ہوتا ہے۔ یہ خالص ہندوانہ تصور ہے اور توہم پرستی پر مبنی۔ کوئی دن یا کوئی گھڑی فی ذاتہ نہ سعید ہوتی ہے نہ منحوس۔ جسدن کسی پر اس کے کسی غلط کام کی وجہ سے مصیبت آتی ہے وہ دن اس کے لئے منحوس ہوتا ہے (یعنی مصیبت کا دن) اور جسدن کامیابی اور

---

*تاج۔ **راغب۔

شادکامی اسکے سامنے آئے وہ دن سعید ۔ لہذا سعادت اور نحوست انسان کے اپنے اعمال ھی کے نتائج کا نام ھے ۔ (نیز دیکھئے عنوان س ۔ ع ۔ د)

ن ح ل

اَلنَّحْلُ ۔ شہد کی مکھیاں* ۔ (۱۶/۶۸) ۔ اَلنِّحْلَةُ اَلنُّحْلَةُ ۔ وہ عطیہ جو بغیر کسی قسم کے معاوضہ کے دیا جائے** ۔ سورہ نساء میں ھے وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (۴/۴) ۔ عورتوں کو ان کے مہر بطور عطیہ ، بلا بدل دے دو ۔ اس کا مطلب یہ ھے کہ مہر وہ عطیہ (Gift) ھے جو مرد کی طرف سے عورت کو کسی قسم کے معاوضہ کے خیال کے بغیر تحفۃً دیا جاتا ھے* ۔ اَلْعَطَاءُ بِلَا عِوَضٍ (لطائف اللغۃ) ۔ تاج اور ابن فارس نے النَّحْلُ کے یہی معنی لکھے ھیں ۔ راغب نے لکھا ھے کہ یہ لفظ نَحْلٌ ھی سے مشتق ھے ۔ یعنی جسطرح شہد کی مکھی بلا کسی معاوضہ کے شہد جیسی مفید چیز عطا کر دیتی ھے ، اسی طرح نِحْلَةٌ وہ شیریں تحفہ ھے جو عورت کو بطیب خاطر اور بغیر کسی معاوضہ کے خیال کے دیا جاتا ھے ۔ یہ ھے مہر کی حقیقت ۔ (قرآن کریم میں مہر کا لفظ نہیں آیا) ۔ یعنی یہ کوئی معین رقم نہیں جو بطور معاوضہ دی جائے ۔ بلکہ تحفہ ھے جو کسی معاوضہ کے خیال کے بغیر، مودت اور محبت کے اظہار کے لئے دیا جائے ۔ اور جس پر دونوں فریق رضامند ھو جائیں ۔ مقصود اس سے عورت کا وزن بڑھانا ، اس کے وقار میں اضافہ کرنا ھے ۔

نَحْنُ (ضمیر)

نَحْنُ ۔ ضمیر مرفوع منفصل ھے ۔ تثنیہ (دو) اور جمع متکلم کیلئے آتی ھے اور مذکر و مؤنث دونوں کیلئے یکساں طور پر استعمال ھوتی ھے ۔ نَحْنُ رَجُلَانِ ۔ ھم دو مرد ھیں ۔ نَحْنُ امْرَأَتَانِ ۔ ھم دو عورتیں ھیں ۔ نَحْنُ رِجَالٌ ۔ ھم سب مرد ھیں ۔ نَحْنُ نِسْوَةٌ ۔ ھم سب عورتیں ھیں ۔

سورہ بقرہ میں ھے نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (۲/۱۴) ۔ "ھم تو مذاق کرتے ھیں" ۔

ن خ ر

نَخَرَ ۔ يَنْخَرُ ۔ آواز یا سانس کو ناک میں کھینچنا ۔ ناک سے نکلنے والی آواز نَخِيْرٌ کہلاتی ھے ۔ اَلنُّخْرَةُ خود ناک کو بھی کہتے ھیں ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔

نَخْرَةُ الْاَنْفِ - ناک کے اگلے حصے اور اسکی نوک کو کہتے ھیں* - ناک کا شگاف - نتھنا*** - اسی سے عَظْمٌ نَخِرٌ اس بوسیدہ ھڈی کو کہتے ھیں جو اندر سے بالکل کھوکھلی ھو چکی ھو* - قرآن کریم میں عِظَامًا نَخِرَةً (۷۹/۱۱) - بوسیدہ ھڈیوں کے لئے آیا ھے - نَخِرَتِ الشَّجَرَةُ - درخت میں سے آواز نکلی - یہ اسوقت ھوتا ھے جب درخت بوسیدہ اور کھوکھلا ھو جائے اور اس میں ھوا کے گذرنے کے لئے سوراخ ھو جائیں ، تو ھوا کے چلنے سے اس میں سے آواز نکلے** -

ن خ ل

نَخَلَهُ - اسے صاف کیا - پسند کر لیا* - نَخَلَ الدَّقِيْقَ - آٹے کو چھلنی میں چھان لیا* - اَلْمُنْخَلُ اور اَلْمُنْخُلُ - چھلنی - اَلنَّخْلُ - اَلنَّخِيْلُ (واحد نَخْلَةٌ) - کھجور کے درخت - جو درخت کھجور کے مشابہ ھوں مثلاً ناریل وغیرہ ، ان کے لئے بھی یہی لفظ بولتے ھیں (۲/۲۶۶ ؛ ۱۹/۲۵ ؛ ۵۵/۶۸) - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی منتخب کرنا اور پسند کرنا ھیں - کھجور کے درختوں کو اَلنَّخْلُ اس لئے کہتے ھیں کہ وہ تنے دار درختوں میں سب سے زیادہ بلند و برتر ھوتے ھیں -

ن د د

نِدٌّ کے معنی ھیں کسی کی مثل اور نظیر - لیکن یہ اسی مثل کے لئے بولا جاتا ھے جو کسی کے جوھر و بنیاد (Basic characteristics, or Essence) میں شریک ھو - اور چونکہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں انتشار و تنفر بھی پایا جاتا ھے ، مثلاً نَدَّ الْبَعِيْرُ - اونٹ بدکا اور جدھر منہ اٹھا چل پڑا - نَدٌّ - نفرت ، مخالفت ، اور علیحدگی کو کہتے ھیں - اس لئے نِدٌّ مد مقابل کو کہتے ھیں - یعنی ایسا شخص جو تمہاری مخالفت کرے - تم اسے ایک طرف لے جانا چاھو اور وہ تمہیں دوسری طرف کھینچے - اور جسقدر تم اسے اپنی طرف لے جانے میں زور لگاؤ اسی قدر وہ تمہیں اپنی طرف لے جانے میں کوشش کرے - چنانچہ اَلتَّنَادُّ کے معنی ھیں متفرق ھونا - ایک دوسرے سے متوحش ھونا**** - ابن فارس نے بھی کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی انتشار و افتراق کے ھیں - تَنْدِيْدٌ کے معنی ھیں کسی کی برائیوں کو اچھالنا اور شہرت دینا - لَيْسَ لَهُ نَادٌّ کے معنی ھیں اسکے پاس رزق نہیں - یعنی کوئی بدکنے والا جانور نہیں**** -

---

*تاج - **راغب - ***ابن فارس - ****تاج و محیط -

قرآن کریم میں ہے کہ اللہ تمہارے لئے رزق پیدا کرتا ہے ۔ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا (۲/۲۲) ۔ سو تم خدا کے مقابلہ میں ایسی طاقتوں کو تسلیم نہ کرو جنہیں تم (بزعم خویش) سمجھتے ہو کہ اسکی مثل و نظیر ہیں ۔ یعنی خدا کی اس بنیادی خصوصیت (رزاقیت) میں شریک ہیں ۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر ہے ۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (۲/۱۶۵) ۔ یہاں اَنْدَادٌ سے مراد ہیں تمام وہ قوتیں جو خدا کے مدمقابل ٹھہرائی جاتی ہوں اور انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہوں (حُبّ کے یہی معنی ہیں) ۔ یا وہ جاذبیتیں جن کی طرف انسان کھنچکر چلا جاتا ہے ۔ لہذا جس قوت کے سامنے آپ اس کے خوف سے جھکیں یا نفع کی امید سے اسکی طرف کھنچیں اور اس میں قانون خداوندی کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو وہ خدا کے مقابلہ میں نِدّ ہو جائیگی ۔ ایسا عقیدہ ، تصور یا نظام جس میں کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کو وہ اقتدار اور اختیار حاصل ہو جائے جو قوانین خداوندی کے لئے مخصوص ہے ، " اندادًا من دون اللہ " کا مظہر ہے ۔

[يَوْمَ التَّنَادِ کے لئے دیکھئے عنوان ن ۔ د ۔ و]

ن د م

نَدَامَةٌ ۔ اس افسوس کو کہتے ہیں جو کسی ہاتھ سے نکل جانے والے معاملہ پر رائے بدل جانے سے پیدا ہو* ۔ نیز اپنی کوتاہی پر نفس کو برا بھلا کہنا ، یا ایسا غم جس میں انسان یہ کہے کہ جو کچھ اس سے ہوگیا وہ نہ ہوا ہوتا تو اچھا تھا** ۔ پچتانا ۔ پشیمان ہونا ۔ سورۃ یونس میں ہے وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ (۱۰/۵۴) ۔ "وہ ندامت کو چھپائینگے (یا ندامت ظاہر ہو جائیگی)" ۔ نَادِمٌ ۔ جسے ندامت ہو ۔ اس کی جمع نَادِمِيْنَ ہے ۔ (۵/۳۱) ۔

اَلنَّدِيْمُ ۔ ساتھ بیٹھ کر شراب پینے والا* ۔

ن د و (ی)

اَلنَّدَى کے بنیادی معنی ہیں رطوبت ، نمی ، شبنم ۔ نَدَى الْاَرْضِ ۔ زمین کی نمی ۔ شَجَرٌ نَدْيَانٌ ۔ تر و تازہ درخت*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) اکٹھا اور یک جا ہونے (۲) رطوبت اور نمی کے ہیں ۔

---

*تاج وراغب ۔ **تاج ۔ ***تاج و محیط و راغب ۔

چونکہ جس شخص کے منہ میں رطوبت زیادہ ہو وہ بڑی اچھی باتیں کرتا ہے اور اس کی آواز بھی بلند ہوتی ہے اس لئے اَلنِّدَاءُ کے معنی خالی آواز بلند کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ یعنی محض اونچی آواز، جس میں الفاظ نہ ہوں*۔

آواز دینے کے مفہوم سے اس کے معنی ایک مجلس میں اکٹھے ہو کر باتیں کرنے کے ہو گئے۔ نَادَاہُ مُنَادَاۃً ۔ کسی کے ساتھ مجلس میں بیٹھا۔ اَلنَّدِیُّ والنَّدْوَۃُ ۔ جہاں قوم جمع ہو کر بیٹھے اور باتیں کرے۔ نیز اَلنَّدْوَۃُ جماعت کو بھی کہتے ہیں۔ دَارُ النَّدْوَۃِ ۔ مکہ میں ایک مکان تھا جس میں قریش مشورہ کے لئے جمع ہوا کرتے تھے۔ اَلنَّادِیُ ۔ قبیلہ (جسے مدد کے لئے آواز دی جاتی ہے)۔ یا ہم نشین۔ اَلنَّدٰی ۔ سخاوت اور کرم کو بھی کہتے ہیں۔ اَلْمُنْدِیَاتُ ۔ رسوا اور ذلیل کرنے والے کام جن سے پیشانیاں عرق آلود ہوجائیں*۔

قرآن کریم میں نِدَاءً (۲/۱۷۱) بمعنی آواز آیا ہے۔ اور نَادٰی یُنَادِی نِدَاءً پکارنے (آواز دینے) کے معنوں میں (۱۸ و ۱۹/۵۲) میں۔ سورۃ مریم میں اَحْسَنُ نَدِیًّا (۱۹/۷۳) کے معنی ہیں، باعتبار مجلس و اجتماع بہترین اور نہایت عمدہ۔ سورۃ العنکبوت میں نَادِیْکُمُ (۲۹/۲۹) کے معنی مجلس اور محفل و اجتماع ہیں۔ سورۃ العلق میں ہے۔ فَلْیَدْعُ نَادِیَہٗ (۹۶/۱۷)۔ وہ اپنے مصاحبوں کو یا قبیلہ والوں کو بلالے۔

تَنَادٰی ۔ باہم آوازیں دینا اور ایک دوسرے کو پکارنا۔ قرآن کریم میں ہے۔ تَنَادَوْا (۶۸/۲۱)۔ انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا۔

سورۃ المؤمن میں یَوْمَ التَّنَادِ (۴۰/۳۲) آیا ہے جس کے معنی یہ کہہ کر بتا دئے گئے ہیں کہ یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَ (۴۰/۳۳)۔ جس دن تم منہ پھیر کر بھاگ رہے ہو گے۔ یعنی جس دن تم ایک دوسرے کو مدد کے لئے پکارو گے لیکن کوئی کسی دوسرے کی مدد کے لئے نہیں آئیگا۔ سب، دہشت اور خوف کے مارے، منہ پھیرے، الٹے پاؤں بھاگ رہے ہونگے۔ مَالَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ عَاصِمٍ (۴۰/۳۳)۔ (اس دن) "تمہیں خدا کی گرفت سے (مکافات عمل سے) بچانے والا کوئی نہیں ہوگا"۔ یہ ہے یوم التناد۔ جس دن ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہو اور کوئی کسی کو لاکھ آوازیں دے، اس کی مدد کے لئے پہنچنا تو درکنار، وہ اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھے۔

*تاج و محیط و راغب۔

ن ذ ر

نَذْرٌ - (نقصان سے بچنے کے لئے) جو کچھ اپنے اوپر واجب قرار دے لیا جائے - نیز کسی شرط پر کوئی وعدہ کرنا بھی نَذْرٌ کے معنوں میں داخل ہے* - مثلاً کوئی شخص اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے کہ میرا بچہ تندرست ہو گیا تو میں یوں کروں گا، تو یہ نَذْرٌ کہلاتی ہے - راغب نے لکھا ہے کہ کسی معاملہ کے پیش آنے پر کسی ایسی چیز کو اپنے اوپر واجب کرلینا جو واجب نہ ہو** - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی ڈرنے اور ڈرانے کے لکھے ہیں* - اور یہ کہ جو کچھ واجب ہو اسے نَذْرٌ کہا جاتا ہے -

نَذِرَ بِالشَّيْءِ - کسی چیز کو جانا اوراس سے ہوشیار اور چوکنا رہا - اِنْذَارٌ کے معنی ہیں کسی کوکسی ضرر رساں یا نقصان دہ بات کے انجام سے قبل از وقوع آگاہ (Warn) کر دینا اوراس کے خوفناک نتائج سے ڈرانا - لشکر سے آگے آگےجو ہراول دستہ جاتا تھاتا کہ دشمن کی نقل و حرکت کو بھانپ کر اپنے لشکرکو آگاہ کرتا رہے اسے نَذِيْرَةُ الْجَيْشِ کہتے تھے - اَلنَّذِيْرُ - آگاہ کرنے والا - نیز کمان کی آواز (کیونکہ اسے سن کر شکارخطرہ سے آگاہ ہوجاتا ہے) - نیز بڑھاپے کو بھی نَذِيْرٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ آنے والی موت سے آگاہ کر دیتا ہے* -

لہذا نَذِيْرٌ کے معنی ہیں غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دینے والا - خواہ وہ کوئی انسان ہو یا واقعہ - اس کی جمع نُذُرٌ آتی ہے (۵۳/۵۶) - (برخلاف بَشِيْرٌ کے جو صحیح روشِ زندگی کے خوشگوار نتائج کی خوشخبری دیتا ہے) -

قرآن کریم میں نَذْرٌ (نُذُوْرٌ) بمعنی واجبات کئیایک مقام پر آیا ہے - (مثلاً ۲۲/۲۹ و ۷۶/۷) - یعنی وہ امور جواپنے آپ پر واجب قرار دے لئے جائیں - اِنْذَارٌ (تباہ کن نتائج سے آگاہ کرنے) کے لئے متعدد مقامات پر آیا ہے - (مثلاً ۳۶/۱۱) - لیکن قرآن کریم نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ اِنْذَار (Warning) انہی کو فائدہ دے سکتی ہے جن میں زندگی کے آثار موجود ہوں - لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۶/۷۰) - جن میں زندہ رہنےکی صلاحیت باقی نہ ہو انہیں ان نتائج سے آگاہ کرنا یا نہ کرنا یکساں ہوتا ہے (۲/۶) - اِنْذَارٌ اُسی کے لئے ہے جو اپنے اوپر کچھ واجب کرلے اور اسے ادا نہ کرے - اُس سے کہا جا سکتا ہے کہ عدمِ ادائیگیٔ فریضہ سے کیا نقصان

*تاج - **راغب -

ہوگا۔ لیکن جس نے انسانی فرائض کو اپنے اوپر واجب ہی نہیں سمجھا، اُسے اُس کی روش کے تباہ کن نتائج سے متنبہ کرنا کیا نتیجہ خیز ہوسکتا ہے؟ یا مثلاً جو شخص خود کشی پر آمادہ ہو اس سے یہ کہنا کہ دریا میں نہ کودنا، ڈوب کر مر جاؤ گے، بے معنی ہے۔ دریا کی ہلاکت انگیزیوں سے انتباہ اسی کے لئے مفید ہو سکتا ہے جو ہلاکت سے بچنا چاہے۔ (اسے متقی کہتے ہیں)۔

نَذِیْرٌ کی جمع نُذُرٌ آتی ہے (۵۴/۵ و ۵۳/۵۶)۔ مُنْذِرٌ۔ آگاہ کرنے والا۔ اس کی جمع مُنْذِرِیْنَ ہے (۲۶/۱۹۴ و ۳۷/۷۲)۔ مُنْذَرٌ۔ جسے آگاہ کیا جائے۔ اس کی جمع مُنْذَرِیْنَ ہے (۳۷/۷۳)۔

قرآن کریم نے حضرات انبیاء کرامؑ کے متعلق کہا ہے کہ وہ بشیر اور نذیر ہوتے ہیں۔ ان حضراتؑ کا فریضہ یہ تھا کہ وہ (از روئے وحی) لوگوں کو بتائیں کہ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے نتائج کس قدر خوشگوار ہونگے (اسے خوشخبری یا بشارت کہتے ہیں) اور ان کی خلاف ورزی کا انجام کس قدر ہلاکت آفریں ہوگا (یہ تنبیہ یا انذار کہلاتی ہے)۔ جو لوگ زندگی کی ہلاکتوں سے بچنا چاہتے (انہیں متقین کہا جاتا ہے) وہ ان کی انذار سے فائدہ اُٹھا کر، صحیح روش اختیار کر لیتے۔ جو ان ہلاکتوں کی پرواہ نہ کرتے، وہ اس انذار پر کان نہ دھرتے۔ انہی کے متعلق کہا گیا ہے کہ سَوَاءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۲/۶)۔ آج تبشیر و انذار کا فریضہ قرآن کریم ادا کرتا ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں بدلائل و شواہد بتا دیا ہے کہ فلاں روشِ زندگی کا نتیجہ کیا ہوگا اور فلاں کا انجام کیا۔ اور اس کے بعد کہہ دیا ہے کہ تم جونسی روش جی چاہے اختیار کرلو۔

ن ز ع

نَزَعَ۔ کسی چیز کو اس کی جگہ سے اکھیڑ کر، نکال کر، الگ کر دینا۔ ہٹا دینا۔ نیز کھینچنے کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اس معنی میں اِنْتَزَعَ بھی آتا ہے۔ نیز اِنْتَزَعَ لازم بھی ہے۔ یعنی اس کے معنی اکھیڑنا اور اکھڑ جانا دونوں ہی ہیں۔ نَزَعَ فِی الْقَوْسِ۔ کمان کو کھینچا۔ اِنْتَزَعَ الشَّیْئَ۔ وہ کسی چیز سے رکا اور باز رہا۔

سورۃ اعراف میں ہے یَنْزِعُ عَنْھُمَا لِبَاسَھُمَا (۷/۲۷)۔ ان سے ان کا لباس کھینچ لیا یا اتروا دیا۔ سورۃ معارج میں ہے۔ نَزَّاعَۃً لِلشَّوٰی

(۷۹/۱) - زور سے کھینچنے والی - کھینچکر نکال لینے والی - وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا (۷۹/۱) - کھینچنے والے - ابن درید نے ابو عبیدہ کے حوالہ سے النّٰازِعٰتُ اور اَلنّٰاشِطٰتُ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ وہ تارے ہیں جو ایک مقام سے نکل کر دوسرے مقام کی طرف جاتے اور ایک جگہ ڈوب کر دوسرے مقام میں طلوع ہوتے ہیں* - مولانا عبید اللہ سندھی کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ انقلابی جماعتیں ہیں جو ان صلاحیتوں اور قوتوں کو جو نیچے دب کر رہ گئی ہوں ، کھینچ کر اوپر لاتی ہیں اور اس طرح معاشرہ کو پھر سے صالح بنا دیتی ہیں - (المقام المحمود - صفحہ ۱۷)

نَزْعٌ - چھین لینا - بمقابلہ اِیْتَاءٌ (دینا) (۳/۲۵) - سورۃ الطور میں جنت کی زندگی کے ضمن میں فرمایا - یَتَنَازَعُوْنَ فِیْھَا کَاْسًا (۵۲/۲۳) - ''وہ اس میں ایک دوسرے سے پیالہ لینگے'' - اگر اس کے عام معنی لئے جائیں تو یہ نقشہ ہے ان دوستانہ صحبتوں کا جس میں پورے خلوص و محبت کے ساتھ بے تکلفی سے چھین جھپٹ ہوتی ہے اور لطف صحبت دوبالا ہو جاتا ہے (لیکن اس میں لغویت کا شائبہ تک نہیں ہوتا - جیسا کہ اس سے اگلی آیت سے ظاہر ہے) - علاوہ ازیں ، تَنَازُعٌ کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ''لو- یہ پیالہ تم پیؤ'' - وہ جواب میں کہتا ہے ''نہیں - تم پیؤ'' - یہ باہمی پیش کش اور اصرار و انکار ایسا حسین تنازع ہے جس کی داد اہل ذوق ہی دے سکتے ہیں - یہ ہے جنتی معاشرہ میں اربابِ ذوق و محبت کی مخلصانہ محفلوں کا رنگ -

اور اگر اس سے ذرا بلند ہوکر دیکھا جائے تو یَتَنَازَعُوْنَ فِیْھَا کَاْسًا کے معنی یہ ہونگے کہ یہ (جماعتِ مؤمنین کے افراد) ایک دوسرے سے زندگی کی مئے حیات بخش کا پیالہ لینگے - جنتی زندگی ، انفرادی زندگی نہیں جس میں ہر ایک کو نفسا نفسی پڑی ہوتی ہے - وہاں تمام افراد ایک دوسرے سے وہ سامان لیتے ہیں جو ان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو برو مندی عطا کرتا ہے - لیکن اگر ہر شخص خود غرض بن جائے اور ہر ایک کی نیت یہ ہو کہ دوسرے سے سب کچھ چھین کر خود ہی رکھ لے ، تو یہ تَنَازُعٌ وہ ہے جس سے سختی سے روکا گیا ہے (۸/۴۶) - یعنی جنتی معاشرہ میں یہ سب کچھ بطیبِ خاطر ہوگا ، اور ایک دوسرے کی نشو و نما کی خاطر - لیکن غلط معاشرہ میں ہر فرد کی نیت یہ ہوگی کہ میں دوسرے سے سب کچھ چھین جھپٹ لوں - اس مفہوم کے اعتبار سے اَلنَّزَائِعُ ان ہواؤں کو کہتے ہیں جو اپنی صحیح سمتوں

---

*تاج -

سے ہٹ کر چلتی ہیں***۔ (اور ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں) ۔ یہاں سے تنازعہ کے معنی واضح ہیں ۔ اسلامی معاشرہ میں یہ ٹکراؤ نہیں ہوتا (۸/۴۶) ۔ بلکہ باہمی ہم آہنگی اور اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ (۳/۱۰۳) کی زندگی ہوتی ہے ۔

ن ز غ

نَزۡغٌ کے اصل معنے چبھونے ، کھونپنے اور طعن کرنے کے ہیں ، اور بقیہ تمام معانی اسی سے ماخوذ ہیں*۔ چنانچہ پھر اس کے معنے آتے ہیں کسی کام میں خرابی پیدا کرنے کے لئے اُس میں گھسنا**۔ نَزَغَ بَیۡنَہُمۡ نَزۡغًا ۔ ان کے درمیان فساد ڈال دیا ۔ یا ایک کو دوسرے کے خلاف اُبھار دیا***۔ ابن فارس نے بھی اسکے بنیادی معنی لکھے ہیں ۔ سورۃ یوسف میں ہے مِنۡ بَعۡدِ اَنۡ نَّزَغَ الشَّیۡطٰنُ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَ اِخۡوَتِیۡ (۱۲/۱۰۰) ۔ بعد اس کے کہ شیطان (حسد کے جذبہ) نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال دیا ۔ سورۃ اعراف میں ہے ۔ وَ اِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ (۷/۲۰۰)۔ جب (انفرادی مفاد پرستی کا جذبہ) کوئی ایسی بات دل میں ڈالے جس سے فساد کا اندیشہ ہو ۔ یا ایک کو دوسرے کے خلاف ابھارنے کا جذبہ . . . نیز (۴۱/۳۶)۔ اَلۡمِنۡزَغَۃُ ۔ اس لوہے کی سلاخ کو کہتے ہیں جس سے روٹی پکانے والا روٹیوں میں چھید کرتا ہے***۔ اور روٹی کو اس میں اٹکا کر تنور سے باہر نکالتا ہے ۔

ن ز ف

نَزۡفٌ ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے ختم ہو جانے اور منقطع ہو جانے کے ہیں ۔ نَزَفَ مَآءَ الۡبِئۡرِ ۔ اس نے کنویں کا تمام پانی کھینچ کر نکال لیا ۔ نَزِفَتِ الۡبِئۡرُ ۔ کنواں پانی سے خالی ہو گیا ۔ اسی سے نُزِفَ فُلَانٌ کے معنی ہوتے ہیں فلاں آدمی کی عقل جاتی رہی ۔ وہ مست اور بے ہوش ہو گیا ۔ اَنۡزَفَ الرَّجُلُ ۔ آدمی مست اور بے ہوش ہو گیا ۔ اس کی عقل کا چشمہ خشک ہو گیا۔ اَلۡمِنۡزَفَۃُ ۔ ڈھیکلی ۔ وہ چھوٹا ساڈول جو ایک لمبی لکڑی کے سرے میں باندھا جاتا ہے، پھر اس لکڑی کو درمیان سے ایک دوسری زمین میں گڑی ہوئی لکڑی سے باندھا جاتا ہے اور اس سے پانی نکالا جاتا ہے****۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَ لَا ہُمۡ عَنۡہَا یُنۡزَفُوۡنَ (۳۷/۴۷) ۔ ''شرابِ جنت'' سے وہ بد مست نہیں ہونگے۔ سَکۡرَانٌ نَزِیۡفٌ ۔ وہ بد مست آدمی جس کی عقل بدمستی کی وجہ سے جاتی رہی ہو**۔

*محیط ۔ **راغب ۔ ***تاج ۔ ****تاج و محیط ۔

واضح رہے کہ سورۃ الصّٰفّٰت میں وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ آیا ہے (۳۷/۴۷) جو مجہول ہے ۔ اور سورۃ واقعہ میں وَلَا يُنْزِفُوْنَ (۵۶/۱۹) آیا ہے جو معروف ہے ۔ اس کے معنی یہ ہونگے کہ جنت کی شراب کے پیالے (یا نہریں) کبھی خشک نہیں ہوں گی ۔ یا اس شراب کے خواص (لذت و سرور) میں کمی واقع نہیں ہوگی ۔

زندگی جوئے روان است و روان خواهد بود
این مئے کہنہ جوان است و جوان خواهد بود

ن ز ل

نَزَلَ ۔ بلندی سے نیچے کی طرف آنا ۔ چنانچہ قرآن کریم میں نُزُوْلٌ ۔ عُرُوْجٌ کے مقابل میں آیا ہے (۳۴/۲) ۔ نُزُلٌ ۔ منزل کو کہتے ہیں ۔ نیز جن چیزوں سے مہمان کی تواضع کی جائے ۔ اس کے معنی برکت اور عطاء کے بھی آتے ہیں (۳/۱۹۷ و ۱۸/۱۰۲)۔ نیز ۔ نَزْلٌ کھیتی کے بڑھنے، پھولنے پھلنے کو کہتے ہیں ۔ اَرْضٌ نَزِلَةٌ اُس زمین کو کہتے ہیں جس میں بڑی فراوانی سے کھیتی اُگے ۔ اَلنَّزْلُ بارش کو کہتے ہیں ۔ نَزْلَةٌ ۔ ایک مرتبہ کے نزول کے معنوں میں آتا ہے (۵۳/۱۳) ۔ نَزِيْلٌ مہمان کو کہتے ہیں*۔ مَنْزِلٌ ۔ اترنے کی جگہ ۔ جمع مَنَازِلُ (۳۶/۳۹) ۔

اَنْزَلَ اور نَزَّلَ میں عام طور پر فرق یہ ہے کہ تَنْزِيْلٌ (نَزَّلَ) آہستہ آہستہ اتارنے کو کہتے ہیں ، اور اِنْزَالٌ میں یہ شرط نہیں (لطائف اللغۃ)۔ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً (۲۶/۴۳) ۔ بادلوں سے پانی ایک دم نیچے نہیں گر پڑتا ، آہستہ آہستہ بارش کی شکل میں برستا ہے ۔ تَنْزِيْلٌ (۲۶/۱۹۲)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلتَّنْزِيْلُ کے معنی کسی چیز کو ترتیب سے رکھنے اور اس کے مقام پر رکھنے کے ہیں ۔

لیکن قرآن کریم میں اس کے معنی ''اوپر سے نیچے اتارنے'' ہی کے نہیں ۔ اس کے معنی عطا کرنے کے بھی ہیں ۔ (وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ (۵۷/۲۵)) ۔ ہم نے لوہا عطا کیا ۔ نیز مختلف چیزوں کے بر آمد ہونے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے ۔ سورۃ حجر میں ہے کہ ہمارے پاس مختلف چیزوں کے خزانوں کے خزانے رکھے ہیں ۔ وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵/۲۱) ۔ لیکن ہم انہیں ایک مناسب اندازے کے مطابق برآمد کرتے رہتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ جو چیزیں کائنات میں موجود نہیں ان کے نازل کرنے کے معنے یہ ہونگے

*تاج ۔

کہ انسان اپنی تحقیقات اور سعی و کاوش کے ذریعے انہیں حاصل کرتا جائے۔ لہذا ان مقامات میں اِنْزَال کے معنی ان اسباب کا بہم پہنچانا ہے جن سے انسان ان چیزوں کو حاصل کر سکتا ہے ۔ ان چیزوں کے ذخیرے کائنات میں موجود ہیں ۔ ان کا حصول ، انسان کی محنت پر منحصر ہے ۔

قرآن کریم کے لئے تَنْزِیْل (نازل کرنے) کا جو لفظ آیا ہے تو اس سے مفہوم یہ ہے کہ وحی ، رسول کے اپنے ذہن کی پیدا کردہ (Subjective) چیز نہیں ہوتی ۔ بلکہ یہ اسے خارج سے (Objectively) ملتی ہے۔ وحی ایک خارجی حقیقت ہے، انسان کی اپنی پیدا کردہ نہیں ۔ اس لئے وحی کسب و ہنر سے حاصل نہیں ہوسکتی ۔ یہ صرف منزل من اللہ (خدا کی طرف سے عطا کردہ) ہوتی ہے ۔ مادی کائنات میں انسان اپنی سعی و کاوش سے چیزوں کے اوپر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھاتا ہے ۔ اسے (Discovery) کہتے ہیں ۔ لیکن وحی میں حقیقت خود اپنے آپ کو نبی پر منکشف (Reveal) کرتی ہے ۔ اس لئے اس کے لئے اِنْزَال کا لفظ آیا ہے ۔ یعنی انسان خود بلند ہوتا ہوا حقیقت کے چہرے سے پردہ کشائی نہیں کرتا بلکہ حقیقت خود نیچے اتر کر اس کے سامنے بے نقاب ہو جاتی ہے ۔ یہ چیز وحی کے ساتھ مختص ہوتی ہے ۔ اور چونکہ وحی کا سلسلہ رسول اللہ کی ذات پر ختم ہوگیا ، اس لئے اب انسانوں کے پاس عِلم کے دو ہی ذریعے رہ گئے۔ ایک قرآن کریم کے اندر محفوظ حقائق اور دوسرے خارجی کائنات میں انسانی علم و عقل کی رو سے منکشف کردہ حقائق ۔ ان کے علاوہ کوئی تیسرا ذریعہ علم انسان کے پاس نہیں ۔ باطنی کشف کا دعویٰ در حقیقت وحی ہی کا دعویٰ ہے ، فرق صرف الفاظ کا ہے۔ قرآن کریم میں ''کشف و الہام'' کا کوئی ذکر نہیں ۔ اس لئے اس قسم کا دعویٰ قرآن کریم کے خلاف ہے ۔ انسان میں بعض قوتیں ایسی ہیں (مثلاً قوتِ خیالی یا قوت ارادی) کہ اگر خاص مشقوں کے ذریعے ان کی نشو و نما (Development) کرلی جائے تو ان میں ایسی خاصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو دوسرے لوگوں میں نہیں ہوتیں ۔ اسے لوگ کشف و کرامات سمجھنے لگتے اور ''روحانی قوت'' کا مظاہرہ قرار دیتے ہیں ۔ حالانکہ ''روحانیت'' سے اس کا کچھ تعلق نہیں ۔ نہ ہی دین سے کوئی واسطہ ۔ اسلئے کہ جو انسان بھی چاہے وہ ان مشقوں کے ذریعے ایسی قوت حاصل کرسکتا ہے، خواہ وہ مشرک ، کافر اور دہریہ بھی کیوں نہ ہو۔ دین کا مقصود اس قسم کی قوتیں پیدا کرنا نہیں ، آدمی کو انسان بنانا ہے ۔

مُنَزِّل ۔ اوپر سے نیچے اتارنے والا ۔ نازل کرنے والا ۔ عطا کرنے والا ($\frac{۵}{۱۱۵}$)۔ نیز مُنْزِل ($\frac{۲۹}{۲۳}$)۔ مُنَزَّل ۔ اتارا ہوا ($\frac{۶}{۱۱۵}$)۔ نیز مُنْزَل

اتارا ہوا (٣/١٢٣) - یہ ، ظرف مکان (جگہ) یا زمان (وقت) - اور مصدر کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے - رَبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَکًا (٢٣/٢٩) - "اے میرے رب مجھے برکت والا اتارنا اتارئیو" - سورۃ یوسف میں مُنْزِلٌ بمعنی مہمان نواز آیا ہے - وَ اَنَا خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ (١٢/٥٩) - "اور میں بہت اچھا مہمان نواز ہوں" -

تَنَزُّلٌ - آہستہ آہستہ اترنا - اسی سے تَنَزَّلُ (٩٧/٤) میں ہے -

ن س أ

نَسْأٌ - جھڑک دینا - ہانکنا - پیچھے ہٹا دینا - نَسَأَ الشَّیْئَ - کسی چیز کو پیچھے ہٹا دینا - مؤخر کر دینا - اَنْسَأَهٗ - اُسے حوض سے ہٹا دیا - پیچھے کر دیا - نَسَأْتُهُ الْبَیْعَ - میں نے بیع میں اس سے ادھار کا معاملہ کیا اور اسطرح رقم کے لین دین کو مؤخر کر دیا - اَلنَّسِیْئَةُ - تاخیر - پیچھے کرنا * - اسی جہت سے ادھار کے لئے بھی بولا جاتا ہے کہ اس میں قیمت کی ادائیگی مؤخر کر دی جاتی ہے - بَاعَهٗ بِنَسِیْئَةٍ - اس کے ساتھ ادھار کا سودا کیا - (یہ اس قسم کے سودے کو کہتے ہیں جس میں قیمت یا چیز بعد میں دی جائے) - اَلْمِنْسَأَةُ - لاٹھی ، جس سے جانوروں کو پیچھے ہٹایا جاتا ہے (٣٤/١٤) - ابن فارس نے بھی یہ تمام معانی دئے ہیں -

سورۂ توبہ میں ہے اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْکُفْرِ (٩/٣٧) - "یقیناً نسئی کفر میں ایک اضافہ ہے" - اَلنَّسِیْٓءُ - عربی معاشرہ کی ایک خاص چیز تھی - ویسے تو قرآن کریم نے یہ کہکر اسکی تشریح کر دی ہے کہ یُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ یُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا (٩/٣٧) - "ایک سال اسے حلال قرار دیتے ہیں - ایک سال اُسے حرام کر دیتے ہیں" - لیکن اس کی تفصیل کا سمجھنا ضروری ہے - عربوں میں قمری مہینے رائج تھے - رَبِیْعٌ - جُمَادَیٰ - رَمَضَانُ - وغیرہ مہینوں کے نام ہی بتاتے ہیں کہ ان کا تعلق موسموں سے تھا - لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہر سال وہی مہینہ اُسی موسم میں صرف اُسی صورت میں آسکتا ہے جب سال شمسی ہو - قمری ہونے کی صورت میں ایک ہی مہینہ مختلف موسموں میں آتا رہتا ہے - عرب اسے پسند نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ (دیگر مہینوں کے علاوہ) حج کی تقریب ایک ہی موسم میں ہو - اس کے لئے (یہودیوں کے اتباع میں) کرتے یہ تھے کہ ہر تیسرے سال ایک مہینہ خالی چھوڑ دیتے تھے [زیادہ صحیح الفاظ میں آٹھ سال میں تین مہینے -

---

*تاج -

کیونکہ قمری سال شمسی سال سے قریب گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے] اور اسطرح اپنے مہینوں کو پھر موسموں کے مطابق کر لیتے تھے ۔ یہ مہینہ (جسے خالی چھوڑتے تھے) بالعموم ذوالحجہ کے بعد ہوتا تھا ۔ اس ''آگے پیچھے کرنے'' کے عمل کو وہ نَسِیْئٌ کہتے تھے ۔ یعنی سال کو ایک مہینہ پیچھے ہٹا لینا ۔

نیز ان کے ہاں سال میں چار مہینے (رجب ۔ ذی قعدہ ۔ ذوالحجہ اور محرم) واجب الاحترام مہینے تھے جن میں لوٹ مار اور جنگ و قتال منع تھا ۔ کیلنڈر کا یہ اہتمام بنو کنانہ کی ایک جماعت کے سپرد تھا جنہیں نَسَأَةٌ کہتے تھے ۔ یہ نَسَأَةٌ کبھی تو ان محترم مہینوں میں تغیر و تبدل کر دیتے ۔ مثلاً حج کے بعد محرم کے متعلق کہدیتے کہ اس سال اسکی بجائے ربیع الاول کا مہینہ محترم ہوگا۔ وقس علی ھذا ۔ اور کبھی اس تیسرے سال کے خالی مہینے کو آگے پیچھے کر دیتے ۔ اس سے معاشرہ کے نظام میں گڑ بڑ ہو جاتی اور جن لوگوں کو یہ پہلے بتا دیتے کہ اس سال یوں کیا جائیگا وہ اس سے بڑا فائدہ اٹھا لیتے ۔ اس کو بھی نَسِیْءٌ کہتے تھے ۔

قرآن کریم نے ان دونوں قسموں کی نَسِیْءٌ کو ختم کر دیا ۔ ایک طرف اس نے اعلان کر دیا کہ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا (۹/۳۶) ۔ '' قوانین خداوندی کی رو سے مہینوں کی تعداد بارہ ہے ''۔ اس لئے ہر تیسرے سال ایک مہینے کا خالی چھوڑ دینا بے معنی بات ہے ۔ چنانچہ اس اعلان (۱۰ ھ) کے بعد عربی کیلنڈر میں سال کے بارہ مہینے قرار پا گئے ۔ اور مہینے قمری رہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ قمری سال کے مہینوں کے نام تو وہی ہیں ، لیکن وہ اب التزاماً اُن موسموں میں نہیں آتے جن کی نسبت سے ان کے نام رکھے گئے تھے۔ (مثلاً رَمَضَانُ ۔ رَمْضٌ سے ہے جسکے معنی شدت کی گرمی ہیں ۔ لیکن اب رمضان گرمی میں بھی آتا ہے اور سردی میں بھی)۔

اگر یہ کیلنڈر قمری کی جگہ شمسی ہو تو پھر ہر مہینہ ہمیشہ اُسی موسم میں آتا رہے ۔ اور سال کے بارہ مہینے بھی پورے ہو جاتے ہیں ۔ یعنی جس مدت میں زمین سورج کے گرد اپنا ایک دور ختم کرتی ہے اسکے بارہ حصے ہو جاتے ہیں ۔ واضح رہے کہ قرآن کریم کی رو سے شمسی اور قمری دونوں میں سے جونسا کیلنڈر جی چاہے اختیار کر لیا جاسکتا ہے ۔ (دیکھئے ۶/۹۶ ؛ ۵/۱۰ ؛ ۱۲/۱۷) ۔

اس نَسِیْءٌ کے علاوہ جس کا ذکر اوپر آیا ہے ، قرآن کریم نے اس نَسِیْءٌ کو بھی ختم کر دیا جس کی رو سے وہ قابل احترام مہینوں میں تقدم و تاخر کر دیا کرتے تھے ۔ اسے قرآن کریم نے زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ (۹/۳۷) قرار دیدیا ۔ اسطرح معاشرہ محکم بنیادوں پر استوار ہو گیا ۔

قرآن کریم کا یہ اصولی قانون اب بھی موجود ہے کہ اگر کہیں جنگ چھڑ جائے تو وہ مسلسل نہ چلتی رہے بلکہ بین الاقوامی قانون کی رو سے یہ طے کر دیا جائے کہ فلاں فلاں وقت کے لئے جنگ کو روک دینا ہوگا۔ اس التواء اور قطع تسلسل کے بڑے فائدے ہیں۔ اور اکثر صورتوں میں ہوسکتا ہے کہ اس سے وہ جنگ ختم ہی ہو جائے۔ اس التواء کے عرصہ کا احترام تمام اقوام کے لئے ضروری ہوگا اور کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ التواء کے وقت کو مقدم یا موخر کر سکے۔ اس لئے کہ یہ نَسِیْئیٌ ہوگی جسے قرآن کریم نے کفر، یعنی معاہدات کے عملی انکار، سے تعبیر کیا ہے۔

ن س ب

اَلنَّسَبُ۔ اَلنِّسْبَۃُ۔ قرابتداری جو خصوصیت کے ساتھ آباو اجداد میں ہو۔ باپ یا ماں کی طرف سے قرابتداری۔ یہ اسکے اصل معنی ہیں۔ پھر، دو ایسی چیزوں کے لئے جو کسی اعتبار سے بھی باہم مشابہت اور تعلق رکھتی ہوں ان کے اس تعلق کے اظہار کے لئے بھی اَلنِّسْبَۃُ بولدیتے ہیں۔ اَلنَّیْسَبُ۔ چیونٹیاں، جبکہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے چل رہی ہوں۔ چیونٹیوں کا راستہ*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز سے اتصال ہیں۔ نَسَبٌ۔ خاندانی اتصال کو کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں نَسَبًا۔ بمعنی قرابتداری (۲۵/۵۴) میں آیا ہے۔ اور (اسکی جمع) اَنْسَابٌ (۲۳/۱۰۱) میں۔

ن س خ

نَسْخٌ کے معنی ہیں ایک چیز کو مٹا دینا اور اسکی جگہ دوسری چیز کو لے آنا۔ دوسری چیز کو اسکے قائم مقام کر دینا (ابن فارس)۔ نَسَخَتِ الشَّمْسُ الظِّلَّ۔ آفتاب نے سایہ کو ہٹا دیا اور اسکی جگہ روشنی لے آیا۔ یا کسی چیز میں تبدیلی کر دینا۔ نَسَخَتِ الرِّیْحُ آثَارَ الدِّیَارِ۔ ہوا نے آبادی کے آثار (نشانات و علامات) کو تبدیل کر دیا۔ (یعنی وہ کھنڈرات وغیرہ جن سے آبادی کا پتہ نشان ملتا تھا انہیں ریت سے ڈھانک کر دگرگوں کر دیا)۔ نَسَخَ الْکِتَابَ۔ ایک کتاب کو نقل کرکے اس جیسی دوسری کتاب مرتب کر لینا۔ اسی سے اَلنُّسْخَۃُ۔ منقول (Copied) کتاب کو کہتے ہیں**۔ قرآن کریم میں ہے اِنَّا کُنَّا نَسْتَنْسِخُ (۴۵/۲۹)

*تاج و راغب۔ **تاج۔ محیط و راغب۔

'' ہم لکھوا لیتے تھے'' ۔ مٹا دینے یا زائل کر دینے کے معنوں میں یہ لفظ (٢٢/٥٢) میں آیا ہے ۔ فَيَنْسَخُ اللهُ ۔ '' اللہ مٹا دیتا ہے'' ۔

لہذا نَسْخٌ کے بنیادی معنی ہیں ایک چیز کی جگہ دوسری چیز لے آنا۔ اس لفظ کی اہمیت اس لئے ہے کہ ہمارے ہاں ناسخ و منسوخ کا عقیدہ چلا آرہا ہے اور اسے دین کے مہمات میں سے سمجھا جاتا ہے ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہے بھی بہت اہم ۔ اس لئے کہ اس کا غلط مفہوم دِین کو اسکی جڑ سے اکھیڑ دیتا ہے ۔ اور اسکا صحیح مفہوم قرآن کو خدا کے دین کا آخری اور واحد ضابطہ ثابت کر دیتا ہے ۔

ناسخ و منسوخ کا مروجہ مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم میں متعدد آیات ایسی ہیں (بعض کے نزدیک ان کی تعداد پانچ سو تک ہے) جو پڑھی تو جاتی ہیں لیکن جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے ۔ پھر سن لیجئے کہ (اس عقیدہ کے مطابق) قرآن کریم میں پانچ سو کے قریب ایسی آیات ہیں جنہیں محض '' ثواب'' کی غرض سے پڑھ لیا جاتا ہے لیکن ان میں جو احکام ہیں وہ سب منسوخ ہو چکے ہیں ۔ بعض احکام قرآن کریم کی دوسری آیات نے منسوخ کر دئے ہیں اور بعض احکام احادیث نے منسوخ کر دئے ہیں ۔ اسکے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی ہے کہ بعض آیات ایسی بھی ہیں جو قرآن کریم کے اندر موجود نہیں لیکن ان کا حکم موجود ہے ۔ (مثلاً آیۂ رجم ۔ یعنی زانی کو سنگسار کرنے کے حکم والی آیت) ۔ اس عقیدہ کی رو سے قرآن کریم کی شکل یوں بنتی ہے کہ :—

(١) قرآن کریم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کے احکام تو منسوخ ہو چکے ہیں لیکن جن کی تلاوت ہوتی رہتی ہے ۔ اور

(٢) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن کریم کے اندر تو نہیں لیکن انکا حکم موجود ہے ۔ دوسری قسم کی آیات کے لئے تو دلیل صرف روایات کی ہے ۔ لیکن پہلی قسم کی آیات کے لئے خود قرآن کریم ہی کی ایک آیت سے دلیل لائی جاتی ہے ۔ اور وہ آیت یہ ہے ۔

> مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ۔ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (٢/١٠٦)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے —

> ہم جس آیت کو بھی منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی اور آیت لے آتے ہیں ۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے ۔

اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا نے قرآن کریم میں کسی بات کا حکم دیا ۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اس نے سوچا کہ اس حکم کو منسوخ کر دینا چاہئے ۔ چنانچہ اس نے ایک اور آیت نازل کر دی جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا ۔ یہ حکم اس سے پہلے حکم سے بہتر ہوتا تھا ۔ واضح رہے کہ اس نئی آیت میں یہ کہیں نہیں بتایا جاتا تھا کہ اس سے فلاں آیت کو منسوخ سمجھا جائے ۔ اس لئے قرآن کریم میں منسوخ آیات بھی اُسی طرح سے موجود ہیں اور ناسخ آیات بھی ۔ اللہ نے ان کے متعلق کہیں نہیں بتایا کہ فلاں آیت منسوخ ہے فلاں آیت سے ۔ یہ تعین بعد میں روایات کی رو سے یا مفسرین کے اپنے خیالات کی رو سے کیا گیا ۔ چنانچہ ان آیات کی تعداد ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی ۔ حتکہ شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک ان کی تعداد صرف پانچ ہے ۔

باقی رہا " فراموش کرا دینے " کا سوال ۔ سو اس کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آیات نازل ہوتی تھیں لیکن رسول اللہؐ (معاذ اللہ) انہیں بھول جاتے تھے ۔ تو پھر انہی جیسی آیات اور نازل ہو جاتی تھیں ۔ یہ مراد ہے آو نُنْسِہَا سے ۔ اسکی دلیل میں یہ آیۃ پیش کی جاتی ہے ۔ سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰی اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہُ . . . . . (۸۷/۶-۷) جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ۔ ہم تجھے پڑھائینگے سو تو نہ بھولیگا ، ہاں مگر جو اللہ چاہتا ہے ۔

اس عقیدہ کی رو سے آپ دیکھئے کہ خدا ، قرآن کریم اور رسول اللہؐ کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے ۔ خدا کا تصور اس قسم کا کہ وہ آج ایک حکم صادر کرتا ہے لیکن بعد کے حالات بتا دیتے ہیں کہ وہ حکم ٹھیک نہیں تھا اس لئے وہ قرآن کریم کے اُس حکم کو منسوخ کرکے اُسکی جگہ دوسرا حکم دے دیتا ہے ۔

قرآن کریم کے متعلق یہ کہ اس میں بے شمار آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی تلاوت برابر ہو رہی ہے ۔ اور یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی ناسخ ۔ اسے لوگوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود اس کا فیصلہ کریں کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی اسکی ناسخ ۔

اور رسول اللہؐ کے متعلق یہ تصور کہ حضورؐ خدا کی طرف سے نازل کردہ قرآنی آیات کو بھی بھول جایا کرتے تھے ۔ یا للعجب !

ناسخ و منسوخ کا صحیح مفہوم آگے آئے گا ۔ سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰی کے صحیح مفہوم کے لئے عنوان ن ۔ س ۔ ی دیکھئے جہاں اسکی تشریح کر دی گئی ہے ۔

اب دیکھئے اس آیت (مَا نَنْسَخْ ....) کا صحیح مفہوم۔ پیچھے سے سلسلہ کلام یوں چلا آتا ہے کہ اہل کتاب (بالخصوص یہود) قرآن کریم اور رسالت محمدیہ پر مختلف اعتراضات کرتے ہیں (قرآن کریم ان اعتراضات کا جواب دیتا ہے)۔ اسی سلسلہ میں ان کا ایک اعتراض یہ بھی تھا (اور یہ اعتراض بڑا اہم تھا) کہ جب خدا نے انبیاء سابقین (مثلاً حضرت موسیٰ وغیرہ) پر اپنے احکام نازل کر دئے تھے، اور وہ احکام تورت وغیرہ میں موجود ہیں۔ تو پھر ان کی موجودگی میں اس نئے رسول اور نئی کتاب کی ضرورت کیا تھی؟ اس آیت میں اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ خدا کی طرف سے سلسلہ رشد و ہدایت حضرت نوح کے زمانے سے مسلسل چلا آرہا ہے۔ لیکن اس کی صورت یہ رہی ہے کہ مختلف انبیاء کی وساطت سے جو وحی بھیجی جاتی تھی ان میں ایک حصہ ان احکامات پر مشتمل ہوتا تھا جو وقتی ہوتے تھے اور ان کا تعلق خاص اسی قوم سے ہوتا تھا جس کی طرف وہ احکام بھیجے جاتے تھے۔ اور انہیں انہی حالات میں نافذ العمل رہنا ہوتا تھا جو اس زمانے کے تقاضے سے پیدا ہوئے تھے۔ بعد میں، جب وہ قوم نہ رہتی یا زمانے کے تقاضوں سے وہ حالات بدل جاتے تو ایک اور رسول آجاتا اور وہ ان احکام کی جگہ دوسرے احکام لے آتا۔ اسطرح یہ جدید وحی اُس سابقہ وحی کی قائمقام (ناسخ) بن جاتی۔ یہ سلسلہ شروع ہی سے ایسا چلا آرہا ہے۔ چنانچہ تم خود دیکھ رہے ہو کہ تورت کے کتنے احکام ہیں جنہیں حضرت عیسیٰ نے آکر بدل دیا (یہ بدلے ہوئے احکام انجیل میں موجود ہیں)۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانیت کے تقاضے اور اسکی ذہنی سطح بھی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی اور اوپر کو اٹھتی چلی آرہی ہے۔ اس لئے ہر قوم کو اس کے حالات اور ارتقائی سطح کے مطابق ہی احکام دئے جاتے تھے۔ ان کی سطح سے بلند احکام و قوانین روک لئے جاتے تھے۔ تاآنکہ ان کے بعد دوسری قوم آتی جو ارتقائی منزل میں ان سے آگے ہوتی۔ تو وہ "روکے ہوئے" احکام و قوانین اُس وقت نازل کر دئے جاتے۔ تنزیل وحی میں یہ اصول بھی کارفرما رہا ہے۔

نیز یہ شکل بھی ہوتی کہ ایک رسول کے چلے جانے کے بعد، اُسکی قوم اس کی وحی کے بعض حصوں کو ترک کر دیتی۔ بعض کو فراموش کر دیتی۔ اس لئے ان ترک کردہ یا فراموش کردہ حصوں کو (جن میں کسی تغیر

و تبدل کی ضرورت نہ ہوتی) بعد میں آنے والے رسول کی وحی سے از سر نو تازہ کر دیا جاتا ۔

یہود سے کہا گیا کہ وحی کا سلسلہ اسطرح چلا آرہا ہے ۔ اب وہ دور آگیا ہے جس میں انسانی شعور پختگی حاصل کرلیگا ۔ لہذا اب انتظام یہ کیا گیا ہے کہ ۔

(۱) سابق انبیاء کی وحی کے وہ تمام احکام جو ان کی قوم کے حالات اور ان کے زمانے کے تقاضوں کے ساتھ مخصوص تھے منسوخ کرکے ان کی جگہ، دوسرے احکام و قوانین بھیج دئے جائیں ۔ اور چونکہ وحی کا یہ سلسلہ اب ختم ہورہا ہے اس لئے یہ احکام وقتی اور ہنگامی نہیں ہوں گے بلکہ ابدی طور پر انسانیت کا ساتھ دینے والے ہونگے ۔ اس لئے یہ احکام و قوانین سابقہ احکام سے بہتر ہوں گے ۔

(۲) وہ قوانین جنہیں پہلے روک لیا گیا تھا کیونکہ ہنوز انسانیت اس سطح پر نہیں پہنچ سکی تھی کہ انہیں سمجھ سکے یا اپنا سکے ، اب انہیں بھی نازل کر دیا جاتا ہے ، کیونکہ قرآن کریم انسانیت کی بلند ترین سطح تک اس کا ساتھ دے گا ۔

(۳) اور سابق انبیاء کی وحی کے وہ احکام و قوانین جنہیں ان کی قوموں نے ترک کر دیا تھا ۔ یا فراموش کر دیا تھا (یا جن میں انہوں نے تحریف کر دی تھی) ان کی تجدید کردی گئی ہے ۔ (ان کی مثل احکام دیدئے گئے ہیں) ۔

یہ ہے وہ ضرورت جس کے لئے ایک نئے رسول اور نئی کتاب کو بھیجا گیا ہے ۔ اور یہ ہے وہ وجہ کہ اب تمام سابقہ کتابوں کی جگہ اسی قرآن کریم پر ایمان لانا اور اس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے ۔ اب اس کے سوا ہدایت کی کوئی اور راہ نہیں ۔ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ (۲/۱۳۷) ۔ اگر یہ بھی اسی طریق پر ایمان لائیں جس طرح (اے جماعتِ مومنین) تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ لوگ ہدایت پاسکیں گے ۔ اور اگر اس راہ سے اعراض برتیں گے تو پھر خدا کے راستے کے مخالف سمت جائیں گے ۔

یہ ہے صحیح مفہوم مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا کا ۔ اب دیکھئے کہ ان الفاظ کے لغوی معنی کس طرح اس مفہوم کے آئینہ دار بنتے ہیں ۔

نَسَخَ کے معنی ہم نے اوپر دیکھ ہی لئے ہیں ۔ کسی چیز کی جگہ کسی دوسری چیز کو لے آنا ۔ آیَتٌ کے معنی صرف قرآن کریم کی آیات نہیں ۔ قرآن کریم نے ہر رسول کی وحی کو آیَاتُ اللّٰہِ کہا ہے ۔ مثلاً اسی سورۃ بقرہ میں قصہٗ آدم میں ہے کہ آدم سے کہا گیا ۔ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸) ۔ جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو کوئی اس ہدایت کی اتباع کریگا اسے کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا ۔ اور اس سے آگے ہے ۔ وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا . . . (۲/۳۹) ان کے برعکس، جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کرینگے اور ان سے انکار کریں گے . . . یہاں سے ظاہر ہے کہ جہاں اور جب بھی خدا کی طرف سے ہدایت آئی ہے اُسے آیات اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ لہذا مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ میں آیات سے مراد قرآن کریم کی آیات نہیں بلکہ اس سے مراد ہے کسی سابق وحی کی آیات کی تبدیلی بعد کی وحی کی آیات سے ۔ جیسا کہ سورۃ نحل میں کہا گیا ہے ۔ وَ اِذَا بَدَّلْنَآ اٰیَةً مَّکَانَ اٰیَةٍ ۔ (۱۶/۱۰۱) ۔ "اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دیتے ہیں" ۔

اس کے بعد لفظ نُنْسِهَا ہے ۔ یہ لفظ نَسِیَ سے ہے ۔ نَسِیَ کے معنے کسی چیز کو ترک کر دینا ، یا فراموش کر دینا ، آتے ہیں ۔ (دیکھئے عنوان ن ۔ س ۔ ی) ۔ اس لفظ میں یہ ساری حقیقت آجاتی ہے کہ سابقہ کتبِ آسمانی اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہتی تھیں ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ جو رسول بھی آیا اس کے ساتھ یہی ہوا کہ اس کی وحی میں سرکش اور مفسد لوگوں نے اپنی طرف سے کچھ ملا دیا ۔ لیکن خدا کی طرف سے ایسا ہوتا رہا کہ ان کی اس آمیزش اور ملاوٹ کو الگ کر دیا جاتا اور اس طرح اللہ اپنی آیات کو از سر نو محکم کر دیتا (۲۲/۵۲) ۔ یا وہ اس وحی کے کچھ حصے کو ترک ہی کردیتے تھے ۔ اس حصہ کو خدا نئے رسول کی وحی میں پھر شامل کردیتا ۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ ایک آیت کی جگہ دوسری آیت (یا اس کی مثل اس جیسی آیت) سے مراد سابق وحی کی آیات ہیں نہ کہ قرآن کریم کی ایک آیت کی جگہ دوسری آیت ۔

نَسِیَ کے معنی کسی چیز کو علیٰ حالہ چھوڑ دینے کے بھی ہیں ۔ اس اعتبار سے آیت نُنْسِهَا سے مفہوم یہ ہوگا کہ جن سابقہ احکام کے متعلق ہمارا فیصلہ یہ ہوتا کہ انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے ، انہیں ہم نئے رسول کی وحی میں اسی طرح شامل کر دیتے ۔

اس اعتبار سے قرآن کریم ایک طرف تمام انبیاء سابقہ کی وحی کا مُھَیْمِنٌ ہے (۵/۴۸)۔ یعنی اس کے اندر وہ تمام قوانین محفوظ ہوگئے ہیں۔ اور دوسری طرف خدا کو جس قدر احکام نوع انسانی کے لئے دینے تھے، ان سب کی تکمیل ہوگئی ہے۔ وَ تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا (۶/۱۱۶)۔ اور اب اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہوسکتا۔ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ (۶/۱۱۶)۔ نہ خدا کی طرف سے اب کسی تبدیلی کی ضرورت باقی ہے اور نہ انسانوں میں سے کوئی اس میں رد و بدل کر سکے گا۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے (۱۵/۹)۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ خدا نے وحی کے سلسلہ کو اس طرح کیوں رکھا۔ تو اس کا جواب یہ کہہ کر دیدیا کہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۲/۱۰۶)۔ خدا کے ہاں ہر بات کے اندازے مقرر ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ انسانوں کو کس زمانے میں کس قسم کے احکام ملنے چاہئیں اور وہ دَور کب آئے گا جب انہیں مکمل ضابطۂ حیات دیدیا جائے۔ یہ سب کچھ اُن اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جن پر اُسے پوری پوری مقدرت حاصل ہے۔

یہ ہے ناسخ و منسوخ کا صحیح مفہوم۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس میں ایک لفظ بھی منسوخ نہیں۔ اس کا ہر حکم اپنی جگہ محکم و غیر متبدل ہے۔ البتہ ہر حکم خاص حالات کے ماتحت نفاذ پذیر ہوتا ہے۔ جب حالات بدل جائیں تو اسکی جگہ قرآن کا دوسرا حکم نافذ ہو جاتا ہے۔ مثلاً صلوٰة کے لئے وضو کرنے کا حکم ہے۔ لیکن اگر پانی نہ ملے یا انسان مریض ہو تو وضو کی جگہ تیمم کا حکم ہے (۵/۶)۔ ان حالات میں وضو کا حکم پیچھے ہٹ جائے گا اور تیمم کا حکم آگے آجائے گا۔ جب پانی مل جائے گا (یا مرض جاتا رہے گا) تو پھر وضو کا حکم آگے آجائیگا اور تیمم کا حکم پیچھے چلا جائے گا۔

یا مثلاً قرآن کریم نے چور اور زانی (وغیرہ) کے لئے سزا مقرر کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی معاشرہ میں چوری اور زنا کی وارداتیں نہ ہوں تو قرآن کریم کے (سزاؤں کے متعلق) احکام نافذ العمل نہیں ہونگے۔ یا مثلاً اگر کسی معاشرہ میں مفلس، محتاج، گداگر نہ رہیں تو خیرات وغیرہ سے متعلق احکام نافذ نہیں ہونگے۔ یا مثلاً اگر کوئی شخص ترکہ چھوڑ کر نہ مرے تو وراثت کے احکام اس پر نافذ نہیں ہونگے۔ اسی طرح اگر کوئی ایسا معاشرہ متشکل ہو جائے جس میں فالتو دولت یا جائداد کسی کے پاس نہ ہو تو وراثت کے احکام نافذ نہیں ہونگے۔ ظاہر ہے کہ ان امور کو ''ناسخ و منسوخ'' سے کچھ واسطہ نہیں۔

یہ احکام اپنی جگہ موجود رہتے ہیں ۔ جب وہ حالات پھر پیدا ہو جائیں جن کے ماتحت انہیں نافذ ہونا تھا ، تو وہ پھر نافذ ہو جاتے ہیں۔ ''منسوخ'' اسے کہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے ساقط ہو جائے اور کبھی نافذ نہ ہوسکے ۔ قرآن کریم میں ایسا کوئی حکم نہیں ۔

مَانَنْسَخْ والی آیت (۲/۱۰۶) ۔ یا سورۃ النحل کی آیت اِذَا بَدَّلْنَا آیَۃً مَّکَانَ آیَۃٍ (۱۶/۱۰۱) میں اگر آیۃ سے مراد کائناتی حوادث و وقائع لئے جائیں (جنہیں قرآن کریم متعدد مقامات پر ''آیات اللہ'' کہہ کر پکارتا ہے) تو ''نسخ آیت'' سے مراد ہوگا نظام کائنات کے کسی ایک طریق یا مظہر کی جگہ کسی دوسرے طریق یا مظہر کا آجانا ۔ ارباب علم و تحقیق سے پوشیدہ نہیں کہ کائنات میں اس قسم کے تبدلات کسطرح آئے دن ہوتے رہتے ہیں ۔

لیکن چونکہ ہر دو مذکورہ بالا آیات کے سیاق و سباق کا تعلق وحی سے ہے اس لئے ہم پہلے بیان کردہ مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں ، اگرچہ دوسرے مفہوم کی رو سے معانی میں بڑی وسعت پیدا ہو جاتی ہے ۔

اول الذکر مفہوم ہو یا ثانی الذکر ، یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جو منسوخ ہو ۔ اس غیر متبدل صحیفۂ آسمانی کا ایک ایک حرف اپنے مقام پر اٹل ہے اور اٹل رہے گا ۔ واللہ علیٰ مانقول شہید ۔

ن س ر

اَلنَّسْرُ ۔ گدھ کو کہتے ہیں ۔ لیکن عربوں میں مختلف قسم کے گدھوں کے لئے الگ الگ نام ہیں ۔ اس گدھ کی صفت میں اہل لغت نے لکھا ہے کہ یہ بڑی تیز نظر رکھتا اور بلند پرواز ہوتا ہے ۔ نیز نَسْرٌ قبیلۂ ذی الکلاع کا ایک بت تھا جو سرزمین حمیر میں تھا * ۔ قرآن کریم میں اس بت کا نام قوم حضرت نوحؑ کے ذکر میں آیا ہے (۷۱/۲۳) ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اچک لینے اور چھین لینے کے ہیں ۔ اور اَلنَّسْرُ ۔ چند ستاروں کے جھمکے کو نیز گدھ کو کہتے ہیں ۔ قرآن کریم میں بہرحال یہ لفظ قوم حضرت نوحؑ کے بت کے لئے آیا ہے ۔

ن س ف

نَسَفَ الْبِنَاءَ یَنْسِفُہٗ ۔ اس نے عمارت کو جڑ سے اکھیڑ دیا ۔ اَلْمِنْسَفَۃُ ۔ وہ اوزار جس سے عمارت کو اکھاڑا جاتا ہے ۔ نَسَفَ الطَّعَامَ ۔

*تاج ۔

اس نے غلے کو پھٹکا - اَلْمِنْسَفُ - چھاج - نَسَفَتِ الرِّيْحُ الشَّيْءَ - ھوا نے اس چیز کو اڑا دیا - اکھیڑ کر منتشر کر دیا - نَسَفَ الْبَعِيْرُ الْاَرْضَ بِمُقَدَّمِ رِجْلِهِ - اونٹ نے اپنے پاؤں کے اگلے سرے سے مٹی کو پھینکا اور اڑایا*** - اَلنُّسَافَةُ - پھٹکنے سے جو کچھ اُڑے - اَلْمِنْسَفَةُ - چھلنی کو بھی کہتے ھیں - اور نَسَفَ الشَّيْءَ کسی چیز کے چھاننے کو* - اَلنَّسِيْفُ - وہ نشان جو ایڑھ لگانے سے اونٹ کے پہلو پر (بال اڑنے سے) پیدا ھوجاتا ھے - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے کشف یعنی کھولنا اور ظاھر کرنا لکھے ھیں -

سورہ طٰہٰ میں ھے - لَنَنْسِفَنَّهُ فِى الْيَمِّ نَسْفًا (۲۰/۹۷) - ھم اسے دریا میں بہا دینگے - اسکے اجزا منتشر کرکے دریا برد کردینگے - ذرا آگے چل کر ھے - يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا (۲۰/۱۰۵) - تیرا رب انہیں جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھدیگا -

ن س ک

نَسَكَ الثَّوْبَ - اس نے کپڑے کو دھو کر پاک اور صاف کر لیا - صاحب محیط نے لکھا ھے کہ اس مادہ کے اصلی معنی دھونے اور صاف کرنے کے ھیں - باقی تمام معانی اسی اصول پر متفرع ھیں** - اَرْضٌ نَاسِكَةٌ - سرسبز و شاداب زمین جس پر نئی نئی بارش ھوئی ھو* -

اس بنیادی معنی کی رو سے اس سے مراد کسی معاملہ کو درست اور ٹھیک کر لینا ھوتا ھے - نَسَكَ السَّبْخَةَ کے معنے ھیں اس نے زمین شور کو درست کیا - نَسَكَ اِلَى طَرِيْقَةٍ جَمِيْلَةٍ - اس نے اچھا طریقہ اختیار کر لیا اور پھر اس پر مداومت کی* -

راستہ اختیار کر لینے کی جہت سے کلام عرب میں مَنْسَكٌ ھر اس مقام کو کہتے ھیں جس کی طرف آنے جانے کے لوگ عادی ھو چکے ھوں - خواہ یہ خیر میں ھو یا شر میں - اس کے بعد امور و مراسم حج کو مَنَاسِكُ کہنے لگے - اور نُسُكٌ یا نَسِيْكَةٌ - ذبیحہ کو یا خون کو* -

اسکے بعد یہ لفظ ھر اس بات کے لئے بولا جانے لگا جو خدا کی طرف سے واجب ھوئی ھو - لہذا مَنَاسِكُ کے معنی واجبات خداوندی کے طور طریقے ھو گئے** - ابن قتیبہ نے کہا ھے کہ اس کے معنی ھر اس چیز کے ھیں جس

*تاج - **محیط - ***راغب -

کے ذریعے خدا کا تقرب حاصل کیا جائے*۔ قرآن کریم میں احکام حج کے ضمن میں آیا ہے۔ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ (۲/۲۰۰)۔ جب تم حج کے واجبات سے فارغ ہو چکو۔ اس سے ذرا پہلے ہے فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ (۲/۱۹۶)۔ اس کا فدیہ روزے یا صدقہ یا ذبیحے ہونگے۔ ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ یہاں نُسُکٌ سے مراد ذبیحے ہونگے*۔ ابن فارس نے بھی اس کے معنی تقرب حاصل کرنے اور ذبیحہ کے لکھے ہیں۔ لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ اس کے معنی ذبیحہ کے کیوں مختص کر لئے جائیں۔ اس سے مراد کوئی عمل خیر ہو سکتا ہے جسے وہ اپنے اوپر واجب قرار دے لے۔

سورہ انعام میں ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ (۶/۱۶۳)۔ ان سے کہدو کہ میری صلٰوۃ اور میرے نُسُکٌ۔ میری زندگی اور میری موت۔ سب خدا کے عالم گیر نظام ربوبیت کے لئے وقف ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں صلٰوۃ سے مراد جملہ احکام خداوندی کی اطاعت ہے اور نُسُکٌ سے مراد زندگی کا ہر طور طریقہ**۔

سورہ حج میں ایک جامع آیت ہے۔ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ (۲۲/۶۷)۔ ”ہم نے ہر امت کے لئے ایک طریقہ مقرر کر دیا تھا جس پر انہیں چلنا تھا۔ سو یہ لوگ تم سے امر کے معاملہ میں جھگڑا نہ کریں۔ تو انہیں اپنے رب کی طرف دعوت دیتا رہ“۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امر تو اصل قانون ہے جو ہمیشہ غیر متبدل رہا ہے۔ اور مَنَاسِکٌ اس کی وہ جزئیات و فروعات (طور طریقے) ہیں جو زمان اور مکان کے تقاضوں کے مطابق اس امر کو نافذ کرنے کے لئے اختیار کی جاتی ہیں۔ مَنَاسِکٌ تو مختلف رہے ہیں، لیکن امر متنازعہ فیہ نہیں ہو سکتا۔ اسلام کی دعوت بنیادی طور پر اس امر کی طرف تھی جسے اہل مذاہب نے چھوڑ کر صرف مَنَاسِکٌ کو دین بنا لیا تھا۔ اصل دین کی یہی وہ توازن بدوش راہ ہے جو قرآن کریم کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتی۔ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ (۲۲/۶۷)۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص اس اصل کو تسلیم کر لے تو پھر اُسے اس نظام (دین) کی جزئیات پر بھی عمل پیرا ہونا ہوگا۔ کیونکہ جب دین، اجتماعی نظام کا نام ٹھہرا تو یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی فرد اس اجتماعی نظام کا رکن ہو لیکن اس

---

* ابن قتیبہ (القرطین - ج/۱ صفحہ ۱۲۵)۔ ** شاہ عبدالقادر - شاہ رفیع الدین اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے تراجم میں مناسک کا ترجمہ عبادت کے طور طریقے یا ارکان حج کیا ہے۔ مؤخرالذکر نے نسکی کا ترجمہ ”میرا حج“ کیا ہے۔

کی جزئیات میں اختلاف کرے۔ اس سے نظام قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ بایں ہمہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئیے کہ جب مناسک مختلف اقوام میں بدلتے رہے ہیں تو امت کے مختلف ادوار میں بھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان مناسک میں تبدیلی ہو سکتی ہے جنہیں قرآن کریم نے متعین نہ کیا ہو بلکہ وہ کسی زمانے میں باہمی مشاورت سے متعین کئے گئے ہوں۔ یہ تبدیلی قرآنی نظام کیطرف سے ہوگی۔ افراد کو اس کا حق نہیں ہوگا۔

ن س ل

اَلنَّسْلُ۔ کسی چیز کا الگ ہوجانا۔ جدا ہوجانا۔ نَسَلَ الْوَبَرُ عَنِ الْبَعِیْرِ۔ اونٹ سے بال جھڑکر الگ ہوگئے۔ نَسَلَ الْقَمِیْصُ عَنِ الْاِنْسَانِ۔ قمیص انسان سے الگ ہو گئی*۔ اَلنُّسَالَۃُ۔ وہ اون جو گر پڑے۔ یا پرندے کا پر جو جھڑ جائے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا آسانی سے نکل جانا اور نکالنا۔

نَسَلَ۔ یَنْسِلُ۔ تیز رفتار ہوا۔ دوڑا۔ اَنْسَلَ الْقَوْمَ وہ قوم سے آگے بڑھ گیا۔ ذِئْبٌ نَسُوْلٌ۔ تیز دوڑنے والا بھیڑیا***۔ اَلنَّسَلَانُ۔ تیز رفتار۔ اَلنَّسَلُ۔ وہ دودھ جو تھن کے سوراخ سے خود بخود ٹپکنے لگ جائے**۔

اولاد کو نَسْلٌ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے آباء و اجداد سے نکلتی ہے۔ یا اس لئے کہ آباء و اجداد چلے جاتے ہیں اور وہ آگے بڑھ جاتی ہے۔

قرآن کریم میں یُھْلِکَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ($\frac{2}{205}$) آیا ہے۔ یہاں نَسْلٌ کے معنی ذریت۔ مخلوق۔ اولاد۔ انسانی آبادی ہیں۔ یعنی نسلِ انسانی۔ لہذا، قرآن کریم کی رو سے کھیتی اور نسلِ انسانی کا (بغیر حق کے) تباہ کرنا سنگین جرم ہے۔

سورۃ انبیاء میں ہے وَ ھُمْ مِّنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ ($\frac{21}{96}$)۔ وہ ہر بلندی سے تیزی سے نکل پڑینگے۔ طوفان کی طرح موجیں مارتے ہوئے اُمنڈ پڑینگے۔ سورۃ یٰسٓ میں ہے۔ اِلٰی رَبِّھِمْ یَنْسِلُوْنَ ($\frac{36}{51}$)۔ اپنے رب کی طرف تیزی سے نکل دوڑینگے۔

ن س و

اَلنِّسْوَۃُ۔ اَلنِّسَاءُ۔ اَلنِّسْوَانُ۔ یہ سب الفاظ اَلْمَرْاَۃُ کی غیرلفظی جمع ہیں۔ یعنی اَلْمَرْاَۃُ کے معنی ہیں ایک عورت اور اَلنِّسَاءُ

*راغب۔ **محیط۔ ***تاج۔

(وغیرہ) کے معنی ہیں بہت سی عورتیں ۔ اَلْمَرْاَۃُ کی جمع ۔ اور النِّسَاءُ وَ النِّسْوَۃُ و النِّسْوَانُ کا واحد ان کے مادوں سے نہیں آتا* ۔

قرآن کریم میں نِسَاءٌ کا لفظ اضافت کے ساتھ عام عورتوں کے علاوہ بیویوں کے لئے بھی آیا ہے مثلاً اِلیٰ نِسَائِکُمْ (۲/۱۸۷)۔ ''تمہاری بیویاں''۔

مجازی معنوں میں یہ لفظ قوم کے اس طبقے کے لئے استعمال ہوا ہے جو جوہرِ مردانگی سے عاری ہو۔ (اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ذ ۔ ب ۔ ح) اور (ب ۔ ن ۔ و) ۔

ن س ی

نِسْیَانٌ کے اصلی معنی ترک کردینے اور چھوڑ دینے کے ہیں ۔ راغب نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے پاس رکھی ہوئی چیز کی حفاظت کرنا چھوڑ دے تو اسے بھی نِسْیَانٌ کہتے ہیں ۔ یعنی حفاظت کرنا چھوڑ دینا ۔ چنانچہ وَ لَقَدْ عَہِدْنَا اِلیٰ اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا ۔ (۲۰/۱۱۵) ۔ ''اور یقیناً ہم نے پہلے آدم کو حکم دیا تھا لیکن اس نے اسے ترک کردیا ۔ اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا'' ۔ اس میں نَسِیَ کے معنی ترک کر دینے کے ہیں، کیونکہ بھول جانے پر مواخذہ نہیں ہوسکتا (نیز یاد رکھنے کے لئے عزم کی ضرورت نہیں ہوتی) ۔ اسی طرح نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَھُمْ (۹/۶۷) کے معنی ہیں انہوں نے قوانین خداوندی کو چھوڑ دیا تو خدا نے ان کی حفاظت کو چھوڑ دیا** ۔ ہمارے ہاں بھی یہ کہتے ہیں کہ میں نے تمہیں کتنی باتوں کی تاکید کی لیکن تم نے ان سب کو بھلا دیا ۔ یہاں بھلا دیا، سے مراد یہ نہیں کہ وہ تمہارے حافظہ سے محو ہوگئیں ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تم نے ان پر عمل نہیں کیا ۔ یا کچھ عرصہ تک عمل کرکے انہیں چھوڑ دیا ۔ نیز اس کے معنی کسی چیز کو علیٰ حالہٖ رہنے دینے کے بھی ہیں۔ اس کی تائید میں صاحب غریب القرآن (مرزا ابو الفضل) نے حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول بھی نقل کیا ہے ۔

سورۃ بقرہ میں سابقہ انبیاء کرامؑ کے سلسلۂ وحی کے متعلق ہے مَانَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِھَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْھَآ اَوْ مِثْلِھَا (۲/۱۰۶) ۔ ہم جس سابقہ حکم کو منسوخ کرتے ہیں تو اس کے بعد اس سے بہتر حکم دیدیتے ہیں اور جسے علیٰ حالہ چھوڑ دیتے ہیں تو اس جیسا حکم

*تاج ۔ **ابن قتیبہ القرطبی ج/۱ صفحہ ۱۹۸

دوسرے نبی کی وحی میں دے دیتے ھیں ۔ (تفصیل ن ۔ س ۔ خ کے عنوان میں دیکھئے) اسی طرح سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى (۸۷/۶) کے معنی یہ ھیں کہ ھم اس وحی کو اس طرح محفوظ رکھیں گے کہ تو اس میں سے کسی بات کو بھی چھوڑ نہیں سکے گا ۔ اس میں سے کچھ بھی چھوٹنے نہیں پائے گا ۔ سب ایک جگہ جمع ہو جائے گا ۔ اس کی حفاظت کی شہادت دوسری جگہ موجود ھے جہاں کہا گیا ھے کہ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِىٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ (۱۷/۸۶) اگر ھم چاھیں تو جو کچھ تجھے بذریعہ وحی دیا گیا ھے اس میں سے کچھ لے جائیں (لیکن ھماری مشیت ایسی نہیں) ۔ اسی سے (۸۷/۶) ۔ کے بعد اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ کا مفہوم واضح ہو جاتا ھے ۔ یعنی اس میں سے اُسی صورت میں کچھ ترک ہوسکتا تھا کہ خدا کی مشیت ایسی ہوتی ۔ لیکن خدا کی مشیت یہ تھی ھی نہیں (۱۷/۸۶) ۔ اس لئے اس میں سے کچھ بھی ترک نہیں ہوا* ۔

صاحب المنار نے لکھا ھے کہ اگر اس کے معنی بھول جانے کے بھی لئے جائیں تو بھی اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اس کی نفی کر دیتا ھے ۔ کیونکہ "استثناء بالمشیت" اسلوب قرآن میں ھر جگہ ثبوت اور استمرار کے لئے آتا ھے ۔ (یعنی جہاں اِلَّا کے بعد مَا شَآءَ اللّٰهُ وغیرہ ہو جس سے مراد خدا کی مشیت ہوتی ھے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ھے کہ جیسا پہلے کہا گیا ھے اس کے خلاف کبھی نہیں ہوگا) ۔ جیسا کہ دوسری جگہ ھے خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۔ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ (۱۱/۱۰۸) ۔ یعنی غیر مقطوع ۔ اور استثناء میں نکتہ یہ ھے کہ یہ ظاھر کر دینا مقصود ھے کہ یہ امور جو ثابتہ اور دائمہ ھیں خدا کی مشیت سے ایسے ھیں ۔ اپنی طبیعت کے لحاظ سے ایسے نہیں ھیں ۔ اگر خدا اس کے خلاف چاھتا تو ان کو ویسا ھی بنا دیتا ۔ (المنار جلد اول صفحہ ۴۱۶ - ۱۹ - زیر نَنْسَخْ وَنُنْسِهَا) ۔

کسی چیز کی حفاظت کو ترک کر دینے کے معنی یہ ھیں کہ اس چیز کو قابل اعتناء نہیں سمجھا گیا ۔ اسے حقیر و غیر اھم سمجھا گیا ۔ اس لئے اَلنِّسْیُ کے معنی ھیں ایسی چیز جس سے بے اعتنائی برتی جائے ۔ اس کی جمع اَنْسَآءٌ ھے ۔ چنانچہ جب عربوں کا قافلہ کوچ کرنے لگتا تو وہ کہا کرتے تھے تَتَبَّعُوْا اَنْسَآءَكُمْ ۔ اپنی چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں کو جنہیں زیادہ اھمیت نہیں دی جاتی ، تلاش کرلو* ۔

*تاج ۔

اس عدم اهمیت کی بناء پر اس کے معنے بھول جانے کے ہو گئے۔ اَنْسَاہُ اِیَّاہُ اس نے اس کو بھلا دیا۔ نَسَّاءٌ۔ بہت بھول جانے والا*۔ نَسْیًا مَّنْسِیًّا (۲۳/۱۹)۔ بھولی بسری۔

ترک کر دینے کے معنوں میں قرآن کریم کی آیات اوپر درج کی جا چکی ہیں۔ ان کے علاوہ (۲/۱۲۶ اور ۲۳/۱۴) میں بھی یہی مفہوم ہے۔ یعنی نا قابل التفات سمجھ کر چھوڑ دینا۔ ذِکْرٰی کے مقابلہ میں اِنْسَاءٌ (۶/۶۸) میں آیا ہے۔ یعنی بھلا دینا۔ بلا ارادہ بھول جانا خطا نہیں ہوتی (۲/۲۸۶)۔

ن ش أ

نَشَاَ یَنْشَاُ۔ نَشْاَۃً۔ زندہ ہونا، نیا ہونا، رو بہ نما ہونا، بلند ہونا، بڑھنا، بتدریج ترقی کرنا، نشو و نما پانا۔ نَشَاَتِ السَّحَابَۃُ نَشْاً۔ بادل اُٹھا۔ اَلنَّاشِیُٔ۔ لڑکی یا لڑکا جو بچپن کی حد سے گزر کر جوانی میں قدم رکھ رہا ہو، یا رکھنے کے قریب ہو۔ اَلنَّاشِئَۃُ۔ ہر وہ ساعت جس میں آدمی رات کے وقت کھڑا رہے۔ یعنی سوئے نہیں۔ سونے کے بعد اٹھنے کو بھی کہتے ہیں۔ نیز ہر واقعہ جو رات کے وقت سرزد یا رو نما ہو۔ تَنَشَّاَ فُلَانٌ لِحَاجَتِہٖ، فلاں آدمی اپنے کام کے لئے اٹھا اور چل پڑا۔ اَلْمُنْشَاُ۔ بلند نشان یا جھنڈا۔ اَلْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ (۵۵/۲۴)۔ بلند بادبانوں والی کشتیاں۔ اَلْاِنْشَاءُ۔ کسی چیز کو ایجاد کرنا اور اس کی تربیت کرنا**۔ اَلنَّشْءُ۔ نسل***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بلند ہونے کے ہیں۔

سورۃ انعام میں ہے۔ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ (۶/۹۹)۔ اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ”نفس واحد“ سے پیدا کیا۔ یا آگے بڑھایا۔ (اس کی تفصیل میری کتاب ”ابلیس و آدم“ میں ملے گی)۔ سورۃ واقعہ میں ہے اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَاءً (۵۶/۳۵)۔ ہم نے انہیں ایک خاص انداز سے نئی پیدائش دی۔ یا ہم نے ان کی خاص تربیت کی۔ نہایت عمدگی سے پروان چڑھایا۔ اس سے ذرا آگے ہے وَ نُنْشِئَكُمْ فِیْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۵۶/۶۱)۔ تمہیں اس انداز سے ایک نئی پیدائش دیں جو تمہارے علم میں بھی نہیں۔ ضمناً مَا لَا تَعْلَمُوْنَ سے ظاہر ہے کہ جہاں تک اس زندگی میں انسانی علم کی سطح کا تعلق ہے اس کی رو سے ہم جان نہیں سکتے کہ دوسری زندگی کی کیفیت اور ماہیت کیسی ہوگی۔ اسی کو دیگر مقامات میں خلق جدید، ایک نئی تخلیق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۲۹/۲۰ و ۱۸/۹۸ و ۳۲/۱۰)۔

---

*تاج۔ **راغب۔ ***محیط۔

سورۃ واقعہ میں ذرا آگے چل کر ہے۔ ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ (۵۶/۷۲)۔ کیا تم اس کے درخت کو اگاتے اور نشو و نما دیتے ہو، یا ہم دیتے ہیں۔

سورۃ زخرف میں ہے مَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ (۴۳/۱۸) جس کی پرورش و تربیت زیورات میں ہوئی ہو۔ یا جس کی تربیت عورتوں کی طرح ہوئی ہو۔ سورۃ رعد میں ہے۔ وَ يُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۳/۱۲)۔ وہی بھاری بھاری بادلوں کو (سمندر کی سطح سے فضا میں) بلند کرتا ہے۔ سورۃ رحمٰن میں جَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ (۵۵/۲۴) آیا ہے۔ یعنی بلند بادبانوں والی کشتیاں۔ سورۃ مزمل میں نَاشِئَةَ الَّيْلِ آیا ہے (۷۳/۶)۔ یعنی رات کا اٹھنا۔ اِنْشَاءٌ نشو و نما دینا۔ بتدریج آگے بڑھانا۔ اور پروان چڑھانا خدا کی صفت ربوبیت کا نتیجہ ہے۔ کائنات کی ہر شے خدا کے پروگرام کے مطابق، اُس کے قانون کی رو سے نشو و نما پاتی اور بتدریج اپنے منتہیٰ کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہی کچھ انسان کو اپنی دنیا میں کرنا ہوگا۔ یعنی اپنی اور اپنے ساتھ ہر فرد انسانی کی نشو و نما۔ اس کی صلاحیتوں کی برومندی اور انہیں تکمیل تک پہنچانا۔ یہی اسلام کا مقصود ہے۔

ن ش ر

اَلنَّشْرُ۔ ہوا۔ خوشبودار ہوا۔ مہک۔ دراصل اس میں پھیلنے کا پہلو غالب ہوتا ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو کھولدینے اور اس کے شاخ در شاخ ہو جانے کے ہیں۔ چنانچہ اَلتَّنْشِيْرُ کے معنی ہیں کسی چیز کو کھول دینا۔ پھیلا دینا۔ نَشَرَ الْخَشَبَةَ۔ اس نے لکڑی کو چیر دیا۔ اَلْمِنْشَارُ۔ آرے کو کہتے ہیں اور اَلنُّشَارَةُ اس برادے کو جو لکڑی چیرنے سے گرتا ہے۔ اَلنَّشْرُ۔ خبر کو پھیلا دینا۔ یا پتوں کا پھیلنا۔ درختوں کا پتے لے آنا۔ نَشَرَتِ الْاَرْضُ نُشُوْرًا۔ موسم بہار آنے سے زمین میں جان آگئی اور خوب پودے اُگ آئے۔ اَلنَّشْرُ۔ اس خشک گھاس کو کہتے ہیں جو گرمی کے آخر میں بارش پڑنے سے دوبارہ سبز ہو جائے۔ اور اَلنَّشِيْرُ۔ کاٹ کر جمع کی ہوئی کھیت کی پیداوار جسے گاھا نہ گیا ہو۔ اَنْشَرَ الْاَرْضَ۔ اس نے باقی دیکر زمین کو حیات نو عطا کر دی۔ اسی سے اَلنُّشُوْرُ۔ حیات تازہ کو کہتے ہیں*۔

*تاج و محیط و راغب۔

قرآن کریم میں یہ لفظ ان تمام معانی میں استعمال ہوا ہے جنکا اوپر ذکر کیا گیا ہے - سورہ بنی اسرائیل میں کِتَابًا . . . مَنْشُوْرًا (۱۷/۱۳) آیا ہے - کھلی ہوئی کتاب - سورہ طور میں فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۵۲/۳) آیا ہے - پھیلے ہوئے صحیفہ میں - سورہ قمر میں ہے - جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ (۵۴/۷) - بچھی ہوئی یا چھا جانے والی یا بکھری ہوئی ٹڈیاں - سورہ احزاب میں ہے فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا (۳۳/۵۳) - جب کھانا کھا چکو تو پھر متفرق ہو جاؤ - سورہ مرسلٰت میں ہے - وَالنّٰشِرَاتِ نَشْرًا (۷۷/۳) - دور دور تک پھیلانے والی قوتیں - سورہ فرقان میں ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے نیند کو آرام کا باعث بنایا وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا (۲۵/۴۷) - اور دن کو نُشُوْرٌ - اس کے معنی چلنے پھرنے اور متفرق ہونے کے بھی ہو سکتے ہیں اور نیند کے بعد حیات تازہ کے بھی - اسی سورۃ میں غیرخدائی معبودوں کی بے بسی کے متعلق ہے - لَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا (۲۵/۳) - وہ موت و حیات اور موت کے بعد حیات نو کی قدرت نہیں رکھتے - یہ حیات نو (مثلاً) اسی طرح ملتی ہے جس طرح بارش کے چھینٹے سے زمین کے عروق مردہ میں خونِ زندگی دوڑ اٹھتا اور اس کے آغوش میں خوابیدہ سبزہ لہلہا اٹھتا ہے - چنانچہ سورہ فاطر میں زمین کی اسی حالت کو بیان کرنے کے بعد فرمایا - كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ (۳۵/۹) - اسی طرح سے تمہاری حیات تازہ کی مثال ہے - حیات تازہ کی یہ مثال کس قدر بلیغ اور بصیرت افروز ہے - یعنی اُس شے کے اندر زندگی کے ممکنات تو موجود ہوتے ہیں لیکن اپنی خوابیدہ شکل میں - اس نئے طریق (Process) سے اسکی خوابیدگی کو بیداری سے بدل دیا جاتا ہے - (مردہ قوموں کو حیات تازہ ملنے کی بھی یہی صورت ہے) - موت کے بعد حیات سے انکار کرنے والوں کا قول ہے کہ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ (۴۴/۳۵) - ہمیں حیات تازہ نہیں مل سکتی - ہم مر کر نہیں جی سکتے - کہا کہ یہ غلط ہے - خدا وہ ہے - اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ (۸۰/۲۲) جو موت کے بعد انسان کو اپنے قانون مشیت کے مطابق حیات تازہ عطا کرتا ہے -

مردہ، جامد ہوتا ہے - زندہ بڑھتا اور پھیلتا ہے - زندگی کی علامت کشاد اور وسعت ، بڑھنا اور پھیلنا (اَلنَّشْرُ) ہے - جس میں وسعت اور کشاد نہیں وہ زندگی سے محروم ہے - جو قوم اپنی جگہ پر جم کر بیٹھتی ہے اور حرکت کرکے آگے نہیں بڑھتی وہ مردہ ہے -

ن ش ز

اَلنَّشْزُ - وَالنَّشَزُ - بلند اور اونچی جگہ - نَشَزَ - وہ اونچی جگہ پر چڑھ گیا (اور محفوظ ہو گیا) - نَشَزَ الرَّجُلُ - آدمی بیٹھے سے کھڑا ہو گیا -

نَشَزَ بِالْقَوْمِ فِي الْخُصُوْمَةِ - وہ قوم کے ساتھ جھگڑا کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا*۔ راغب نے لکھا ہے کہ کسی چیز کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا نَشَزَ کہلاتا ہے۔ اسی سے نُشُوْزٌ کے معنی ہیں میاں بیوی میں سے ایک کا مخالفت پر اتر آنا، نافرمانی کرنے لگنا، متنفر ہونا، جھگڑنا، بدسلوکی کرنا، ایک دوسرے کے خلاف یا سامنے کھڑے ہو جانا - عورت کا مرد کے مقابل میں (۴/۳۴) - اور مرد کا عورت کے مقابلہ میں (۴/۱۲۸) - سورۂ مجادلہ میں یہ لفظ مجلس سے اٹھ کھڑے ہونے کے لئے آیا ہے (۵۸/۱۱) - سورۂ بقرہ میں ہڈیوں کو اٹھانے، بلند کرنے اور ابھارنے کے معنوں میں آیا ہے (۲/۲۵۹)-

ن ش ط

نَشَطَ مِنَ الْمَكَانِ - وہ اس جگہ سے نکل گیا - اَلنَّاشِطُ - اُس جنگلی بیل کو کہتے ہیں جو ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کی طرف چلا جائے - اس سے اَنْشَطَ الْعُقْدَةَ کے معنی ہیں اس نے گرہ کو کھول دیا**۔ اَنْشَطَ الْبَعِيْرَ مِنْ عِقَالِهِ - اس نے اونٹ کو اسکی رسی سے کھول کر آزاد کر دیا*** - نَشْطٌ - ایسی گرہ باندھنے کو کہتے ہیں جو آسانی سے کھل جاتی ہو**** - اسی سے نَشِطَ - يَنْشَطُ - نَشَاطاً کے معنی ہیں کسی کام کے لئے انسان کا مستعد اور خوش دل ہونا - راغب ہونا - اُس کام سے خوش ہونا - دلچسپی لینا - دل کی گرہوں کا کھل جانا** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جھومنے اور حرکت کرنے کے ہیں -

قرآن کریم میں اَلنّٰشِطٰتِ نَشْطاً (۷۹/۲) آیا ہے - اس کے معنی ہیں وہ سیارے جو ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر آتے جاتے رہتے ہیں اور تیزی سے چلتے ہیں - کیونکہ تَنْشَطُ النَّاقَةُ فِي سَيْرِهَا کے معنی ہیں اونٹنی اپنی رفتار میں تیز رہی**- نیز اِنْتَشَطَ الْحَبْلَ کے معنی ہیں اس نے رسی کو اس حد تک کھینچا کہ وہ کھل گئی - نَشَطَ الدَّلْوَ مِنَ الْبِئْرِ - اس نے کنوئیں سے پانی کا ڈول کھینچا***- (چرخی کے بغیر کھینچنے کے لئے بولا جاتا ہے)

اس اعتبار سے وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطاً میں ستاروں کی باہمی کشش کی طرف بھی اشارہ ہے - یعنی تیز رفتاری سے ادھر اُدھر جانے والے اور اس کے ساتھ ہی اپنی کشش کو بھی قائم رکھنے والے - ان کی گرہیں کھلی ہوئی بھی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ باہمی کشش سے ایک دوسرے کے ساتھ

*تاج و ابن فارس - **تاج - ***محیط - ****راغب -

بندھے ہوئے بھی ہیں - تیز رفتاری اور کشادگی بھی ہے اور نظم و ضبط کی پابندی بھی - دیکھئے ایک لفظ نَشْطً* میں ان سیارگانِ فلک کی خصوصیات کی پوری دنیا کس طرب و نشاط سے جھلمل جھلمل کر رہی ہے -

مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے کہ وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا سے مراد یہ ہے کہ انسان کی ترقی کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں ، یہ انقلابی جماعت انہیں ہٹا دیتی ہے - اس کا مشن یہ ہوتا ہے کہ جو چیزیں انسانیت کے راستے میں حائل ہوں انہیں ہٹا دے* -

ن ص ب

اَلنَّصْبُ - کسی چیز کو کھڑا کرکے رکھنا - ابھار کر رکھنا ** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو ہموار اور سیدھا کھڑا کر دینے کے ہیں - نَصَبَ الشَّجَرَةَ - درخت زمین میں لگا دیا *** - اَلنَّصْبُ گاڑا ہوا جھنڈا - اَلنَّصْبُ (وَالنَّصِیْبَةُ) - ہر وہ چیز جسے نصب کر دیا جائے اور اس طرح وہ نشان اور علامت بن جائے - اسکی جمع اَلْاَنْصَابُ ہے - ان پتھروں کو بھی جو کعبہ کے گرد نصب کئے گئے تھے اور جن پر جانور ذبح کئے جاتے تھے اَلْاَنْصَابُ کہتے تھے **** - اَلنَّصِیْبُ - پتھر جو کسی چیز پر ابھار کر رکھ دئے جائیں - اس سے اسکے معنی متعینہ (قائم کردہ) حصہ کے ہو گئے ** - اَلنِّصَابُ - ہر چیز کا اصل اور مرجع *** - جَعَلْتُهٗ نُصْبَ عَیْنِیْ - میں نے اسے اپنی نگاہ کے سامنے قائم کر لیا کہ نہ اسے بھول سکتا ہوں نہ اس سے غافل رہ سکتا ہوں **** - یعنی اسے نصب العین بنا لیا -

نَصِبَ یَنْصَبُ - تھک جانا اور عاجز و درماندہ رہ جانا **** - (غالباً اس لئے کہ تھک جانے والا ایک جگہ کھڑا ہو جاتا ہے) - اَلنَّصَبُ - مشقت - تھکن - کوفت - عَیْشٌ نَاصِبٌ - ایسی زندگی جسمیں مشقت ہو - اَلنُّصْبُ وَالنَّصْبُ وَالنَّصَبُ - بیماری - مضرت - مشقت - ابتلاوآزمائش **** -
قرآن کریم میں ہے - لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ ($\frac{15}{48}$) - جنت میں انہیں مشقت ، تکان یا کسی قسم کی تکالیف چھونیکی نہیں - نَصِیْبٌ بمعنی حصہ ($\frac{4}{7}$; $\frac{4}{202}$) میں آیا ہے - سورۂ نساء میں نَصِیْبٌ اور کِفْلٌ مرادف آئے ہیں ($\frac{4}{85}$) - سورہ مائدہ میں ہے وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ ($\frac{5}{3}$) - اسکے معنی وہ پتھر یا استھان ہیں جن پر غیر اللہ کے نام پر قربانیاں دی جاتی تھیں - سورۂ

*المقام المحمود صفحہ ۱۸ **راغب - ***محیط - ****تاج -

معارج میں ہے کَاَنَّھُمْ اِلیٰ نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ (۷۰/۴۳)۔ گویا وہ اس قسم کے استھانوں کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں ۔ سورہ غاشیۃ میں ہے عَامِلَۃٌ نَّاصِبَۃٌ (۸۸/۳) وہ لوگ جو محنت و مشقت کرکے تھک جائیں ۔ محنت اور مشقت ہر کام میں کرنی پڑتی ہے ۔ اگر یہ محنت صحیح راستے پر کی جائے تو اس کام کا نتیجہ حسب منشا مرتب ہو جاتا ہے ۔ اس محنت سے انسان میں تکان پیدا نہیں ہوتی ۔ لیکن اگر وہی محنت غلط طریق پر کی جائے تو اس کا صحیح نتیجہ مرتب نہیں ہوتا اور اسطرح وہ محنت انسان کو بری طرح تھکا دیتی ہے ۔ اس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے فَحَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ (۱۸/۱۰۵) ۔ ان کے اعمال رائگاں گئے ۔ انہوں نے صحیح نتیجہ پیدا نہ کیا ۔ یہ ہیں عَامِلَۃٌ نَّاصِبَۃٌ (۸۸/۳) ۔ وہ لوگ جنھوں نے قوانین خداوندی کے مطابق کام نہ کیا اس لئے ان کے حصے میں تکان اور ماندگی کے علاوہ کچھ نہ آیا ۔

سورہ صٓ میں ہے کہ حضرت ایوبؑ نے خدا کو پکارا کہ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ (۳۸/۴۱) مجھے سانپ نے ڈس لیا ہے جس کی وجہ سے مجھے سخت تکلیف ہے ۔ سورہ فاطر میں نَصَبٌ اور لُغُوْبٌ (۳۵/۳۵) ساتھ ساتھ آئے ہیں ۔ یعنی جسمانی مشقت اور نفسیاتی تکان ۔ سورہ کہف میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے ساتھی سے کہا ۔ لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا ھٰذَا نَصَباً (۱۸/۶۲) ۔ ہمیں اس سفر سے تکان ہو گئی ہے ۔ سورۂ انشراح میں ہے فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (۹۴/۷) ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب جو مخالفتوں کے بادل چھٹ چکے ہیں تو تمہارے پروگرام کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے ۔ اس کے لئے تم مزید جد و جہد شروع کرو ۔ نَصِبَ ۔ یَنْصَبُ فِی الْاَمْرِ کے معنی جدو جہد کرنا ہیں*۔ عام طور پر جب مخالفت ختم ہو جائے تو پروگرام مکمل ہو جاتا ہے ، لیکن اقامت نظام خداوندی کے پروگرام کا دوسرا حصہ مخالفت ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے ۔ مخالفت کا ختم ہونا گویا حصہ لاَ ہے ۔ اس کے بعد حصہ اِلاَّ (یعنی مثبت پروگرام) شروع ہوتا ہے ۔ یوں اس جماعت کی ساری زندگی جد و جہد میں گذرتی ہے ۔

ن ص ت

نَصَتَ الرَّجُلُ یَنْصِتُ وَاَنْصَتَ (نَصَتَ کے مقابلہ میں اَنْصَتَ زیادہ فصیح ہے) ۔ خاموش ہو جانا ۔ چپ رہنا ۔ کسی کی بات سننے کے لئے خاموش ہو جانا**۔ وَاَنْصِتُوْا (۷/۲۰۴) ۔ جب قرآن کریم پڑھا جائے تو اسے سنو اور خاموش رہو ۔

---

*محیط ۔ **تاج و محیط ۔

ن ص ح

نَصْحٌ ۔ شہد صاف کرنے اور کپڑا سینے کو کہتے ہیں ۔ پہلے معنوں میں نَصَحَ الشَّیْءُ کے معنی ہیں چیز خالص ہو گئی ۔ اَلنَّاصِحُ ۔ شہد خالص ۔ اور دوسرے معنوں میں نَصَحَ الْخَیَّاطُ الثَّوْبَ ۔ درزی نے کپڑے کو سیا ، یا عمدگی سے سیا *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو چیزوں کے درمیان موافقت پیدا کرنا اور انہیں درست کرنا ہوتے ہیں۔ نیز النُّصْحُ والنَّصِیْحَۃُ ضد ہے فریب اور دھوکا دینے کی ۔ اَلنَّاصِحُ وَالنِّصَاحُ ۔ درزی کو کہتے ہیں ۔ اَلنِّصَاحُ ۔ دھاگہ ۔ اَلْمِنْصَحَۃُ ۔ سوئی ۔ نَصْحٌ ۔ رفو کرنا* ۔ لہذا نَصِیْحَۃٌ کے معنی ہوئے کسی کے چاکِ گریباں کا نہایت خلوص کے ساتھ رفو کرنا ۔ کسی کے پھٹے ہوئے کپڑے کو دل کی پوری صفائی کے ساتھ سی دینا ۔ کسی کا ساز گار اور خیر خواہ ہونا *۔ رسول اپنی قوم سے یہی کہتے تھے کہ وَاَنْصَحُ لَکُمْ (۷/۶۲) ۔ میں تمہاری چارہ سازی اور سازگاری کے لئے آیا ہوں ۔ میں نہایت خلوص سے تمہارے پیرہن انسانیت کی رفو گری کی کوشش کر رہا ہوں ۔ تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا (۶۶/۸) ۔ تم خدا کی راہ کی طرف اسطرح واپس آؤ کہ اس سے ہٹ کر پھر کسی اور راستے کو اختیار نہ کرو ۔ اپنے آپ کو اس راستے کے ساتھ نہایت اخلاص کے ساتھ متمسک کر لو ۔ اس سے پیوست ہو جاؤ ۔

ن ص ر

نَصَرَ الْغَیْثُ الْاَرْضَ ۔ بارش نے زمین کو سرسبز و شاداب کردیا۔ اَرْضٌ مَنْصُوْرَۃٌ ۔ وہ زمین جہاں بارش ہو چکی ہو ۔ اَلنَّوَاصِرُ (نَاصِرٌ یا نَاصِرَۃٌ کی جمع) وہ ندی نالے جوکسی وادی میں دور سے آئیں ۔ ابو حنیفہ نے کہا ہے کہ نَاصِرٌ اور نَاصِرَۃٌ اس پانی کو کہتے ہیں جو دورو دراز جگہ سے آئے اور سیلاب کو آگے بڑھتے میں مدد پہنچائے* ۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ نَصْرٌ کے معنے رزق پہنچانے کے ہوتے ہیں** ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنےخیر لانا اور خیر دینا ، بتائے ہیں ۔ نیز النَّصْرُ کے معنے عطیہ و بخشش لکھے ہیں۔

لہذا اس کےبنیادی معنی زمین کی وہ سیرابی ہے جس سے وہ سرسبز و شاداب ہو جائے ۔ قرآن کریم نے اس جماعت کو جو اس کے قوانین کے مطابق زندگی

---

*تاج و محیط ۔ **القرطین ج/۲ صفحہ ۲۹ ۔

بسر کرتی ہے مُفْلِحُوْنَ کہا ہے (۵/۲)۔ یعنی وہ لوگ جن کی کھیتیاں سرسبز و شاداب ہوں۔ جن کی فصلیں کامیاب ہو جائیں۔ (دیکھئے ف۔ ل۔ ح)۔ اس لئے خدا کا قانون وہ بارش ہے جس سے ان کی سعی و عمل کی کھیتی ثمر بار ہوتی ہے۔ اسی کو نصرت خداوندی کہتے ہیں۔ انسان کی وہ کوشش جو قانونِ خداوندی کے مطابق نہ ہو، اس کسان کی محنت کی طرح ہے جس کی زمین پانی سے محروم رہ جائے۔ انہی کو قرآن کریم نے اَخْسَرِیْنَ اَعْمَالاً اور ضَلَّ سَعْیُھُمْ (۱۸/۱۰۳-۱۰۴) کہا ہے۔ یعنی جن کی کوششیں رائیگاں چلی گئیں۔ اور ان کے کاروبار نے انہیں سخت نقصان پہنچایا۔ سورۃ آلِ عمران میں نَصَرَ بمقابلہ خَذَلَ آیا ہے۔ خَذَلَ کے معنی ہیں کسی کا ساتھ چھوڑ دینا۔ اس لئے نَصَرَ کے معنی ہیں کسی کا ساتھ دینا۔

چونکہ پانی، کھیتی کے اُگنے میں مدد دیتا ہے اسی لئے نَصْرٌ کے معنی اعانت اور مدد کرنا ہیں۔ محیط نے معونت اور نصرت میں فرق بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ نُصْرَت دفع مضرت کے لئے خاص ہے، اور معونت عام ہے۔ اِسْتِنْصَارٌ۔ مدد طلب کرنا۔ اِسْتَنْصَرَہٗ عَلٰی فُلَانٍ اس سے فلاں کے خلاف مدد مانگی۔ اِنْتَصَرَ۔ وہ ظالم کے ظلم سے محفوظ رہا۔ اس نے انصاف حاصل کرلیا۔ اس نے انتقام لے لیا*۔ سورۃ انبیاء میں ہے وَ انْصُرُوْا اٰلِھَتَکُمْ (۲۱/۶۸)۔ اپنے معبودوں کا بول بالا کرو۔

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ خدا کی نصرت، ان ثمرات کو کہتے ہیں جو اس کے قانون کے مطابق عمل کرنے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا خدا کی نصرت (یا تائید غیبی) یونہی بیٹھے بٹھائے نہیں مل جاتی۔ خدا کا ارشاد ہے یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ (۴۷/۷)۔ اے ایمان والو۔ اگر تم نے خدا کی مدد کی تو وہ تمہاری مدد کریگا۔ خدا کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے متعین کردہ نظام کو دنیا میں قائم کرو۔ اس کے قوانین کے مطابق عمل کرو۔ اگر تم نے یہ کر دیا تو اس نظام اور قانون کی برکات تمہارے شامل حال ہو جائینگی۔ اوراس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وَ یُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ (۴۷/۷)۔ وہ تمہارے پاؤں جما دے گا۔ تمہیں ثابت قدمی عطا کر دے گا۔ اس کے برعکس، جو لوگ اس قانون کے مطابق چلنے سے انکار کریں گے۔ اَضَلَّ اَعْمَالَھُمْ (۴۷/۸)۔ ان کے اعمال بے نتیجہ رہ جائینگے۔

*تاج و محیط۔ **القرطبین۔ ج/۲ صفحہ ۲۹۔

سورۃ ھود میں ہے مَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰہِ (۱۱/۳۰) - اس کے معنی ہیں مجھے خدا کے عذاب سے کون بچا سکتا ہے - یا خدا کے خلاف میری کون مدد کرسکتا ہے - مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے - یعنی اگر میں قانون خداوندی کے خلاف چلوں تو میری اس غلط روش کے تباہ کن نتائج سے مجھے کون بچا سکتا ہے - سورۃ شوریٰ میں ہے وَ الَّذِیْنَ اِذَا اَصَابَھُمُ الْبَغْیُ ھُمْ یَنْتَصِرُوْنَ (۴۲/۳۹) - جب ان پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو وہ اپنی حفاظت کرتے ہیں - سورۃ محمد میں ہے وَ لَوْ یَشَآءُ اللّٰہُ لَانْتَصَرَ مِنْھُمْ (۴۷/۴) - اس کے معنی ظالم سے بدلہ لینے کے ہیں - سورۃ قمر میں ہے اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (۵۴/۱۰) - ''میں مغلوب ہوں سو تو میرا بدلہ لے'' -

اَلْاَنْصَارُ - (۹/۱۰۰) قرآن کریم میں یہ لفظ مہاجرین کے مقابلہ میں آیا ہے - اس سے مراد (مدینہ کے) وہ مومنین ہیں جنہوں نے مہاجرین کی مدد کی اور اس طرح نظامِ خداوندی وہاں متمکن ہوا - ویسے اَنْصَارُ اللّٰہِ (۳/۵۲) کے معنی ہیں ، دینِ خداوندی کی مدد کرنے والے -

نَصاریٰ

نَصَاریٰ حضرت عیسیٰؑ کے متبعین بخلاف ھُوْد (۲/۱۱۱)- واحد نَصْرَانِیٌّ ہے (۳/۶۶) - یَھُوْدِیٌّ کے بالمقابل - نَصْرَانٌ اور نَصْرَانِیٌّ دونوں کی جمع نَصاریٰ ہے -

ن ص ف

نِصْفٌ - نَصْفٌ - نُصْفٌ - کسی چیز کی دو شقوں میں سے ایک شق یا اس کے دو (برابر) اجزاء میں سے ایک جزو - یعنی آدھا*- قرآن کریم میں ہے فَلَھَا النِّصْفُ (۴/۱۱)- اس (مؤنث) کے لئے نصف (آدھا) ہے - اَلْاِنْصَافُ فِی الْمُعَامَلَۃِ اسے کہتے ہیں کہ جسقدر فائدہ کسی سے حاصل کرے اتنا فائدہ اسے پہنچائے بھی - جسقدر کسی سے اجرت لے اسی قدر اس کا کام بھی کرے - کسی سے حقوق مانگے تو اس کے واجبات ادا کرے** - قرآن کریم میں عَدْل اور قِسْط کے الفاظ آئے ہیں - انصاف کا لفظ نہیں آیا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْاِنْصَافُ فِی الْمُعَامَلَۃِ کے معنی ہیں آدھے پر راضی ہو جانا -

*تاج - **راغب -

ن ص و

اَلنَّاصِیَۃُ ۔ سر کا اگلا حصہ ۔ یا سر کے اگلے حصے کی وہ آخری حد جہاں بال اُگے ہوئے ہوتے ہیں* ۔ (لیکن دیگر لغات میں سر کے اگلے حصہ کی قید نہیں ہے) ۔ پیشانی کے بال ۔ (جمع اَلنَّوَاصِیْ) مجازاً یہ لفظ عزت و شرف کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے* ۔ فُلَانٌ نَاصِیَۃُ قَوْمِہٖ وہ اپنی قوم کا سردار ہے** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بہتر چیز کو انتخاب کرنے یا کسی چیز میں بلندی اور شان و اہمیت ہونے کے ہیں ۔ اَخَذَ بِنَاصِیَتِہٖ ۔ پیشانی کے بال پکڑنا ۔ کسی کو بے بس کرکے قبضے میں رکھنا ۔ سورۃ ہود میں ہے وَمَا مِنْ دَابَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِیَتِھَا (۱۱/۵۶) ۔ یعنی ہر ذی حیات خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے ۔ ہر ایک پر اس کا قانون حاوی ہے ۔ کوئی اس کے قانون کی حد سے باہر نہیں ۔ سب اس کے قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں ۔

سورۃ رحمٰن میں ہے فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَالْاَقْدَامِ (۵۵/۴۱) ۔ وہ پیشانی کے بالوں اور پاؤں سے پکڑے جائینگے ۔ ان پر پوری گرفت ہوگی ۔

ن ض ج

نَضِجَ الثَّمَرُ ۔ پھل اچھی طرح پک گیا ۔ ھُوَ نَضِیْجُ الرَّاْیِ ۔ وہ پختہ اور محکم رائے والا ہے* ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو آخری حد تک پکانا بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ بعد ازاں یہ استعارۃً ہر چیز کے انتہائی پختہ ہو جانے کے لئے بولا جاتا ہے ۔ یعنی در اصل یہ لفظ آگ وغیرہ کی تپش سے جلانے اور پکانے کے لئے بولا جاتا ہے ۔ اَنْضَجَ الطَّاھِیْ اللَّحْمَ کے معنے ہیں پکانے والے نے گوشت کو اتنا پکایا کہ وہ گل گیا اور اس کے اجزاء ایک دوسرے سے الگ ہوگئے* ۔

سورۃ نساء میں ہے کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ (۴/۵۶) ۔ یہاں نَضِجَ کے معنی پک کر پختگی تک پہنچنا نہیں ۔ اس کے معنی گل کر ریزہ ریزہ ہوجانا ہیں ۔ یعنی ان کی قوت اور صلابت ختم ہوجائے گی (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ج ۔ ل ۔ د) ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔

ن ض خ

نَضَخَہٗ ۔ یَنْضَخُہٗ ۔ اس پر چھڑکا ۔ نَضَخَ الْمَاءُ ۔ پانی کا جوش مار کر ابلنا ۔ پانی کا چشمہ سے ابل کر بہنا ۔ عَیْنٌ نَضَّاخَۃٌ ۔ جوش مار کر ابلنے والا چشمہ* ۔ ابن فارس نے لکھا ہے ۔ کہ اس کے معنی کثیر پانی والا چشمہ ہیں ۔

قرآن کریم نے ''جنتی باغات'' کے متعلق کہا ہے کہ ان میں عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ (۵۵/۶۶) ہیں ۔ جوش مار کر ابلنے والے چشمے ۔ وہ قوتیں جو فوارہ کی طرح اپنے زورِ دروں سے بلندیوں کی طرف لے جائیں ۔

ن ض د

نَضَدَ مَتَاعَہٗ یَنْضِدُ ۔ اپنے سامان کو اوپر تلے رکھنا ۔ بعض چیزوں کو بعض پر ترتیب سے رکھنا ۔ اس طرح ترتیب سے رکھا ہوا سامان نَضِیْدٌ ومَنْضُوْدٌ کہلائیگا ** ۔ یعنی ، تہ بہ تہ (۵۰/۱۰ ؛ ۵۶/۲۹) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چند چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ نظم و ترتیب کے سے ملا کر رکھنے کے ہوتے ہیں ، خواہ انہیں کھڑا رکھا جائے یا چوڑائی میں رکھا جائے ۔

اَلْاَنْضَادُ مِنَ الْجِبَالِ ۔ پہاڑوں کی وہ چٹانیں یا پتھر جو ایک دوسرے کے اوپر تلے ہوں ۔ اَلْاَنْضَادُ مِنَ السَّحَابِ ۔ وہ بادل جو تہ بہ تہ ایک دوسرے کے اوپر ہوں** ۔ سورہ ھود میں ہے وَاَمْطَرْنَا عَلَیْھَا حِجَارَۃً مِنْ سِجِّیْلٍ مَنْضُوْدٍ (۱۱/۸۲) ہم نے ان پر پے درپے اور مسلسل پتھروں کی بارش کی ۔ یا ایسے پتھر برسائے جن کی مختلف تہیں (Layers) تھیں ۔

ن ض ر

اَلنَّضْرَۃُ ۔ خوش حالی و آسودگی ۔ روزی ۔ تونگری ۔ حسن ۔ دراصل النَّضَارَۃُ کے معنی چہرہ کا حسن اس کی آب و تاب اور تروتازگی ہے ۔ اَلنَّاضِرُ گہرے سبز رنگ والے کو کہتے ہیں ۔ اَلنُّضَارُ ۔ سونے وغیرہ کا خالص جوہر ۔ قَدْ اَنْضَرَ الشَّجَرُ ۔ درخت کے پتے سرسبز ہوئے** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے معنی حسن و جمال اور خالص ہونے کے ہیں ۔

---

*تاج و محیط ۔ **تاج و محیط و راغب ۔

قرآن کریم میں ہے وُجُوْهٌ یَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ (۲۲/۷۵) - اس دن کچھ چہرے ترو تازہ ، ھشاش بشاش ھونگے - یعنی وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَسُرُوْرًا (۱۱/۷۶) - انہیں شادابی اور مسرت حاصل ھوگی - تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ (۲۴/۸۳) - '' تو ان کے چہروں پر نعمتوں کی شادابی دیکھیگا '' - یہ ان کی پہچان کی علامت ھوگی - یہ ہے جنتی زندگی کی کیفیت -

ن ط ح

نَطَحَ يَنْطِحُ - اس نے سینگ مارا - اَلنَّطِيْحَةُ - وہ جانور جو کسی دوسرے جانور کے سینگ مارنے سے مر جائے* - قرآن کریم نے اسے حرام قرار دیا ہے (۳/۵) - اَلنَّوَاطِحُ - شدائد و مصائب* -

ن ط ف

اَلنُّطْفَةُ - صاف پانی ، کم ھو یا زیادہ - ازھری نے کہا ہے کہ عرب تھوڑے سے پانی کو بھی نُطْفَةٌ کہتے ھیں اور زیادہ پانی کو بھی ، لیکن یہ لفظ تھوڑے پانی کے لئے خاص ہے - اَلنُّطْفَةُ - دریا - سمندر - آدمی کا مادہٴ منویہ - نَطَفَ الْمَاءُ - پانی بہ گیا - تھوڑا تھوڑا کرکے ٹپک گیا** - ابن فارس نے اس مادہ کے اصل معنوں میں نمی اور تری بتائے ھیں اور لکھا ہے کہ بعد میں استعارةً اَلنَّطَفُ لتھڑ جانے کو کہتے ھیں اور بیشتر یہ مذموم طور پر بولا جاتا ہے - شَيْءٌ نَطِيفٌ - عیب دار چیز -

قرآن کریم میں انسانی خلقت کے ایک مرحلہ کے متعلق متعدد مقامات پر آیا ہے کہ اسے نُطْفَةٌ سے پیدا کیا (۴/۱۶) - یعنی اس سے جنین کی پیدائش ھوتی ہے -

ن ط ق

نَطَقَ - آواز دار حروف کے ساتھ بولنا جس سے معنی سمجھ میں آئے ھوں - حیوانات کے بولنے کو نُطْقٌ نہیں بلکہ صَوْتٌ کہتے ھیں - اَنْطَقَهُ اللّٰهُ - خدا نے اسے بلوایا*** - صاحب محیط نے کہا ہے کہ نُطْقٌ کا لفظ انسان کے کلام کے ساتھ مخصوص ہے - ویسے کسی بات کے واضح کر دینے کو بھی کہتے ھیں - جیسے نَطَقَ الْكِتَابُ کے معنی ھیں کتاب نے بیان کر دیا اور واضح کر دیا**** - اَلنَّاطِقَةُ کوکھ کو کہتے ھیں اور اَلنِّطَاقُ اُس پٹکے (یا لہنگے ازار وغیرہ) کو جو کمر کے ساتھ باندھ لیا جائے*** - اس

*تاج و محیط و ابن فارس - **تاج و محیط و راغب - ***تاج - ****محیط -

اعتبار سے راغب نے کہا ہے کہ نُطْقٌ وہ لفظ ہے جو معنی کو اپنے گھیرے میں لے لینے کی وجہ سے نِطَاقٌ کیطرح ہو***۔ ابن فارس نے بھی اس کے بھی دو بنیادی معنی لکھے ہیں۔ یعنی (۱) کلام یا کلام کے مشابہ کوئی چیز۔ اور (۲) ایک قسم کا لباس۔ یعنی النِّطَاق۔ ازار۔

قرآن کریم میں ہے اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ (۲۱/۶۳)۔ اگر وہ بولتے ہیں تو۔ سورہ جاثیہ میں ہے هٰذَا كِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ (۴۵/۲۹) یہ ہماری کتاب (تمہارا اعمالنامہ) ہے جو تمہارے خلاف ہر بات کو حق کے ساتھ بتا دیتی (یا واضح کر دیتی) ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ اهل جہنم اپنے جسموں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کس طرح شہادت دی۔ وہ کہیں گے کہ اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (۴۱/۲۱)۔ ہمیں اسی خدا نے بولنے کی قوت دی جس نے تمام اشیاء کو قوت گویائی عطا کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں نُطْقٌ سے مراد زبان سے باتیں کرنا نہیں بلکہ کسی طرح حقیقت کو واضح کرنا ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ تمہاری ہر نقل و حرکت اسکی شہادت دیتی ہے کہ . . . . .

سورہ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو مَنْطِقَ الطَّيْرِ (۲۷/۱۶) سکھائی گئی تھی۔ اس کے معنی ہیں قبیلہ طیر کی بولی۔ (یا بطور استعارہ گھوڑوں کے لشکر (رسالہ) کے قواعد و ضوابط)۔ (دیکھئے عنوان ط۔ی۔ر)۔ اگر اس سے مفہوم ''پرندوں کی بولی'' لیا جائے تو اس سے مراد ہوگی وہ علم جس سے انسان، پرندوں کی نقل و حرکت اور آوازوں سے ان کی کیفیات کا اندازہ کر سکتا ہے۔ یہ چیز، پرندوں کے احوال و کوائف کے مطالعہ اور مشاھدہ سے حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن ہم پہلے مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں۔

ن ظ ر

نَظَرَ۔ يَنْظُرُ۔ آنکھ سے دیکھنا۔ کسی چیز میں غور کرنا۔ اندازہ کرنا اور دوسری چیزوں کے ساتھ ملا کر اس کی بابت قیاس کرنا۔ چنانچہ اَلنِّظَارُ فراست کو کہتے ہیں۔ توجہ دینے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اُنْظُرْنِیْ۔ میری طرف توجہ دو۔ میری طرف التفات کرو*۔ ابن فارس نے بھی کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی غور کرنا اور معائنہ کرنا ہیں۔

نیز اس کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔ نَظَرْتُهٗ وَ انْتَظَرْتُهٗ۔ میں اس کی آمد کا منتظر رہا۔ اسی سے مہلت دینے کے معنوں میں اَنْظَرَهٗ

*تاج۔ **محیط۔ ***راغب۔

استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اس کو مہلت دیدی۔ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ (۱۵/۳۶)۔ "اس (ابلیس) نے کہا۔ میرے رب تو مجھے یوم البعث تک مہلت دے دے۔ (اللہ تعالیٰ نے) کہا کہ تو ان میں سے ہے جنہیں مہلت دی گئی ہے"۔ سورۂ بقرہ میں ہے کہ اگر مقروض تنگ دست ہو تو فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ (۲/۲۸۰)۔ "اسے فراخی تک مہلت دیدینا چاہئے"۔

تَنَاظَرَ کے معنے ہیں آمنے سامنے ہونا۔ اَلنَّظِیْرُ ۔ مثل اور مشابہ۔ اَلنِّظْرُ کے بھی یہی معنی آتے ہیں*۔

اَلنَّظْرَۃُ کے معنی ہیں عیب اور بدھیئتی۔ اَلْمَنْظُوْرُ ۔ عیب دار۔ معیوب*۔ حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں جہاں کہا گیا ہے فَنَظَرَ نَظْرَۃً فِی النُّجُوْمِ (۳۷/۸۸)۔ تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ قوم ستاروں کی پرستش کرتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں کی ماہیت پر غور و فکر کیا اور انہیں بتایا کہ ان میں وہ کیا کیا کمزوریاں ہیں جن کی وجہ سے وہ معبود بن سکنے کے قابل نہیں ہوسکتے۔ (مثلاً یہ کہ وہ خود مجبور ہیں۔ ان کا طلوع و غروب بھی ان کے اپنے اختیار میں نہیں۔ وہ آفِلِیْنَ ڈوب جانے والے ہیں وغیرہ وغیرہ)۔ اور اس کے بعد کہا اِنِّیْ سَقِیْمٌ (۳۷/۸۹)۔ میں اس قسم کے معبودوں سے بیزار ہوں۔ میں ان کی پرستش نہیں کرسکتا۔

نَظَرَ لَھُمْ ۔ کے معنی ہیں ان کی وجہ سے درد مند ہوا اور ان کی مدد کی۔ اور نَظَرَ بَیْنَھُمْ کے معنی ہیں ان کے درمیان فیصلہ کردیا*۔

اگرچہ نَظَرَ کے معنی غور کرنے کے بھی ہیں لیکن چونکہ اس کے اولین معنی صرف دیکھنے کے ہیں اس لئے قرآن کریم نے نَظَرَ اور بَصَرَ میں فرق کرکے بتا دیا۔ سورۂ اعراف میں ہے وَتَرٰھُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (۷/۱۹۸)۔ تو دیکھے گا کہ وہ صرف تیری طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں (لیکن جو کچھ تو کہتا ہے اس پر) چشم بصیرت سے غور نہیں کر رہے ہوتے۔ اس طرح کے "دیکھنے والوں" کو قرآن کریم اَلْعُمْیُ کہتا ہے۔ یعنی اندھے (۱۰/۴۳)۔ وہ جن کی "دل کی آنکھیں" اندھی ہوجاتی ہیں (۲۲/۴۶)۔

ن ع ج

اَلنَّعَجُ ۔ موٹا ہونا۔ نَعِجَتِ الْاِبِلُ ۔ اونٹ فربہ ہوئے۔ اَلنَّاعِجَۃُ نرم اور ہموار زمین جہاں پیداوار بہت اچھی ہوتی ہو۔ اَلنَّعْجَۃُ ۔ مادہ بھیڑ۔

*تاج و راغب۔

ھرنی ۔ نیل گائے یا پہاڑی بکری* ۔ (جمع نِعَاج*) ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (واحد اور جمع) (۳۸/۲۳ : ۲۴) میں آیا ہے۔

ن ع س

اَلنُّعَاسُ ۔ نیند کی گرانی سے حواس میں جو سکون اور خاموشی سی پیدا ہونے لگتی ہے* ۔ صاحب محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ نَوْمٌ تو نیند کی وہ حالت ہے جسمیں انسان کے حواس قطعاً معطل ہو جاتے ہیں اور نُعَاسٌ اس کی ابتدائی حالت کو کہتے ہیں ۔ بعض نے کہا ہے کہ سِنَۃٌ ۔ سر میں نیند کی گرانی کو کہتے ہیں ۔ نُعَاسٌ ۔ آنکھ میں ہوتی ہے اور نَوْمٌ دل میں** ۔ راغب نے نُعَاسٌ کو نَوْمٌ قَلِیْلٌ کہا ہے ۔ ہلکی سی نیند ۔ اور لکھا ہے کہ قرآن کریم کی آیت (۸/۱۱) میں اس سے مراد سکون و اطمینان ہے***۔ قرآن کریم میں ہے اِذْ یُغَشِّیْکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَۃً (۸/۱۱) جب خدا نے امن و سکون کے لئے تم پر نُعَاسٌ طاری کردی ۔ (نیز ۳/۱۵۳) ۔ اس سے مراد سکون و اطمینان ہے نہ کہ اونگھ۔

ن ع ق

نَعَقَ الرَّاعِی بِغَنَمِہٖ ۔ یَنْعِقُ ۔ نَعَاقاً ۔ چرواہے کا بھیڑ بکریوں کو (ہانکنے کے لئے) جھڑکنا اور آواز دینا ****۔

سورہ بقرہ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اپنی عقل و فکر سے کام نہیں لیتے اور آنکھیں بند کئے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ہیں ۔ انہیں بھیڑ بکریوں سے تشبیہ دی ہے جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ چرواہے کی آواز پر نقل و حرکت کرتی ہیں ، اپنی سمجھ بوجھ سے کچھ نہیں کرتیں ۔ چرواہے کی یہ آواز بھی محض '' آواز'' ہوتی ہے جسکے معنی کچھ نہیں ہوتے ۔ اندھی تقلید کرنے والے بھی الفاظ کے مفہوم کو نہیں سمجھتے ۔ ان کے متعلق جو کچھ انہیں بتا دیا جاتا ہے (کہ یہ کہا جائے تو اسکا مطلب یہ ہوگا اور وہ کہا جائے تو وہ) اسکے مطابق کرتے چلے جاتے ہیں ۔ مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً (۲/۱۷۱) ۔ '' حقائق سے انکار کرنے والوں کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو ایسے آواز دے رہا ہو جو بجز پکار اور آواز کے کچھ نہیں سنتا ۔ '' (یعنی صُمٌّۢ ۔ بُکْمٌ عُمْیٌ ۔ فَہُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ۔ بہرے ۔ گونگے ۔ اندھے ۔ جو عقل سے کام

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔ ****تاج و محیط و ابن فارس ۔

نہیں لیتے)۔ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے ہمارے مروجہ مذہب کی کیسی عمدہ تصویر کھینچی ہے۔ عوام بھیڑ بکریاں ہیں اور انکے پیشوا چرواہے جنہوں نے اپنے آباء سے چند الفاظ سن رکھے ہیں جنہیں وہ بلا سمجھے بوجھے دہراتے رہتے ہیں۔ اور عوام ان کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کرتے رہتے ہیں۔

ن ع ل

نَعْلٌ* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے نشیبی ہونے اور نچلا حصہ ہونے کے ہیں۔ اَلنَّعْلُ ۔ جوتا ۔ ہر وہ چیز جس سے پاؤں کا زمین پر لگنے سے بچاؤ کیا جائے*۔ سورہ طٰہٰ میں ہے کہ حضرت موسٰی سے کہا گیا کہ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ (۱۲/۲۰)۔ اپنے دونوں جوتے اتار دو۔ (ذرا اطمینان سے بیٹھو۔ اور سکون سے بات سنو)۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان خ ۔ ل ۔ ع)

ن ع م

نَعِمَ بِهِ عَيْناً ۔ اس نے کسی چیز یا منظر کو ایسی کیفیت لئے ہوئے پایا جس سے اسکی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور حاصل ہوا۔ دراصل تَنَعُّمَةٌ* ایک پودا ہوتا ہے جسکے پتے نرم و نازک اور سرسبز و شاداب ہوتے ہیں اور وہ پانی پر پیدا ہوتا ہے جس سے اسکی تروتازگی میں کبھی فرق نہیں آتا۔ ثَوْبٌ نَاعِمٌ* ۔ اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو بہت نرم اور آرام دہ ہو۔ اور نُعَامٰی ۔ جنوبی ہوا کو کہتے ہیں جو بڑی خوشگوار اور تمام ہواؤں سے زیادہ مرطوب ہوتی ہے۔ ان معانی کے اعتبار سے النَّاعِمَةُ ۔ الْمُتَنَاعِمَةُ والْمُنَعَّمَةُ ۔ آسودگی اور خوشگوار زندگی گذارنے والی خوش خوراک عورت کو کہتے ہیں**۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں بلندی اور سرفرازی کا مفہوم بھی ہے۔ اَلنَّعَامَةُ ۔ بلند عمارت جو کسی پہاڑ پر چھجے کیطرح ہو۔ کنوئیں پر جمائی ہوئی ابھری ہوئی چٹان۔ اونچا نشان یا جھنڈا جس سے راستے کا پتہ چلایا جائے**۔ اِبْنُ النَّعَامَةِ ۔ وہ پانی پلانے والا جو کنوئیں پر کھڑا رہتا ہے**۔

قوم کی اجتماعیت اور باہمی اتفاق کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے**۔ کہتے ہیں شَالَتْ نَعَامَتُهُمْ ۔ ان کا شیرازہ بکھر گیا۔ اَلنِّعْمَةُ ۔ وہ حالت جس میں انسان لذت محسوس کرتا ہے***۔ نیز مسرت ۔ مال و دولت آسودگی و خوش حالی اور احسان کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے*۔

*تاج۔ **تاج و محیط۔ ***راغب۔

ان معانی سے واضح ہے کہ معاشرتی زندگی کے ہر پہلو کا خوشگوار، کشادہ، ملائم، آسودہ، بلند اور اذیت و تکلیف سے دور ہو جانا نِعْمَتٌ ہے۔ چنانچہ سورہ نحل میں دنیاوی زندگی کے مختلف ساز و سامان کے تذکرہ کے بعد کہا ہے کَذَالِکَ یُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَیْکُمْ (۱۶/۸۱)۔ اس سے نِعْمَتٌ کے معنی واضح ہیں۔ سورۂ لقمٰن میں اس سامان کو نِعْمَتُ اللہِ کہا گیا ہے جو کشتیوں کے ذریعے ادھر سے ادھر منتقل کیا جاتا ہے (۳۱/۳۱)۔ سورہ آلِ عمران میں میدان جنگ کی فتوحات اور مال غنیمت کو بھی نِعْمَتٌ کہا گیا ہے (۳/۱۷۳)۔ سورۂ نحل میں نِعْمَتٌ کے مقابل ضَرٌّ لا کر اسکے مفہوم کو واضح کر دیا گیا ہے (۱۶/۵۳)۔ یعنی زندگی کی اذیتوں اور تکلیفوں سے دور رہنا۔

سورۃ دخان میں زندگی کی تمام آسودگیوں اور خوش حالیوں کو نَعْمَةٌ سے تعبیر کیا گیا ہے (۴۴/۲۷)۔ سورۃ غاشیہ میں نَاعِمَةٌ کے مقابلہ میں خَاشِعَةٌ اور نَاصِبَةٌ (تھکے ماندے۔ افسردہ و غمگین۔ ذلیل و خوار) لا کر، زندگی کی تر و تازگی اور شادابی و شگفتگی کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ دیکھئے (۸۸/۲-۸)۔

بلندی اور رہنمائی (ہدایت خداوندی) کے مفہوم کی وضاحت کے لئے سورۃ ابراهیم میں نِعْمَةٌ اللہِ کے مقابلہ میں کُفْرٌ کا لفظ آیا ہے (۱۴/۲۸)۔ اس مقام پر کفر کے معنے زندگی کی خوشگواریوں کی ناقدر شناسی بھی ہوسکتے ہیں۔

نَاعِمَةٌ (۸۸/۸)۔ تر و تازہ خوشگواریاں لئے ہوئے۔ نَعْمَةٍ (۴۴/۲۷) آسودگی۔ نِعْمَةٌ (۲۶/۲۲) فضل و کرم۔ احسان۔ اس کی جمع اَنْعُمٌ آتی ہے۔ کائنات کی ہر شے جسے انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے نِعْمَةٌ ہے (۱۴/۳۲-۳۴)۔ نیز اقوام عالم پر فضیلت مل جانا بھی نعمت ہے (۲/۴۷)۔

طبعی آسائشوں کے علاوہ ذہنی صلاحیتوں کے عمدہ ہونے کے لئے بھی نِعْمَةٌ کا لفظ آیا ہے۔ مثلاً (۵۲/۲۹ و ۶۸/۲)۔ اور جسمانی صفائی اور تندرستی کے لئے بھی (۵/۶)۔

قرآن کریم نے اس قوم کو جو زندگی کے بہترین اور بلند ترین مقام پر ہو، مُنْعَمٌ عَلَیْهِ سے تعبیر کیا ہے۔ اور انہی کے راستے پر چلنے کی دعائیں سکھائی گئی ہیں (۱/۶)۔ نِعْمَةٌ کے ان تمام معانی کو پیش نظر رکھنے سے جو اوپر لکھے جا چکے ہیں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایسی قوم کن خصوصیات کی حامل اور کس مقام پر سرفراز ہوگی۔ انہی لوگوں کو قرآن کریم

مؤمن کہتا ہے ۔ لہذا ، جنہیں یہ کچھ حاصل نہیں یا جو اس کے حصول کی جد و جہد نہیں کرتے ۔ سمجھ لیجئے کہ وہ قرآن کریم کی رو سے مؤمن نہیں ۔

نِعْمَ کے معنے ہیں ''بہت ہی اچھا ہے'' ۔ نِعْمَ الْمَاهِدُوْنَ (۵۱/۴۸) ۔ بہت ہی اچھے ہیں ہم سامانِ زندگی کے بہم پہنچانے والے ۔ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ (۴/۵۸) بہت ہی اچھی بات ہے جسکی تمہیں نصیحت کر رہا ہے ۔ (یہ در اصل نِعْمَ + مَا ہے ۔ یہ مَا موصولہ ہے) ۔

نَعْمٌ و نَعَمٌ جمع اَنْعَامٌ کے عام معنی مال مویشی کے ہیں ۔ عرب عام طور پر یہ لفظ اونٹ ، بکری اور گائے کے لئے بولتے تھے ۔ بعض نے ان میں بھیڑ اور دنبہ کو بھی شامل کیا ہے ۔ لیکن بعض نے اسے صرف اونٹوں کےلئے مخصوص قرار دیا ہے* ۔ قرآن کریم نے اونٹ ۔ گائے ۔ بھیڑ اور بکری ۔ چاروں کو اس میں شامل کیا ہے (۶/۱۴۳-۱۴۴ و ۳۹/۶) ۔

قرآن کریم میں ہے اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ (۵/۱ ; ۲۲/۲۸-۳۰) ۔ تمہارے لئے بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ حلال کئے گئے ہیں ، بجز ان کے جن کے متعلق قرآن کریم میں الگ حکم دیا گیا ہے ۔ یہ الگ حکم اسی سورت میں دو آیات آگے چل کر ہے جس میں مُردار ۔ خون ۔ خنزیر ۔ کے گوشت کو اور ہر اس چیز کو جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے حرام قرار دیا گیا ہے (۵/۳) ۔

جیسا (کہ ب ۔ ہ ۔ م) کے عنوان میں لکھا جا چکا ہے ، بَهِيْمَةٌ کے معنے ہیں وہ جو بول نہ سکے ۔ اس اعتبار سے بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ کے معنی ہونگے ، مویشی ، جو بول نہیں سکتے ۔ انگریزی میں جیسے (Dumb Cattle) کہا جاتا ہے ۔ یعنی یہ لفظ (بَهِيْمَةٌ) اَنْعَامٌ کی صفت ہے ۔ اس سے یہ مفہوم نہیں کہ اَنْعَامٌ میں سے جو بَهِيْمَةٌ (گونگے) ہیں وہ حلال ہیں ۔ باقی نہیں ۔ اَنْعَامٌ تو سب کے سب بَهِيْمَةٌ (گونگے) ہوتے ہیں ۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ، قرآن کریم نے اونٹ ، گائے ، بھیڑ اور بکری کو انعام میں شامل کیا ہے ۔ لیکن (جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا) بهيمة الانعام میں تمام وہ حیوان شامل ہیں جو چرتے چگتے ہیں ۔

سورۃ فاطر میں اَنْعَامٌ کو انسان اور دَوَابٌّ سے الگ بتایا گیا ہے (۳۵/۲۸) ۔ اگرچہ دَوَابٌّ میں مجموعی طور پر تمام جاندار آجاتے ہیں (دیکھئے عنوان د ۔ ب ۔ ب) ۔ لیکن یہاں دواب کے معنے پیٹ کے بل چلنے والے جانور ہونگے ۔ لہذا ، اَنْعَامٌ سے مراد چارپائے ہونگے ۔

---

*تاج ۔

سورة طٰہٰ میں ہے کہ نباتات میں سے تم خود بھی کھاؤ اوراپنے اَنْعَام کو بھی کھلاؤ۔ کُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَکُمْ (۲۰/۵۴ نیز ۱۰/۲۴ ; ۳۲/۲۷ ; ۷۹/۳۳ ; ۸۰/۳۲)۔ اس سے ظاہر ہے کہ اَنْعَام چرنے ، چگنے والے جانور ہیں - جنہیں تم چرا کر لاتے ہو - (۱۶/۶) -

سورة نحل میں ہے کہ تم اَنْعَام کا دودھ پیتے ہو (۱۶/۶۶) - سورة المؤمنون میں ہے کہ تم ان کا دودھ بھی پیتے ہو اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد حاصل کرتے ہو - ان میں سے تم کھاتے بھی ہو اور سواری بھی کرتے ہو (۲۳/۲۱) - ان کی اُون سے کپڑے بناتے ہو (۱۶/۵) - ان کی کھالوں کے خیمے بناتے ہو (۱۶/۸۰) - ان سے بار برداری کا کام لیتے ہو (۱۶/۷)۔ ان میں حَمُوْلَۃً بھی ہیں اور فَرْشًا بھی (۶/۱۴۳) - یعنی جو بوجھ لادنے اور سواری کرنے کے کام آئیں - (دیکھئے عنوان ح - م - ل) - اور جو ان کاموں کے لئے چھوٹے ، یعنی زمین گیر ہوں (دیکھئے عنوان ف - ر - ش) - (۴۳/۱۲) میں اَنْعَام کے متعلق ہے کہ تم ان کی پیٹھ پر سوار ہوتے ہو - سورة یٰسٓ میں ان تمام فوائد کو اکٹھا بیان کر دیا گیا ہے جہاں فرمایا فَمِنْھَا رَکُوْبُھُمْ وَمِنْھَا یَاْکُلُوْنَ - وَلَھُمْ فِیْھَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ (۳۶/۷۲-۷۳)۔ ان میں سے ان کے لئے سواری کا کام دینے والے ہیں - اور وہ بھی جنہیں یہ کھاتے ہیں - اور ان کے لئے ان میں (اور) بہت سی فائدہ کی چیزیں ہیں اور (پینے کا) دودھ بھی۔ اسی طرح سورة مومن میں ہے اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْکَبُوْا مِنْھَا وَمِنْھَا تَاْکُلُوْنَ - وَلَکُمْ فِیْھَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَیْھَا حَاجَۃً فِیْ صُدُوْرِکُمْ وَعَلَیْھَا وَعَلَی الْفُلْکِ تُحْمَلُوْنَ (۴۰/۷۹-۸۰) - اس میں بھی چوپایوں کے کھانے ، ان سے سواری کا کام لینے ، بوجھ لادنے اور دیگر فوائد کا ذکر ہے -

سورة نحل میں ان مویشیوں کو الگ بیان کیا گیا ہے جنہیں وہ لوگ (عرب) صبح و شام چرایا کرتے تھے (۱۶/۶) - اور بوجھ اٹھانے والوں کا ذکر الگ ہے (۱۶/۷) - اور خَیْلَ (گھوڑے) بِغَالَ (خچر) اور حَمِیْرَ (گدھے) کے متعلق ہے لِتَرْکَبُوْھَا وَزِیْنَۃً (۱۶/۸) - وہ تمہارے لئے سواری کا کام دیتے ہیں اور باعث زینت بھی ہیں - اسی طرح سورة آل عمران میں اَلْخَیْلِ الْمُسَوَّمَۃِ وَالْاَنْعَامِ (۳/۱۴) الگ الگ آیا ہے - یعنی پلے ہوئے نشان زدہ گھوڑے اور مال مویشی - سورة مومن میں ہے اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْکَبُوْا مِنْھَا وَمِنْھَا تَاْکُلُوْنَ (۴۰/۷۹) - اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے چارپائے بنائے تاکہ تم ان میں سے بعض پر سوار ہو - اور بعض کو تم کھاتے بھی ہو -

ان تصریحات سے ظاهر هے کہ قرآن کریم کی رو سے اَلْاَنْعَام سے مراد چرنے چگنے والے مویشی هیں ۔ ان کا دودھ پیا جاتا هے ۔ سواری اور باربرداری کا کام لیا جاتا هے ۔ ان کی اون سے کپڑے بنائے جاتے هیں ۔ کھالوں سے خیمے بنائے جاتے هیں ۔ نیز یہ وجہ زینت بھی هوتے هیں اور ان سے خوراک کا کام بھی لیا جاتا هے ۔ (یعنی اس زمانہ کے عرب اَلْاَنْعَام سے یہ کام لیا کرتے تھے) ۔ اَلْاَنْعَام میں سے بجز ان کے جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دیا هے ، سب کھانے کے لئے حلال هیں ۔ خنزیر، چرنے چگنے والا حیوان هے اس لئے بھیمۃ الانعام میں شامل هے ۔ (نیز دیکھئے عنوان ح - ر - م)۔

نَعَمْ (حرف)

نَعَمْ ۔ هاں ۔ قَالُوْا نَعَمْ (۷/۴۴) ۔ انهوں نے کہا ۔ هاں (ایسا هی هوا هے) ۔ یہ حرف ایجاب هے ۔

[نِعْمَ اور نِعِمَّا عنوان، ن - ع - م میں دیکھئے]۔

ن غ ض

نَغَضَ الشَّيْءَ يَنْغُضُهُ ۔ کسی چیز کو متحرک کیا ۔ نَغَضَ الشَّيْءُ ۔ کوئی چیز متحرک و مضطرب هوئی ۔ (لازم اور متعدی دونوں طرح آتا هے) ۔ نَغَضَ رَاْسَهُ ۔ اس نے اپنے سر کو حرکت دی ۔ اخفش نے کہا هے کہ تھرتھراهٹ کے ساتھ هلنے کو نَغْضٌ کہتے هیں ۔ نَغْضٌ شتر مرغ کو کہتے هیں کیونکہ جب وہ چلتا هے تو اس کا سر بہت هلتا هے* ۔ ابن فارس نے بھی یہی کہا هے ۔ اَنْغَضَ رَاْسَهُ اس وقت کہتے هیں جب کوئی آدمی کسی کی بات سن کر اس سے انکار کرتے هوئے اپنا سر هلا دے ۔ اور بعض نے کہا هے کہ تعجب سے یا کسی بات کا مذاق اڑاتے هوئے سر هلانے کو کہتے هیں*۔ قرآن کریم میں هے فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ (۱۷/۵۱) ۔ یہ تیری بات کا مذاق اڑاتے اور انکار کرتے هوئے اپنے سروں کو تیرے سامنے هلا دینگے ۔ تعجب کرتے هوئے اپنے سروں کو هلا دینگے ۔

ن ف ث

نَفَثَ ۔ يَنْفُثُ ۔ پھونک مارنا ۔ اسطرح آهستہ سے پھونک مارنا کہ اسکے ساتھ لعاب دهن باهر نہ نکلے ۔ ابن فارس نے کہا هے کہ یہ مادہ، منہ

*تاج و راغب ۔

وغیرہ سے کسی معمولی سی چیز کے ، ھلکی سی آواز کے ساتھ نکلنے کے لئے بولا جاتا ہے ۔ اگر اس سے کچھ زیادہ ھو جائے تو اسے تَفَلٌ* کہینگے۔ اسی سے نَفَثَ الشَّیْءَ فِی الْقَلْبِ کسی بات کو ھولے سے کسی کے دل میں ڈال دینے کو بھی کہتے ھیں ۔ کسی کے کان میں کچھ پھونک دینا ۔ اِمْرَأَةٌ نَفَّاثَةٌ* ۔ جادوگرنی کو کہتے ھیں جو گرھوں میں پھونکیں مار مار کر تعویذ گنڈے تیار کرتی ہے**۔ نَفْثٌ* ۔ پھونک مارنا ۔ جادو کرنا ۔ دل میں کوئی بات ڈالنا **۔

قرآن کریم میں مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ (۱۱۳/۴) آیا ہے ۔ عُقَدٌ* کے معنی ھیں پختہ گرھیں ۔ لہذا نَفّٰثٰتٌ* کے معنی ھوئے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی سے ان کے عزم راسخ کو کمزور کر دیں ۔ جو محکم ارادوں میں پھونک مار دیں ۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ قومیں یا جماعتیں ھیں جو اپنے جھوٹے پراپیگنڈہ سے انسانوں کی فطری ترقی کو روک دیتی ھیں ۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس قسم کے عمل کو جس سے دوسرا کمزور پڑ جائے ، عرب سحر یا جادو کہتے تھے***۔

ن ف ح

نَفْحٌ* کے بنیادی معنی کسی چیز کے چل پڑنے یا اٹھانے کے ھیں ۔ (ابن فارس) ۔ نَفَحَ الطِّیْبُ یَنْفَحُ ۔ خوشبو پھیلی ۔ نَفَحَتِ الرِّیْحُ ۔ ھوا چلی ۔ رِیْحٌ نَفُوْحٌ* ۔ تیز چلنے والی ھوا ۔ نَفْحٌ* ۔ ھر ٹھنڈی ھوا کو کہتے ھیں ۔ اور لَفْحٌ* گرم ھوا کو ۔

اَلنَّفْحَةُ مِنَ الرِّیْحِ ۔ ھوا کا جھونکا ۔ نَفْحَةُ الدَّمِ ۔ خون جو پہلی بار یکبارگی تیزی سے نکل پڑے*۔ قرآن کریم میں نَفْحَةٌ* مِنَ الْعَذَابِ (۲۱/۴۶) آیا ہے ۔ یعنی عذاب خداوندی کی ایک لپٹ ۔ اس کا تھوڑا سا حصہ ۔ عذاب کی جھلک ۔

ن ف خ

نَفَخَ ۔ یَنْفُخُ ۔ منہ سے ھوا نکالنا ۔ پھونک مارنا ۔ جیسے نَفَخَ فِی النَّارِ ۔ اس نے آگ میں پھونک ماری****۔ سورہ کہف میں ہے اُنْفُخُوْا (۱۸/۹۶) ۔ اسے دھونکو ۔

*تاج و راغب ۔ ** تاج و محیط و راغب ۔ ***المقام المحمود صفحہ ۲۱۲
****تاج و محیط ۔

اِنْتَفَخَ الشَّیْءُ - چیز پھول گئی* - اِنْتَفَخَ النَّھَارُ - دن چڑھ گیا** - اَلنِّفْخَاءُ مِنَ الْاَرْضِ - بلند زمین - اَلنُّفَّاخَۃُ - وہ پتھر جو پانی کی سطح سے اونچے ھوں - نیز بلبلے* - ابن فارس نے اس مادہ کے معنی پھولنے اور بلند ہونے کے لکھے ھیں -

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں متعدد مقامات پر نَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِہٖ (۳۲/۹) یا نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ (۱۵/۲۹) کے الفاظ آئے ھیں - جیسا کہ رُوْح کے عنوان میں بتایا جاچکا ھے، رُوْح سے مراد الوھیاتی توانائی (اختیار و ارادہ وغیرہ کی قوت - انسانی ذات یا Personality) ھے جو تمام مخلوقات میں صرف انسان کو ملی ھے - اس لئے نَفْخِ رُوْح سے مراد ھوا کی طرح کچھ پھونکنا نہیں بلکہ انسانی قوتوں اور توانائیوں کا عطا کرنا ھے جس سے بلندیاں نصیب ھو جائیں - یہی وہ چیز ھے جسکی طرف سورہ آل عمران میں اشارہ کیا گیا ھے جہاں حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے کہا ھے کہ میں تمہیں ایسی ترتیب نو عطا کرونگا جس سے تمہارے اندر زندگی کی تازگی اور توانائی پیدا ھو جائیگی - جس سے تمہیں دنیا میں بلندیاں نصیب ھوجائینگی - اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ - فَاَنْفُخُ فِیْہِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰہِ (۳/۴۸) - میں تمہیں ایسی نئی زندگی عطا کرونگا جس سے تم اپنی موجودہ خاک نشینی کی پستی سے ابھر کر فضا میں اڑنے کے قابل ھو جاؤ گے - میں تم میں ایسی روح پھونکونگا جس سے تمہیں قانون خداوندی کی رو سے، بے انتہا بلندیاں نصیب ھو جائینگی - اقبال کے الفاظ میں -

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشت پرے داری
بیامن باتو آموزم طریق شاھبازی را

قرآن کریم میں نَفْخِ صُوْر کا بھی ذکر کئی جگہ آیا ھے - جیسا کہ (ص - و - ر) کے عنوان میں لکھا جاچکا ھے، اس کے معنی وہ نرسنگھا (بگل) بھی ھیں جسے اعلان جنگ کے لئے بجایا جاتا تھا - اور یہ لفظ صورت (Form) کی جمع بھی ھے - اول الذکر مفہوم کے اعتبار سے نَفْخِ صُوْر کے معنی ھونگے حق و باطل کے درمیان اعلان جنگ - اور ثانی الذکر مفہوم کے اعتبار سے اس کے معنی ھونگے حیات تازہ عطا کرنا - نئی توانائیاں بخشنا، جس سے بلندیاں نصیب ھو جائیں (۶۹/۱۳) - (دیکھئے عنوان ص - و - ر)

*تاج و محیط . **راغب -

ن ف د

نَفِدَ الشَّیْءُ یَنْفَدُ نَفَادًا ۔ چیز کا فنا ہو جانا ۔ جاتے رہنا ۔ زمخشری نے کہا ہے کہ جن الفاظ میں فاءکلمہ نون ہو اور عین کلمہ فاء ۔ تو ان الفاظ کے معنی جاتے رہنے اور نکل جانے کے ہونگے**۔ (مثلاً نَفِدَ ۔ نَفَذَ ۔ نَفَرَ ۔ نَفَشَ ۔ نَفَضَ نَفَقَ وغیرہ)۔

اَنْفَدَ الْقَوْمُ ۔ لوگوں کا توشہ اور مال ختم ہو گیا * ۔ قرآن کریم میں ہے مَا عِنْدَکُمْ یَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ بَاقٍ (۱۶/۹۶) ۔ جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائیگا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے ۔ اسی بَاقٍ کی تفسیر دوسری جگہ مَالَہٗ مِنْ نَفَادٍ (۳۸/۵۴) سے کر دی یعنی جو ختم ہی نہ ہو۔

ن ف ذ

اَلنَّفَاذُ ۔ کسی چیز کے آر پار ہوجانا ۔ جیسے تیر کا نشانے میں ایک طرف سے گھس کر اس کے دوسری طرف سے باہر نکل جانا (خواہ وہ ذرا سا بھی باہر کیوں نہ نکل جائے) ۔ طَعْنَۃٌ نَافِذَۃٌ ۔ نیزے کی ایسی مار کو کہتے ہیں جو آر پار ہو جائے***۔

اَنْفَذَ الْقَوْمَ کے معنے ہیں وہ (پیچھے سے چل کر اس گروہ میں شامل ہوا اور تیزی سے چلتا ہوا) انہیں پیچھے چھوڑ کر ان سے آگے نکل گیا ۔ اَلنَّافِذَۃُ ۔ کمرے کا سوراخ یا روشندان جس سے روشنی اندر آتی ہو۔ نَفَذَ الشَّیْءَ ۔ اس نے کسی چیز کو پھاڑ دیا*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز میں سے گزر جانا ہیں ۔

قرآن کریم میں ایک عظیم آیت ہے جس سے انسانی ارتقاء کے ممکنات پر روشنی پڑتی ہے ۔ سورۃ رحمٰن میں ہے یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۔ اے گروہ جن و انس ! (یعنی وہ انسان جو شہروں کے رہنےوالے ہوں یا صحرا نشین)۔ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۔ اگر تم اس کی استطاعت رکھتے ہو کہ آسمان و زمین (یعنی اس مادی کائنات) کے کناروں کو چیر کر آگے نکل جاؤ ، تو نکل جاؤ ۔ لیکن یہ

---

*تاج و راغب ۔ **فعل ۔ تینوں حرفوں سے ملکر بنا ہے ۔ اس میں پہلا حرف فا کلمہ، دوسرا ع کلمہ ۔ اور تیسرا ل کلمہ ہے ۔ "فا کلمہ ن ہو" کے معنی ہیں پہلا حرف ن ہو ۔ اور "ع کلمہ فا" کے معنی ہیں دوسرا حرف فا (ف) ہو جیسے لفظ ۔

*** تاج و راغب و محیط ۔

یاد رکھو کہ ۔ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (۵۵/۳۳)۔ تم سُلْطَانٌ۔ (قدرت و غلبہ) کے بغیر نہیں نکل سکو گے ۔ قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ انسان کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس مادی کائنات کے حدود سے باہر چلا جائے۔ لیکن اس کے لئے اسے ایک خاص قوت کی ضرورت ہوگی جو مادی موانعات پر غالب آسکے ۔ یہ قوت وحی کے اتباع سے حاصل ہو سکتی ہے (اس لئے قرآن کریم نے خود وحی کو سُلْطَانٌ کہا ہے ۔ دیکھئے عنوان س ۔ ل ۔ ط) ۔ یعنی وحی کے اتباع سے انسانی ذات میں ایسی نشو و نما آسکتی ہے کہ وہ مادی چاردیواری سے آگے نکل کر زندگی کے دیگر مراحل طے کرنے اور حیاتِ جاوید حاصل کرنے کے قابل ہو جائے ۔ حیوانی سطح پر زندگی محض آب و گل کی طبعی زندگی ہوتی ہے لیکن انسانی سطح (یعنی مومن کی سطح) پر اس میں حیات جاوید کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے ۔ اسی کا نام وہ سُلْطَانٌ ہے جس سے زندگی آب و گل کی چاردیواری سے نکل کر آگے جاسکتی ہے ۔ یاد رکھئے۔ مادی کائنات سے باہر نکلنے سے مراد انسان کے جسم کی پرواز نہیں ۔ اس سے مراد اس کی ذات (Personality) کا ارتقاء ہے ۔ جسمانی پرواز سے انسان جتنا اونچا جی چاہے اڑ جائے ، وہ بہر حال مادی کائنات کی چاردیواری کے اندر ہی رہے گا۔ مادی کائنات سے آگے نکل جانا انسانی ذات ہی کے لئے ممکن ہے ۔ یعنی موت کے بعد حیات جاوداں حاصل کرنا ۔ اس زندگی میں انسان کے لئے مادی کائنات کے حدود سے باہر نکل جانا ناممکن ہے ۔ یہ چیز مرنے کے بعد ، اگلی زندگی ہی میں حاصل ہو سکتی ہے ۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنی ''روحانی قوت'' سے مادی کائنات کے حدود سے باہر چلے جاتے ہیں ، وہ محض اپنے خیالات کی رو سے ایسا سمجھتے ہیں ۔ اپنے تخیل میں آپ جہاں جی چاہے چلے جائیے اس کے لئے کسی قوت (سلطان) کی ضرورت ہی نہیں ہوتی ۔ قرآن کریم کی رو سے انسان مادی کائنات سے باہر مرنے کے بعد ہی جاسکتا ہے۔ اُسی زندگی میں پہنچکر اسے حیاتِ جاوید حاصل ہو سکتی ہے ۔

ن ف ر

اَلنَّفْرُ ۔ بے قرار ہونا اور اپنی جگہ سے اٹھ جانا ، ہٹ جانا* ۔ جدا ہو جانا** ۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی الگ ہو جانا اور دور ہوجانا بتائے ہیں ۔ کسی چیز سے بے رخی برتنا اور اس سے الگ ہونا ۔ نَفَرَ اِلَى الشَّيْءِ کسی چیز کی طرف تیزی سے جانا** ۔ نَفَرَتِ الدَّابَّةُ و

*راغب ۔ **تاج و محیط و راغب ۔

اِسْتَنْفَرَتْ ۔ جانور کا کسی سے گھبرانا اور دور چلے جانا ۔ نَفَّرْتُهُ ۔ اِسْتَنْفَرْتُهُ ۔ میں نے اسے متوحش کردیا اور بھگا دیا ۔ مُسْتَنْفِرٌ ۔ متوحش ہو کر بھاگ جانے والا * ۔ قرآن مجید میں ہے حُمُرٌ مُسْتَنْفِرَةٌ (۷۴/۵۰)۔ بدکنے والے گدھے ۔ اِنْفِرُوْا لِلْاَمْرِ ۔ وہ اس معاملہ کے لئے نکل کھڑے ہوئے* (۹/۴۱) ۔ اَلنَّفَرُ (۱۸/۳۴) ۔ وہ جتھا یا گروہ جو کسی کی مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ نَفِیْرٌ بھی اسی معنی میں ہے** (۱۷/۶)۔ نُفُوْرٌ ۔ گھبرا کر بھاگنا ۔ نفرت کرنا (۳۵/۴۲) ۔ اَلْمُنَافَرَةُ ۔ مفاخرت (اس لئے کہ لوگ اَیُّنَا اَعَزُّ نَفَرًا کہا کرتے تھے)* ۔

ن ف س

صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ نَفْسٌ کے بہت سے معنی ہیں ۔ منجملہ ان کے یہ لفظ انسانی شخصیت کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے ۔ نیز وہ توانائی جس سے تمیز کی صلاحیت (شعور اور احساس کی قوت) پیدا ہوتی ہے۔ عقل۔ علم اور قلب کے معنوں میں بھی آتا ہے*** ۔ اور عَیْنُ الشَّیْءِ کے معنوں میں بھی ۔ جیسے جَاءَنِیْ الْمَلِکُ بِنَفْسِہٖ۔ بادشاہ میرے پاس بنفس نفیس آیا ۔ نیز عظمت اور بڑائی ، ہمت ، غیرت ، ارادہ اور عقوبت (سزا) کے معنوں میں بھی ۔ نیز نَفْسٌ کےمعنی بھائی بند کے بھی ہوتے ہیں*** ۔ اسکے علاوہ خون کے معنوں میں بھی۔ چنانچہ نِفَاسٌ اُس خون کو کہتے ہیں جو ولادت کے بعد عورتوں کو آتا ہے***۔ خود ولادت (عورت کے بچہ جننے) کے معنوں بھی یہ لفظ آتا ہے ۔ نَفَسٌ ۔ سانس کو کہتے ہیں ۔ اسکی جمع اَنْفَاسٌ آتی ہے***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہلکی اور نرم ہوا کے نکلنے کے ہیں ۔ نَفَسٌ کے معنی وسعت اور کشادگی کے بھی ہیں ۔ ایک کش اور گھونٹ کو بھی کہتے ہیں ۔ اور طویل چیز کو بھی ۔ نَفِیْسٌ مال کثیر کو کہتے ہیں اور شَیْءٌ نَفِیْسٌ وہ عمدہ چیز جسکی طرف انسان لپک کر جائے ۔ تَنَفَّسَ کے معنے ہیں سانس لینا ۔ نیز تَنَفَّسَ الصُّبْحُ کے معنی ہیں صبح کا واضح اور روشن ہو جانا (۸۱/۱۸)۔ نَافَسَ اور تَنَافَسَ کے معنی کسی اچھے کام میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہیں (۸۳/۲۶) ***۔

نیز اس کے معنی عِنْدِیْ (میرے پاس) کے بھی ہوتے ہیں ۔ تاج العروس نے اسکی مثال کے لئے سورہ مائدہ کی آیت تَعْلَمُ مَافِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَافِیْ نَفْسِکَ (۵/۱۱۶) لکھی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (اے میرے رب)

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج و ابن فارس ۔ ***تاج و لسان العرب ۔

جو کچھ میرے دل میں ہے تو اسے جانتا ہے لیکن جو کچھ تیرے ہاں (پاس) ہے میں اسے نہیں جانتا ۔

اس کے علاوہ اس کے معنی عقوبت (یا سزائے اعمال) کے بھی ہیں ۔ مثلاً وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ (۳/۲۸) ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا تمہیں اپنے آپ سے یا اپنی ذات سے ڈراتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمہیں اپنے قانون مکافات کی رو سے مرتب ہونے والے تباہ کن نتائج سے محتاط رہنے کی تاکید کرتا ہے*۔

اَلنَّفْسُ کے معنی بھائی بند بھی ہیں (۲/۸۴) اور خود اپنا آپ بھی (۲/۴۴)۔ اس قسم کے مقامات میں یہ ان معانی میں استعمال ہوتا ہے جن معنی میں انگریزی زبان میں مثلاً (Myself) یا (Yourself) یا (Himself) وغیرہ استعمال ہوتے ہیں ۔

علاوہ بریں اس لفظ (نَفْسٌ) کو قرآن کریم نے اس '' شے '' کے لئے بھی استعمال کیا ہے جسے ہم انسانی ذات (Human Personality) یا (اقبال کی اصطلاح میں) خودی (Self) یا انا (I-am -ness) کہتے ہیں ۔ یہ مفہوم وضاحت طلب ہے ۔

اگر یہ کہا جائے کہ دین کی اصل و بنیاد انسانی ذات کے اقرار پر استوار ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا ۔ دنیا میں اصولی طور پر دو قسم کے تصورات حیات پائے جاتے ہیں ۔ ایک تصور حیات یہ ہے کہ انسانی زندگی محض طبیعی زندگی (Physical life) ہے ۔ انسان طبیعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے ۔ انہی قوانین کے ماتحت اس کے جسم کی پرورش ہوتی ہے اور انہی قوانین کی رو سے یہ آخرالامر مرجاتا ہے ۔ اور جب اس کے تنفس (سانس) کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس فرد کا بھی خاتمہ ہوجاتا ہے۔ عصر حاضر کی زبان میں اسے مادی نظریہ حیات (Materialistic Concept of life) کہتے ہیں ۔ جسے عام طور پر '' مغربی تہذیب '' کہا جاتا ہے وہ اسی نظریہ حیات کی مظہر ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی رو سے انسان کو نہ خدا پر ایمان لانے کی ضرورت پڑتی ہے نہ وحی کو تسلیم کرنے کی حاجت ۔ اس نظریہ کے قائل اگر خدا کی ہستی کا اقرار بھی کرینگے تو (زیادہ سے زیادہ) اس حد تک کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور یہ اس کے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے ۔ لیکن ظاہر ہے کہ خدا پر اس قسم کے ایمان سے

*تاج و لسان العرب ۔

انسانی زندگی پر کچھ اثر نہیں پڑتا ۔ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ اس کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ نہیں ! یہ یونہی اتفاقیہ طور پر وجود میں آگئی ہے ، تو اس اقرار اور انکار سے ان کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس قسم کے ایمان کو ایمان تسلیم نہیں ہی کرتا ۔ (دیکھئے مثلاً ۲۶/۱۱-۱۲ ؛ ۲۳/۸۳-۸۸ ؛ ۳۱/۲۵ ؛ ۳۹/۳۸ ؛ ۴۳/۹) ۔ اسی طرح جو شخص یہ کہتا ہے کہ زندگی بس اسی طبیعی زندگی کا نام ہے ۔ موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے ۔ تو اس کے نزدیک خیر اور شر کا معیار بھی خود ساختہ ہو جاتا ہے ۔ خیر وہ جس سے اسے فائدہ پہنچے ، یا زیادہ سے زیادہ ، جسے معاشرہ (سوسائٹی) اچھا کہدے ۔ اور شر وہ جس سے اسے نقصان پہنچے ، یا جسے سوسائٹی معیوب سمجھے ۔ اس کے نزدیک اس کے اپنے فیصلوں یا معاشرہ کے متعین کردہ قوانین و ضوابط سے بالا کوئی قانون نہیں ہو سکتا ۔ اس کی زندگی کا مقصد اپنے جذبات کی تسکین ہوتا ہے ، اور بس ۔ قرآن کریم اسے کفر کی زندگی قرار دیتا ہے ۔ سورہ الجاثیہ میں ہے ۔ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیتا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ ۔ وہ قانونِ خداوندی کے مطابق ، اپنے علم کے باوجود غلط روش زندگی پر چلتا ہے ۔ وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۔ اور جذبات پرستی کا طوفان اس کے کان اور دل پر مہر لگا دیتا ہے اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں ۔ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۴۵/۲۳) اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اس حالت تک پہنچ جائے ، اسکی صحیح راستے کی طرف ، بجز خدا کے قانون کے اور کون راہ نمائی کر سکتا ہے ۔ سو کیا تم ایسے شخص کی حالت دیکھکر نصیحت حاصل نہیں کرتے ۔ یہ وہ لوگ ہیں وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۔ جو کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے ۔ ہم (قوانین طبیعی کے مطابق) مرتے ہیں اور جیتے ہیں ۔ اور مرور زمانہ (وقت) ہمیں ہلاک کر دیتا ہے ۔ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۔ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۴۵/۲۴) انہیں حقیقت حال کا کچھ علم نہیں ہوتا ۔ یہ محض ظن و قیاس سے کام لیکر اس قسم کا تصور قائم کر لیتے ہیں ۔

قرآن کریم اس زندگی کو حیوانی سطح زندگی قرار دیتا ہے ۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲) ۔

جو لوگ (بلند سطح زندگی سے) انکار کرتے ہیں وہ حیوانوں کی طرح کھاتے پیتے اور سامان زیست سے فائدے اٹھاتے (اور پھر مر جاتے) ہیں۔

اس کے برعکس ، دوسرا تصور زندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف اس کے جسم کی زندگی نہیں۔ جسم کے علاوہ انسان میں ایک اور " شے " بھی ہے جسے اس کی ذات ، یا نَفْس کہتے ہیں۔ یہ قوانین طبیعی کے ماتحت نہیں ہوتی۔ نہ ہی جسم کی موت سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس سے انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ اگر اسکی مناسب نشو و نما کی جائے تو انسان کی موجودہ زندگی بھی خوشگوار اور سرسبز و شاداب ہوتی ہے اور مرنے کے بعد ، وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشو و نما ان قوانین کی رو سے ہوتی ہے جو خدا کیطرف سے ، حضرات انبیاء کرام ؑ کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتے ہیں (اور جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں)۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ انسانی ذات پر " ایمان " اور خدا ، وحی ، نبوت اور آخرت پر ایمان کسطرح لازم و ملزوم ہیں۔

" انسانی ذات کیا ہے " ۔ یہ نہ بتایا جا سکتا ہے نہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ کوئی مادی شے نہیں۔ انسانی ذات کا مظاہرہ اس کے اختیار و ارادہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسی غیر مادی " شے " ہے جو اختیار و ارادہ کی استعداد کی حامل ہے۔ اختیار و ارادہ (بصورت مطلق اور کُلّی طور پر) خدا کو حاصل ہے اور اس کا عطا کردہ ، (محدود شکل میں) انسان کو حاصل ہے۔ اس کے سوا ، کائنات میں کسی اور کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں۔ اسی لئے اسے خدا نے " روحنا " کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی الوھیاتی توانائی (Divine energy) (دیکھئے عنوان ر - و - ح)۔ اگر انسان ، قوانین خداوندی کا اتباع کرے تو اس کی ذات میں (حد بشریت کے اندر) صفاتِ خداوندی منعکس ہوتی جاتی ہیں۔ اسی کو اسکی ذات کا نشو و نما کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ انسانی ذات ، ذات خداوندی کا جزو نہیں۔ ذات (وہ خدا کی ہو یا انسان کی) ایک غیر منقسم وحدت (Indivisible whole) ہوتی ہے جس کے حصے بخرے ہو نہیں سکتے۔

چونکہ انسان کے ہر عمل کی بنیاد اس کے ارادہ پر ہوتی ہے ، اس لئے اس کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ حتکہ اس کے دل میں گذرنے والے خیالات اور نگاہ کی خیانت تک کا بھی (۴۰/۱۹)۔ یہی اس کا " اعمالنامہ " ہے جو اسکی گردن میں لٹکا رہتا ہے۔ (۱۷/۱۳)۔ اسی کو وہ ظہور

نتائج کے وقت پڑھیگا ۔ اِقْرَاْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۷/۱۴) ۔ " تو آج اپنی کتاب پڑھ ۔ آج تیرا نفس خود تیرا حساب لینے کے لئے کافی ہے " ۔ (نیز ۲۵/۱۵ ؛ ۱۳/۱۰) ۔ اسی سے انسانی ذات کی انفرادیت (Individuality) ثبت ہوتی ہے (۹۵/۶ ؛ ۹۵/۹) ۔ یعنی ہر انسانی ذات منفرد (Unique) ہوتی ہے اور اس کے ہر عمل کا اثر اس کے اپنے اوپر ہوتا ہے، کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہو سکتا ۔ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶/۱۶۵) ۔ ہر نفس کو اپنے اعمال کا خمیازہ خود بھگتنا پڑتا ہے ۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا ۔ (اس ضمن میں حسب ذیل آیات بھی دیکھئے ۔ (۶/۱۰۵ ؛ ۱۰/۱۰۸ ؛ ۱۷/۷ ؛ ۱۷/۱۵ ؛ ۲۷/۹۲ ؛ ۲۹/۶ ؛ ۳۰/۴۴ ؛ ۳۱/۱۲ ؛ ۳۵/۱۸ ؛ ۳۹/۴۱ ؛ ۴۱/۴۶ ؛ ۴۵/۱۵ ۔ نیز ۳۵/۱۸ ؛ ۳۹/۷ ؛ ۵۳/۳۸) ۔ جب اتباع قوانین خداوندی سے انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے تو (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس میں زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اسے مرنے کے بعد جنت کی زندگی کہتے ہیں ۔ لیکن جس ذات کی نشو و نما نہیں ہوتی، وہ آگے بڑھنے سے رک جاتی ہے ۔ یہ جہنم یا جحیم کی زندگی ہے ۔ [دیکھئے عنوانات (ج ۔ ن ۔ ن) ؛ (ج ۔ ح ۔ م) ؛ (جہنم)] ۔ یوں تو انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے پورے کے پورے ضابطۂ قرآنی کا اتباع ضروری ہے (اور یہ اتباع قرآنی معاشرہ کا جزو بنکر ہی کیا جاسکتا ہے) لیکن قرآن کریم نے اس باب میں ایک بنیادی نکتہ بیان کیا ہے جو بڑا اہم ہے ۔ انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ فرد خود کھاتا (یا لیتا) ہے ۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں کھاتا جاؤں اور آپ کے جسم کی پرورش ہوتی جائے ۔ اس کے برعکس انسانی ذات کی نشو و نما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے ہم دوسروں کی نشو و نما کے لئے دیں ۔ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۔ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (۹۲/۱۷) ۔ جہنم سے اسے بچایا جاتا ہے جو اپنے مال کو (یا جو کچھ اس کے پاس ہے اسے) اپنی نشو و نما کے لئے دیتا ہے ۔ تقویٰ شعار بھی وہی ہوتا ہے جو " دیتا ہے " ۔ مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى (۹۲/۵) " جو دیتا ہے اور (اسطرح) تقویٰ اختیار کرتا ہے " ۔ (نیز دیکھئے (۵۹/۹ ؛ ۶۴/۱۶) ۔

یاد رہے کہ انسانی ذات، ایک ملکہ، صلاحیت، استعداد، یا امکانی قوت ہے جو بجائے خویش نہ خیر ہے نہ شر ۔ دوسری ہر قوت کی طرح، اس کا استعمال اسے خیر یا شر بنا دیتا ہے ۔ جب انسان اسے انسانیت کی بلند اقدار (Higher Values) کے تحفظ اور استحکام کے لئے عمل میں لاتا ہے، تو یہ خیر کا موجب بن جاتی ہے (اسی سے اسکی نشو و نما ہوتی ہے) ۔ اور

جب انسان اپنے اختیار و ارادہ کو ، پست مفادِ خویش کے خاطر استعمال کرتا ہے (جس میں بلند اقدار کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے) تو یہ شر کا مظہر بن جاتی ہے ۔ اس صورت میں (محض تمیز کی خاطر) ہم انسانی ذات کو ایغو (Ego) سے تعبیر کرتے ہیں ۔ ایغو ، حیوانی سطح زندگی پر ہوتا ہے اور ذات ، انسانی سطحِ زندگی پر ۔ جب انسانی جذبات (Emotions) ایغو کے تابع چلتے ہیں تو قرآن کریم انہیں ''ہویٰ'' کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے ۔ (اس مادہ میں ''پستی'' کا مفہوم ہوتا ہے ۔ دیکھئے عنوان ھ ۔ و ۔ ی) ۔ اور جب عقل (Intellect) ایغو کی خادمہ بنتی ہے تو مکر و فن کہلاتی ہے ۔ اس کے برعکس جب جذبات انسانی ذات کے ماتحت رہتے ہیں تو بلند ترین جوہر انسانیت بن جاتے ہیں اور جب عقل ، انسانی ذات کے تابعِ فرمان رہتی ہے تو انسانی زندگی اور معاشرہ جنت بداماں ہو جاتا ہے ۔ (اقبال اول الذکر عقل کو ، عقلِ خود بیں اور ثانی الذکر کو عقلِ جہاں بیں ، یا خرد ''ادب خوردہ دل'' کہکر پکارتا ہے) ۔

جب ایغو ، کسی مستقل قدر کو پس پشت ڈال کر ، پست مفاد کیطرف جاتا ہے تو اسے عام طور پر ''نفس امارہ'' کہا جاتا ہے ۔ یہ اصطلاح قرآن کریم کی اس آیت سے لی گئی ہے جس میں اس نے ، عزیز مصر کی بیوی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ (۱۲/۵۳) ۔ یقیناً نفس ، برائی کا حکم دیتا رہتا ہے ۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ نفس انسانی ہے ہی برائی کا حکم دینے والا ۔ بالکل نہیں ۔ یہ ایغو کے متعلق کہا گیا ہے ۔ چنانچہ اس کے بعد ہے اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ (۱۲/۵۳) ۔ بجز اس کے جس پر خدا کی رحمت ہو ۔ یہ نفس کی وہ سطح ہوگی جسے ہم نے ''انسانی ذات'' سے تعبیر کیا ہے ۔

بعض اوقات نفس انسانی کی یہ کیفیت بھی ہوتی ہے کہ جب اس سے کوئی برائی سرزد ہو جائے تو اس کے بعد اس میں احساس ندامت بیدار ہو جاتا ہے ۔ یہ درحقیقت ، ایغو اور ذات میں ایک قسم کی کشمکش کی حالت ہوتی ہے ۔ اسے قرآن کریم نے نفس لوّامہ کہا ہے (۷۵/۲) ۔ یعنی ''ملامت کرنے والا نفس'' ۔ اس سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسانی ذات میں اس کی استعداد نہیں کہ وہ خیر اور شر میں خود تمیز کر سکے ۔ خیر و شر کی تمیز صرف وحی کی رُو سے ہو سکتی ہے ۔ نفس لوامہ اُسی بات پر ملامت کریگا جسے وہ معیوب سمجھتا ہے ۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو وہ معیوب سمجھتا ہے وہ درحقیقت معیوب ہو ، اور جسے وہ محمود قرار دیتا ہے وہ درحقیقت ممدوح ہو ۔ [تفصیل اس اجمال کی (ل ۔ ھ ۔ م) اور (ف ۔ ط ۔ ر) کے عنوانات میں ملیگی] ۔

جب انسان ، خالص قوانین خداوندی کا اتباع کرتا ہے ، تو ایغو اور ذات کی کشمکش ختم ہو جاتی ہے ۔ ذات ، پست جاذبیتوں پر غالب آ جاتی ہے ۔ (۳۶/۲۹) ۔ اسے قرآن کریم نے نفس مطمئنہ سے تعبیر کیا ہے (۸۹/۲۷) جس کی زندگی جنت کی زندگی ہے (۸۹/۲۹) ۔ اسے ، عصر حاضر کی علم النفس کی زبان میں (Integrated Personality) کہا جائے گا ۔ اس کے برعکس (Disintegrated Personality) ہوگی ۔ قرآن کریم نے نفس کی ان دونوں کیفیتوں کو فُجُوْرَھَا وَ تَقْوٰھَا (۹۱/۸-۹) سے تعبیر کیا ہے ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ل ۔ ھ ۔ م) ۔ اور ذات کی نشو و نما (Development) کو انسانی زندگی کا مقصود اور کامیابی و کامرانی بتایا ہے (۹۱/۱۰) ۔

چونکہ انسانی ذات ، امکانی شکل (Realiseable Form) میں ہر انسانی بچہ کو پیدائش کے ساتھ یکساں طور پر ملتی ہے ، اس لئے اس کی بنا پر ہر فرزند آدم ، محض آدمی ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے ۔ وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ (۱۷/۷۰) ۔ "ہم نے تمام فرزندان آدم کو واجب التکریم بنایا ہے" ۔ ذات کی تکریم کے معنے یہ ہیں کہ کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کو اپنا محکوم بنائے ۔ انسانی اختیار و ارادہ انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے ۔ اس لئے کسی کے اختیار و ارادہ کو سلب کرلینا ، اس سے اپنے فیصلے منوانا (اسی کو محکومی کہتے ہیں) اُسے شرف انسانیت سے محروم کردینا ہے ۔ قرآن کریم کی رُو سے اطاعت یا محکومی ، صرف قوانین خداوندی کی ہوسکتی ہے ۔ (اسی کو عبادت کہتے ہیں ۔ دیکھئے عنوان ع ۔ ب ۔ د) ۔ یہ اطاعت ، کسی مستبد حاکم کی عائد کردہ پابندیوں کا نام نہیں ہوتا ۔ انسان ان پابندیوں کو اپنے اوپر خود عائد کرتا ہے ۔ (اطاعت کے معنے ہی بطیب خاطر ، برضا و رغبت ، اپنے اوپر کسی پابندی کا عائد کرنا ہے) اور اس لئے عائد کرتا ہے کہ اس سے اس کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے ۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (۲/۲۸۶) سے بھی مراد ہے ۔ یعنی قوانین خداوندی انسان پر جو پابندیاں عائد کرتے ہیں تو اس سے مقصد ، خود انسانی ذات میں وسعت پیدا کرنا ہوتا ہے ۔ نہ کہ اس کی آزادی کو سلب کرنا ۔ [دیکھئے عنوان ک ۔ ل ۔ ف] ۔ قرآنی معاشرہ اس قسم کی فضا پیدا کرتا ہے جس میں کوئی کسی کا محکوم نہیں ہوتا اور اس طرح انسانی ذات کی وسعتیں حدود فراموش ہوتی چلی جاتی ہیں ۔ اس سے انسان کو اس دنیا میں بھی جنتی زندگی حاصل ہو جاتی ہے اور آخرت میں بھی جنتی زندگی ۔ خانقاہیت کی تجرد گاہوں میں انسانی ذات کی نشو و نما کبھی نہیں ہوسکتی ۔ جنت کے لئے فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ (۸۹/۲۹) پہلی شرط ہے ۔

سورۂ زمر میں ایک آیت ہے اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْہَا الْمَوْتَ وَ یُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی (۳۹/۴۲) "اللہ موت کے وقت نفوس کو موقوف کر دیتا ہے اور جو مرتے نہیں ان کی نیند کی حالت میں ایسا کر دیتا ہے - پھر جن پر موت کا حکم ہوجاتا ہے تو انہیں روک لیتا ہے اور دوسروں کو ایک وقت مقرر تک واپس بھیجدیتا ہے" - سوال یہ ہے کہ اس آیت میں "نفس" سے کیامطلب ہے جسے موت اور نیند دونوں حالتوں میں موقوف کر دیا جاتا ہے اور جب انسان جاگ اٹھتا ہے تو اسے واپس کر دیا جاتا ہے، لیکن بصورتِ موت اسے واپس نہیں کیا جاتا - جہاں تک نیند کا تعلق ہے ہم جانتے ہیں کہ اس میں انسان کا سب کچھ موجود ہوتا ہے، بجزشعور (Conscious-ness) کے - (حتکہ اس میں تحت الشعور بھی باقی ہوتا ہے) - اس لئے ظاہر ہے کہ اس آیت میں "نفس" سے مراد اسکی شعوری حالت ہے - یعنی نیند اور موت دونوں حالتوں میں انسان کا شعورباقی نہیں رہتا - سونے والا جب جاگ اٹھتا ہے تو اس کا شعور پھر رو بہ عمل ہوجاتا ہے، لیکن موت کی صورت میں شعور کا تعلق اس جسم کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے - موت کے بعد، شعور کے رو بہ عمل ہونے کو حیات بعد الممات کہتے ہیں - اس زندگی میں شعور (یا نفس) کس طور پر رو بہ عمل ہوتا ہے، ہم اپنےشعور کی موجودہ سطح پر اسے نہیں سمجھ سکتے - اس لئے کہ اس وقت ہمارے شعور کے رو بہ عمل ہونے کا ایک ہی ذریعہ ہے - اور وہ ہے ہمارا مادی جسم - ہم اس وقت، جسم کے توسط کے بغیر، شعور کی کارفرمائی کا تصور ہی نہیں کرسکتے - قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ حیات بعد الممات میں شعور کی کارفرمائی کا ذریعہ کیا ہوگا - نہ ہی اس کے بتانے سے کوئی فائدہ تھا - اس لئے کہ جس بات کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ ہی نہیں سکتے اس کے بتانے سے حاصل کیا ہو سکتا ہے - لیکن مرنے کے بعد نفس کی کارفرمائی کو قرآن کریم ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر بیان کرتا ہے - اس پر ہمارا ایمان ہے اور یہی دین کی اصل و بنیاد ہے -

ن ف ش

نَفَشٌ - اون یا روئی وغیرہ کو انگلیوں سے پراگندہ کرنا - (لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے) - بعض نے کہا ہے کہ نَفَشٌ - ہر اس چیز کے منتشر ہو جانے کو کہتے ہیں جسکا منتشر ہو جانا مشکل نہ ہو - جیسے روئی - اون وغیرہ* - قرآن کریم میں الْعِہْنِ الْمَنْفُوْشِ (۱۰۱/۵) آیا ہے - یعنی

*تاج و راغب و محیط -

دھنی ھوئی (منتشر شدہ) رنگین اون - (ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی منتشر ھونا لکھے ھیں -

ابن السکیت نے کہا ھے کہ نَفْشٌ کے معنی ھیں رات کے وقت بکریوں یا اونٹوں کا چرواھے کے علم کے بغیر ادھر اُدھر منتشر ھوکر چرنا - (نَفْشٌ میں رات کے وقت ایسا ھونے کی تخصیص ھے - ھَمَلٌ میں رات یا دن کی تخصیص نہیں ھوتی) - قرآن کریم میں ھے اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ (۲۱/۷۸) جب لوگوں کی بکریاں اس میں رات کے وقت چرتے ھوئے منتشر ھوگئیں -

ن ف ع

اَلنَّفْعُ - ضَرٌّ و ضَرَرٌ (نقصان) کی ضد ھے - لیکن درحقیقت نَفْعٌ اس ذریعے کو کہتے ھیں جس سے کسی خوشگواری (خیر) تک پہنچا جائے - چنانچہ اَلنَّفْعَةُ - لاٹھی کو کہتے ھیں**- چرواھوں کی لاٹھی جسطرح ''خیر'' تک پہنچنے کا ذریعہ ھوتی ھے وہ ظاھر ھے -

قرآن کریم میں یہ لفظ ضرر کے مقابلہ میں آیا ھے (۲/۱۰۲) - اور اِثْمٌ کے مقابلہ میں (۲/۲۱۹) بھی - لہذا ضَرَرٌ کی طرح نَفْعٌ بھی خارجی اور داخلی دونوں حالتوں کی خوشگواری کے لئے آئے گا - (مَنَافِعُ (واحد مَنْفَعَةٌ) - فوائد - کام کی چیزیں - (۲/۲۱۹) -

ن ف ق

نَفَقٌ - اس سرنگ کو کہتے ھیں جس کے داخل ھونے اور نکلنے کے دونوں راستے کھلے ھوں - (جس سرنگ میں نکلنے کا راستہ نہ ھو اسے سَرَبٌ کہتے ھیں) - اَلنُّفَقَةُ - وَالنَّافِقَاءُ - جنگلی چوھے کے بل کے متعدد سوراخوں میں سے ایک سوراخ کو کہتے ھیں جس پر وہ مٹی کی باریک سی پپڑی بچھا کر اسے بند رکھتا ھے اور اسے اس وقت سر مار کر کھول لیتا ھے جب اس کا کوئی دشمن اسے بل کے اندر سے پکڑنے کی کوشش کرے - نَيْفَقٌ اس نیفہ کو کہتے ھیں جس کے دونوں کنارے کھلے ھوں - (بعض کا خیال ھے کہ یہ نیفہ سے معرب ھے) - اسی لئے مُنَافِقٌ اُس شخص کو کہتے ھیں جو کسی نظام (یا سوسائیٹی) میں داخل ھونے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ اس سے باھر نکلنے کا راستہ کون سا ھے - نَفَقَتِ السُّوْقُ - بازار گرم ھوا، اوراس کے سامان کی مانگ ھوئی - (یعنی جو اشیاء کی درآمد اور برآمد کے لئے ھر وقت

*تاج و محیط و راغب - ** تاج -

کھلا رہے ۔ ہر وقت مال آتا رہے اور اس کا نکاس ہوتا رہے ۔) لہذا اِنْفَاق* کے معنی ہیں اپنی دولت کو کھلا رکھنا ۔ عام کر دینا ۔ باقی نہ رکھنا ۔ ختم کر دینا *۔ قرآن کریم نے اس کے مقابل میں اِمْسَاک* (روک رکھنے) کا لفظ لا کر اس کے معانی کو واضح کر دیا ہے (۱۷/۱۰۰) ۔

چونکہ روپے کو کھلا رکھنے کا نتیجہ سرمایہ کی نفی (ختم ہو جانا) یا کمی ہوتا ہے ، اس لئے نَفَاق* کے معنی کسی چیز کے کم ہو جانے یا ختم ہو جانے کے بھی لئے جانے لگے*۔ یہاں تک کہ ان معانی کو بنیادی معنی کی سی اہمیت حاصل ہو گئی ۔ چنانچہ اَنْفَقَتِ الْاِبِلُ* اُسوقت کہتے ہیں جب موٹاپے کی وجہ سے اونٹوں کی اون جھڑ جائے ۔ یعنی منتشر اور پراگندہ ہو کر ضائع ہو جائے*۔

قرآن کریم میں اِنْفَاق* کے بنیادی معنی اپنی محنت کے ماحصل کو ربوبیت عالمینی کے لئے کھلا رکھنا ہیں ۔ وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ۔ یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال و دولت (ربوبیت عامہ کے لئے) کھلا رکھیں ۔ ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے سب کا سب ۔ یعنی فاضلہ دولت (Surplus money) جو سرمایہ داری کی بنیاد ہے ، سب کی سب ربوبیت عامہ کے لئے وقف ہونی چاہئے ۔ یہ کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہ سکتی ۔

یہ قرآنی نظام کا بنیادی نقطہ ہے ۔ مومن کی ہمیانی کے دونوں سرے کھلے رہتے ہیں اور یہ ہمیانی نظام کے ہاتھ میں رہتی ہے ۔ اس میں ہر فرد اپنی محنت کا ماحصل ڈالتا جاتا ہے اور نظام ربوبیت اسے نوع انسانی کی نشو و نما کے لئے صرف کرتا جاتا ہے ۔ چونکہ اس نظام میں ہر فرد کی تمام ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری خود نظام پر ہوتی ہے اس لئے کسی فرد کو کچھ بچا کر رکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ۔ نہ ہی اسے اپنے یا اپنی اولاد کے مستقبل کے متعلق کوئی خدشہ یا اندیشہ رہتا ہے ۔ یہ تمام ذمہ داریاں نظام کے سر ہوتی ہیں جو قوانین خداوندی کے مطابق قائم ہوتا ہے ۔

بناء بریں ان مقامات میں اِنْفَاق* کے معنی خرچ کرنے کی بجائے کھلا رکھنا زیادہ مناسب ہیں ۔ ''کھلا رکھنے'' کا مطلب ہوگا نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کے لئے نظام خداوندی کی تحویل میں رکھنا ۔ نَفَقَة* (۹/۱۲۱) ۔ ہر وہ چیز جسے اسطرح کھلا رکھا جائے ۔ بعض مقامات میں اس کے معنی خرچ کرنے کے بھی آئینگے ۔

*تاج و ابن فارس ۔

نَافَقَ - منافق ہونا (۳/۱۶۶) - معاشرہ میں منافق سب سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں - ایک تو وہ لوگ ہیں جو دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ نظام خداوندی سے وابستہ ہو جاتے ہیں - یہ مومن ہیں - دوسرے وہ ہیں جو کھلے بندوں اس نظام سے باہر رہتے اور اس کی مخالفت کرتے ہیں - انہیں کافر کہتے - تیسرے وہ ہیں جو محض اپنی مطلب براری کے لئے جماعت مومنین کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں - منافع میں ان کے برابر کے شریک رہتے ہیں اور جہاں کسی مشکل کا سامنا ہوا، تو یا جماعت کا ساتھ چھوڑ کر صاف نکل گئے ، اور یا اس میں بد دلی پھیلانے اور فتنہ پردازی کرنے لگ گئے - یہ منافق ہیں اور بدترین خلائق - اسی لئے قرآن کریم نے ان کا مقام جہنم کا سب سے نچلا طبقہ بتایا ہے (۴/۱۴۵) - قرآن کریم نے (سورہ فاتحہ کے بعد) سب سے پہلے انہی تینوں جماعتوں (مومن - کافر - منافق) کا ذکر واضح الفاظ میں کیا ہے - اس کے بعد ، سارے قرآن کریم میں ان تین جماعتوں کا ذکر ہے - یہ جماعتیں زمانہ نزول قرآن تک محدود نہ تھیں - یہ ہمیشہ رہی ہیں اور ہمیشہ رہینگی - ان کی خصوصیات اسقدر طول طویل ہیں کہ ان کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں -

ن ف ل

اَلنَّفْلُ - ہر وہ عمل جو (واجب) سے زیادہ ہو - اَلنَّفَلُ - مالِ غنیمت - ہبہ - عطیہ - دونوں کی جمع اَنْفَالٌ آئے گی - نَفْلٌ کے معنوں میں نَافِلَۃٌ بھی آتا ہے - قرآن کریم میں ہے - وَ مِنَ اللَّیْلِ فَتَہَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ (۱۷/۷۹) - تو رات کے کچھ حصے میں (قرآن کریم کو) لے کر اٹھ - یہ تیرے لئے ''نفل'' کے طور پر ہے - اَلنَّافِلَۃُ - پوتا - کیونکہ بیٹا تو اصل ہوتا ہے اور پوتا اس پر زائد ہوتا ہے (۲۱/۷۲) -

اَنْفَالٌ (۸/۱) - بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنے مالِ غنیمت کے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ یہ مالِ غنیمت سے الگ (اور خاص) ہوتی ہے - عام طور پر اس کے معنے مالِ غنیمت یا ہبہ یا عطیہ کے لئے جاتے ہیں* - لیکن ہمارا خیال ہے کہ اسے جنگ کے ساتھ مختص کر دینے کی ضرورت نہیں - اس سے مراد مملکت کی وہ تمام آمدنی ہو سکتی ہے جو متعین کردہ واجبات کے علاوہ ہو -

اَلنَّوْفَلُ - دریا - سمندر - عطیہ - بہت عطا کرنے والا آدمی** -

*تاج - **محیط -

نَفَلَ فُلَانًا ۔ فلاں کو عطیہ کے طور پر کچھ دیا جس کے معاوضے کا وہ خواہاں نہیں** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی عطیہ اور عطا کرنا ہیں ۔

ن ف ی

نَفَى ۔ يَنْفِي ۔ نَفْيًا ۔ ایک طرف کردینا ۔ نکال دینا ۔ الگ کردینا۔ دور کردینا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے ہٹا دینے یا دور کردینے کے ہیں ۔ اَلنَّفِيُّ ۔ وہ اُبال جو ہانڈی باہر پھینک دے۔ وہ کنکریاں وغیرہ جو جانوروں کے ٹھوکر لگنے سے ادھر ادھر اُڑتی ہیں ۔ وہ مٹی جسے ہوا درختوں کی جڑوں میں لاکر پھینک دیتی ہے ۔ بڑے لشکر سے جو حصہ کٹ کر الگ ہو جائے اور ایک طرف کو رہ جائے ۔ نَفَى شَعْرُ فُلَانٍ ۔ فلاں آدمی کے بال پریشان اور پراگندہ ہوگئے۔ یا گرگئے۔ نَفَى السَّيْلُ الْغُثَاءَ ۔ سیلاب کوڑا کرکٹ بہا کر لے گیا ۔ اسی سے نَفَى کے معنی انکار کردینے کے آتے ہیں ۔ نَفَى الْاَبُ الْاِبْنَ ۔ باپ نے بیٹے کو اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کردیا* ۔

قرآن کریم میں ان لوگوں کے متعلق جو نظام خداوندی (اسلامی مملکت) کے خلاف بغاوت کریں اور نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کریں کہا گیا ہے کہ انہیں قتل کر دو ۔ یا سولی چڑھا دو ۔ یا "قطع ید و رجل" کردو ۔ (دیکھو عنوان ق ۔ ط ۔ ع) ۔ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (۵/۳۳) ۔ نَفْيٌ کے ان معانی کے لحاظ سے جو اوپر درج کئے گئے ہیں اس کے معنی ہونگے ملک سے الگ کردینا ۔ جلاوطن کردینا ۔ صاحب محیط نے نَفَى فُلَانًا کے معنی فلاں کو قید کردیا بھی لکھے ہیں*۔ لیکن مندرجہ بالا آیت میں مِنَ الْاَرْضِ کے اضافہ سے ظاہر ہے کہ اس کے معنے ملک بدر کردینے کے ہونگے یا یہ کہ اسے آزادی اور دیگر مراعات سے محروم کردیا جائے ۔ (اس طرح زمین سے الگ کردینے کا مفہوم ہوگا اسے باقی آبادی سے الگ کردینا) ۔

ن ق ب

نَقْبٌ ۔ (دیوار میں) سوراخ کرنے کو کہتے ہیں ۔ اور خود سوراخ کو بھی* ۔ سورۃ کہف میں ہے وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا (۱۸/۹۷) ۔ وہ اس دیوار میں سوراخ نہیں کرسکتے تھے ۔ تَنَقَّبَ عَنِ الشَّيْءِ کے معنی

---

*تاج ۔ **محیط ۔

ہیں کسی چیز کی تلاش میں بہت زیادہ کوشش کرنا ۔ مارے مارے پھرنا**۔ سورۃ قٓ میں ہے ۔ فَنَقَّبُوْا فِی الْبِلَادِ (٥٠/٣٦) ۔ انہوں نے شہروں کو چھان مارا کہ کوئی پناہ کی جگہ مل جائے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ نَقَبَ کے معنی ہیں نُقُوْبٌ (پہاڑوں کے تنگ راستوں یا دروں) میں چلنا ۔ اَلنَّقِیْبُ بانسری (کیونکہ اس میں چھید ہوتے ہیں) ۔ اَلنَّقِیْبُ کے معنی ہیں قوم کا نگران ۔ ضامن ۔ سردار ۔ لوگوں کے احوال معلوم کرنے والا ۔ چھان بین کرنے والا* ۔ بنی اسرائیل کے متعلق ہے وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا (٥/١٢) ۔ ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کردیئے ۔

اَلنَّقَبَةُ ۔ سوراخ ۔ چہرے کو بھی کہتے ہیں ۔ غالباً اسی لئے کہ اس میں کئی سوراخ ہیں ۔ اور اَلنِّقَابُ ۔ اس کپڑے کو جس سے عورت اپنے چہرے کو چھپاتی ہے ۔ اَلنِّقَابُ کے متعلق ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ معنی خلاف قیاس ہیں ۔ اَلْمَنْقَبَةُ ۔ قابل فخر بات ۔ بلند کارنامہ ۔ خوبی ۔ اچھی خصلت* ۔

ن ق ذ

نَقَذَهٗ و اَنْقَذَهٗ و اسْتَنْقَذَهٗ ۔ اسے چھڑانا، چھٹکارا دلانا ، نجات دلانا ۔ نَقَذَ الرَّجُلُ ۔ آدمی نے نجات پائی اور سلامت رہا*** ۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ کسی سخت مشکل اور مصیبت و تباہی سے رہائی حاصل ہونے پر بولا جاتا ہے**** ۔ لغزش کھانے اور پھسل کر گرنے والے کو بطور دعا نَقْذًا لَکَ کہا جاتا ہے ، یعنی خدا تجھے سلامت رکھے ۔ اَلنَّقِیْذَةُ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جسے دشمن کے قبضہ سے چھڑا لیا جائے*** ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ فَاَنْقَذَكُمْ مِنْهَا (٣/١٠٢) ''اس نے تمہیں اس سے بچا لیا'' ۔ نیز (٣٩/١٩ و ٣٦/٢٣) ۔ سورۃ حج میں ہے لَا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ (٢٢/٧٣) ۔ ''وہ اسے چھڑا نہیں سکتے'' ۔

ن ق ر

نَقَرَهٗ نَقْرًا ۔ اس کو مِنْقَار (سِل راھنے کے آلہ) سے مارا ۔ اَلنَّقْرُ ۔ چکی یا سل کو راھنا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو ٹھوکنا جس سے اس میں گڑھے پڑ جائیں ۔ پھر اس کے معنوں میں وسعت ہوگئی ۔ اَلْمِنْقَارُ ۔ اس آلے کو کہتے ہیں جس سے سل وغیرہ راھتے ہیں ۔ نیز چونچ کو ۔ چونکہ اس سے کھٹ کھٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے اس

*تاج ۔ **محیط ۔ ***تاج و محیط ۔ ****راغب ۔

لئے آواز کے معنوں میں بھی یہ مادہ استعمال ہوتا ہے۔ بالخصوص ایسی آواز جو زبان کو تالو سے چمٹا کر نکالی جائے اور اس سے گھوڑے کو ھانکا جائے۔ یا چٹکی کی آواز۔ اَلنَّقِیْرُ ۔ سیٹی جیسی آواز*۔ لسان العرب میں ہے کہ نَاقُوْرٌ بگل کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ (۷۴/۸)۔ جب سرکش قوتوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جائے گا۔

اَلنُّقَارَۃُ ۔ وہ ذرا سی چیز جسے پرندہ ایک مرتبہ اپنی چونچ میں اٹھالے*۔ اس سے اَلنَّقِیْرُ اس چھوٹے سے نقطہ کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کی پشت پر ہوتا ہے*۔ اس سے مراد ہوتی ہے بہت تھوڑی اور حقیر سی شے۔ سورۃ نساء میں ہے۔ لَا یُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِیْرًا (۴/۵۳)۔ ''لوگوں کو اتنا بھی نہیں دینگے جتنی اُڑد کے دانے پر سفیدی''۔

ن ق ص

اَلنَّقْصُ ۔ حصہ میں کمی ہونا۔ ابن القطاع نے لکھا ہے کہ نَقْصٌ کے معنی ہیں کسی چیز کے مکمل ہو جانے کے بعد اس میں سے کچھ جاتے رہنا۔ اور اَلنُّقْصَانُ اُس مقدار کو کہتے ہیں جو اس شے میں سے جاتی رہے۔ اَلنَّقِیْصَۃُ کے معنی عیب ہیں*۔ تَنَاقَصَ الشَّیْءُ ۔ چیز آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی**۔ نَقَصَ ۔ یَنْقُصُ ۔ کم کیا۔ کم ہوا۔ (لازم اور متعدی دونوں کے لئے آتا ہے)۔

قرآن کریم میں ہے نَقْصٍ مِنَ الْاَمْوَالِ (۲/۱۵۵)۔ مال میں کمی آجانا۔ نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے جد و جہد کرنے میں اس جماعت کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان میں اموال کا نقصان بھی ہے۔ لیکن اس نظام کے قیام کے بعد انہیں ہر طرح کی فراوانیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ اگر کسی نظام کا نتیجہ لوگوں کے لئے رزق کی کمی ہو تو وہ نظام فرعونی ہے اور رزق کی کمی خدا کا عذاب، جیسا کہ (۷/۱۳۰) سے واضح ہے۔ کسی نظام کے قیام میں مشکلات اور مصائب کا سامنے آنا اور بات ہے اور اس کے نتائج کا نقصان دہ اور ضرر رساں ہونا اور بات۔ قرآنی نظام کے نتائج نہایت خوش گوار ہوتے ہیں اگرچہ اس کے قیام میں مخالفین کی طرف سے پیش کردہ بہت سی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ ان میں نقصِ مال بھی شامل ہے۔

ن ق ض

نَقْضٌ کے معنے ہیں ڈھا دینا۔ توڑ دینا۔ کھول دینا۔ عہد کرکے اسے توڑ دینا*۔ اَلنِّقْضُ ۔ مسمار شدہ عمارت یا اس کا ملبہ۔ نیز وہ اونٹ جو

*تاج ۔ **محیط ۔

مسلسل چلنے سے لاغر ہوگیا ہو۔ اَلنَّقِیْضُ۔ آدمی کے جوڑوں کی آواز*۔ اَلَّذِیْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (۹۴/۳)۔ وہ بوجھ (ذمہ داری) جس نے تمہاری کمر توڑ دی تھی۔ تَنَاقُضٌ۔ توافق کی ضد ہے۔ ایک دوسرے کی مخالفت۔ یعنی جس میں ایک بات دوسری بات کو توڑ رہی ہو۔

قرآن کریم میں نَقْضٌ کا لفظ عہد شکنی کے لئے عام طور پر آیا ہے (۲/۲۷ و ۱۶/۹۱)۔ نیز نَقَضَتْ غَزْلَهَا (۱۶/۹۲) کے معنی ہیں سوت کے ٹکڑے ٹکڑے کردئے۔ یا اس کے بل کھول دئے۔

ن ق ع

اَلنَّقْعُ۔ عمدہ خالص مٹی والی زمین جس میں پانی اکٹھا ہو جائے۔ کسی جگہ اکٹھا ہو جانے والا پانی۔ اوپر اٹھنے والا غبار*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی سیال چیز کا اپنی جگہ ٹھہر جانا اور (۲) ایک قسم کی آواز۔ اس لفظ کے اور بھی بہت سے معانی ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں جہاں یہ لفظ آیا ہے۔ یعنی فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا (۱۰۰/۴)۔ وہاں اسکے معنی گرد و غبار اڑانے ہی کے ہیں۔ یعنی مجاہدین کے وہ گھوڑے جو گرد و غبار اڑاتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس جاتے ہیں۔

ن ق م

اَلنَّقَمُ۔ وسطِ طریق۔ راستے کا درمیانی حصہ**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے معنی ہیں کسی چیز کو ناپسندیدہ قرار دینا اور اسے معیوب بتانا۔ اس اعتبار سے اِنْتِقَامٌ کے معنی ہونگے بری بات کو برا کہنا اور برائی کرنے والے کو برائی کا بدلہ دینا۔ اَلنَّقِمَةُ۔ جرم کی سزا دینا**۔ اسی کو مکافات عمل کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ذُوانْتِقَامٍ (۳/۴) کہا گیا ہے۔ یعنی وہ جس کے قانون کے مطابق اعمال اپنے نتائج برآمد کرتے ہیں اور مجرموں کو سزا ملتی ہے۔ ہمارے ہاں انتقام کا لفظ اس سے مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے جب یہ لفظ اللہ کے لئے بولا جائے تو اس کا وہ مفہوم نہیں لینا چاہئے جو ہم اپنے ہاں لیتے ہیں۔ اس کا مفہوم مکافات عمل ہے۔ سورہ اعراف میں قوم فرعون کے متعلق ہے فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ (۷/۱۳۶)۔ ہم نے انہیں ان کی غلط روش زندگی کا بدلہ دیا۔ اسی طرح سورہ سجدہ میں ہے۔ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِیْنَ مُنْتَقِمُوْنَ (۳۲/۲۲)۔ ہم مجرمین کو ان کے اعمال کا بدلہ

---

*تاج۔ **تاج و راغب۔

دیتے ہیں ۔ نَقَمَ کے معنی ہیں کسی بات کو ناپسند کرنا ۔ برا سمجھنا ۔ اعتراض کرنا (۵/۵۹) ۔ سورہ بروج میں ہے وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوا بِاللّٰهِ .... (۸۵/۸) ۔ اور یہ (کفار) ان (مومنین) کو اس وجہ سے ناپسند کرتے ہیں کہ یہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں ، یعنی وہ ان کے ایمان لے آنے کو معیوب سمجھتے ہیں ۔

ن ک ب

نَكَبَ عَنْهُ يَنْكُبُ و نَكِبَ يَنْكَبُ ۔ ہٹ جانا ۔ صحیح رخ پر نہ رہنا ۔ طَرِيْقٌ يَنْكُوْبٌ ۔ منزل مقصود سے ہٹا ہوا راستہ ۔ اَلنَّكْبَاءُ ۔ ہر وہ ہوا جو اپنے صحیح رخ سے ہٹ کر چلے*۔ (نیز ابن فارس)۔ قرآن کریم میں ہے عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ (۲۳/۷۴) ۔ وہ صحیح راستے سے ہٹے ہوئے ہیں ۔ اعراض برتتے ہیں ۔ اَلْمَنْكِبُ ۔ ہر چیز کا کنارہ نیز کندھا (کاندھا) ۔ مَنَاكِبُ الْاَرْضِ ۔ زمین کے اطراف و جوانب *۔ قرآن کریم میں ہے ۔ فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا (۶۷/۱۵) ۔ اس کے اطراف و جوانب میں چلو پھرو ۔ بعض نے اس کے معنی پہاڑوں کے بھی کئے ہیں ۔ کیونکہ اَلْاَنْكَبُ اُس شخص کو کہتے ہیں جس کا ایک کندھا دوسرے سے اونچا ہو**۔

ن ک ث

اَلنِّكْثُ ۔ پرانے کمبل یا دیگر اونی کپڑے وغیرہ جن کی بنائی کو کھول دیا جائے تا کہ انہیں دوبارہ بنا جا سکے ۔ نَكَثَ الْعَهْدَ ۔ عہد کو توڑ دیا ۔ نَكَثَ الْحَبْلَ ۔ رسی کو کھول دیا ۔ اَلنَّكِيْثَةُ ۔ وعدہ خلافی ۔ نیز رسی کے لڑ یا بٹ کو کہتے ہیں*** ۔ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو توڑنے کے ہیں (ابن فارس)۔

قرآن کریم میں ہے ۔ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (۷/۱۳۵) ۔ وہ عہد توڑ دیتے ہیں ۔ اَنْكَاثًا (۱۶/۹۲) ۔ ادھیڑی ہوئی اون وغیرہ کے ٹکڑے ۔

ن ک ح

نِكَاحٌ کے معنی ملانے اور جمع کرنے کے ہیں** ۔ لیکن اس طرح ملانا جس طرح نیند آنکھوں میں گھل مل جاتی ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں نَكَحَ النُّعَاسُ ۔ نیند اس کی آنکھوں میں گھل گئی ۔ یا جس طرح بارش کے قطرے

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔ ***تاج ۔

زمین کے اندر جذب ہو جاتے ہیں ۔نَكَحَ الْمَطَرُ الْاَرْضَ ۔ بارش کا پانی زمین میں خوب جذب ہو گیا ۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب بارش کا پانی زمین کی بالائی خشک سطح سے نیچے گزر کر زمین کی نمی تک جا پہنچے** ۔

ان مثالوں کے بعد سمجھ میں آسکتا ہے کہ قرآن کریم نے مرد و عورت کی عائلی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس میں نِکَاحٌ سے مراد کیا ہے؟ اس سے مراد ہے میاں بیوی کا ایسا تعلق جیسا آنکھ اور نیند کا ہوتا ہے ۔ ایک دوسرے میں اس طرح جذب ہو جانا جس طرح آنکھوں میں نیند گھل جاتی ہے ۔ جس طرح بارش زمین میں جذب ہو جاتی ہے ۔ ایسا تعلق (اور وہ عمر بھر کے لئے) اسی صورت میں پیدا ہو سکتا (اور قائم رہ سکتا) ہے جب میاں بیوی میں فکر و نظر کی کامل ہم آہنگی اور ذوق اور مزاج ، خیالات و تصورات اور نظریات و معتقدات کی یک جہتی ہو۔ یہ نکاح کی بنیادی شرط اور خصوصیت ہوگی ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ''طاہرہ کے نام خطوط'') ۔

ظاہر ہے کہ ایسے تعلق کے لئے باہمی رضامندی اولین اور بنیادی شرط ہوگی ۔ چنانچہ قرآن کریم نے خود اس کی تصریح کر دی ہے کہ اس میں تراضیِ مابین ضروری ہے ۔ (۴/۲۴ و ۲/۲۳۲) ۔ اور رضامندی اسی وقت ہوسکتی ہے جب لڑکی اور لڑکا خود فیصلہ کرنے کے قابل (یعنی بالغ) ہو چکے ہوں ۔ چنانچہ قرآن کریم نے بلوغت کے لئے ترکیب ہی بَلَغُوا النِّكَاحَ (۴/۶) کی استعمال کی ہے ۔ دوسری جگہ اس کی تشریح یہ کہہ کر کر دی ہے ۔ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ (۶/۱۵۲ و ۱۷/۳۴) اور اَشُدَّهٗ کے معنی دوسری جگہ یہ کہہ کر بیان کر دئے کہ وہ بچپن اور بڑھاپے کے درمیان کی عمر ہے (۴۰/۶۷) ۔ لہذا نہ نابالغ کے نکاح کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی لڑکے یا لڑکی کی طرف سے کسی دوسرے کی رضامندی ، خود ان کی رضامندی تصور کی جا سکتی ہے ۔

راغب نے کہا ہے کہ نِکَاحٌ کا لفظ عَقْدٌ کے لئے آتا ہے ۔ جماع کے لئے اس کا استعمال بطور استعارہ ہوتا ہے* ۔ قرآن کریم نے عُقْدَةُ النِّكَاحِ (۲/۲۳۵) بھی کہا ہے ۔ یعنی نکاح کی گرہ ۔

سورۃ نور میں لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا (۲۴/۳۳) آیا ہے ۔ جس کے معنے شادی کا انتظام ہیں ؛ یا نکاح کا سامان ۔ اس کے معنے رشتہ بھی ہوسکتے ہیں اور وہ اخراجات بھی جو ایک میاں بیوی کے لئے گھریلو زندگی میں ضروری ہوتے ہیں ۔ نیز بیوی کا مہر ۔ (باقی رہا نکاح کی تقریب پر خرچ اخراجات تو یہ محض

*محیط ۔ **تاج ۔

معاشرتی رسم ہے) ۔ قرآن کریم کی رُو سے ، بالغ (صاحب عقل و ہوش) لڑکے اور لڑکی کا یہ معاہدہ کہ وہ ان تمام حقوق و فرائض کے ساتھ جو اس باب میں خدا نے عائد کئے ہیں ، ازدواجی زندگی بسر کرینگے ، نکاح کہلائیگا ۔ اس کے لئے قرآن کریم نے نہ کوئی تقریب مقرر کی ہے نہ رسم ۔ رسوم و تقاریب معاشرتی چیزیں ہیں ۔ البتہ بعد کی پیچیدگیوں سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس معاہدہ کی شہادت بھی ہو اور اسے کہیں منضبط (درج) بھی کر لیا جائے ۔

ن ک د

نَـكِدَ عَيْشُـهُ ۔ اس کی زندگی تنگ اور سخت ہوگئی ۔ نَـكِـدَتِ الْبِئْرُ ۔ کنویں کا پانی کم ہو گیا ۔ اَلنُّكْـدُ ۔ وہ اونٹنیاں جن کے بچے زندہ نہ رہیں* ۔ یا جن کا دودھ بہ مشقت دوھا جاسکے** ۔ اس کے بنیادی معنوں میں کمی اور مشقت دونوں ہیں ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے کسی چیز کا اس کے طالب کےلئے بدقت نکلنا بتائے ہیں۔ نیز نَاقَـةٌ نَكْـدَاءُ کے معنے وہ اونٹنی ہیں جس کے دودھ نہ ہو۔ اَرَضُوْنَ نِـكَادٌ ۔ بہت کم پیداوار والی زمینیں* ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَ الَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا (۷/۵۸) ۔ خراب زمین سے بہت تھوڑی پیداوار ہوتی ہے ۔ یعنی جس پر محنت زیادہ کرنی پڑے اور حاصل کم ہو** ۔

ن ک ر

اَلنُّكْرُ ۔ اَلنَّكْرُ ۔ بہت زیادہ چالاکی ۔ عقل کی فریب کاری ۔ رَجُلٌ نَكِـرٌ ۔ بہت چالاک اور طرار آدمی ۔ اَلْمُنَاكَـرَةُ ۔ ایک دوسرے کو فریب دینا* ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَ الْمُنْكَرِ ۔ (۲۹/۴۵) ۔ یقیناً صلٰوۃ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے ۔ اس کے عام معنی ہوں گے ہر وہ بات جو حد سے تجاوز کر جائے اور ناپسندیدہ حرکت ۔ لیکن فَحْشَـاءُ کے معنی بخل بھی ہیں (دیکھئے عنوان ف ۔ ح ۔ ش) ۔ اور مُنْكَرٌ کے معنی ہیں عقل خود بین کی فریب کاریاں جن سے وہ انسان کو ہمیشہ یہ سکھاتی رہتی ہے کہ تجھے صرف اپنے مفاد کی حفاظت کرنی چاہئے ۔ دوسرے اپنی فکر آپ کریں ۔ ان معانی کی وضاحت (۷۰/۲۲-۱۹) سے ہو جاتی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ انسان کو اگر تنہا (اس کی عقل اور مرضی پر) چھوڑ دیا جائے تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے

*تاج ۔ **راغب ۔

تو واویلا مچا دیتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو اپنا ہاتھ روک لیتا ہے۔ اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ وَ الَّذِیْنَ فِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّائِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ (۷۰/۲۲-۲۵)۔ "لیکن مصلین کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ یعنی ان لوگوں کی جو نظام صلوٰۃ کے ہمیشہ پابند رہتے ہیں اور ان کے اموال میں ضرورت مندوں اور محروموں کا حق ہوتا ہے جس کا سب کو علم ہوتا ہے"۔

نَكُرَ الْاَمْرُ۔ معاملہ دشوار ہوگیا۔ اَلنَّكْرَاءُ۔ مصیبت اور سختی۔ نَكْرَاءُ الدَّهْرِ۔ زمانہ کی سختی اور مصیبت*۔ سورۃ کہف میں عَذَابًا نُّكْرًا آیا ہے (۱۸/۸۷)۔ یعنی سخت عذاب جسے پہلے انہوں نے نہ دیکھا ہوگا۔ اسی طرح سورۃ قمر میں شَیْءٍ نُّكُرٍ آیا ہے (۵۴/۶)۔ سخت مصیبت انگیز بات۔

نُكْرٌ*۔ ایسی بات جو خوش آیند نہ ہو۔ جسے دل قبول نہ کرے۔ جو طبیعت پر ناگوار گزرے (ابن فارس)۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہ لفظ فَرَحٌ* (خوشی) کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۳/۳۶)۔ سورۃ کہف میں ہے لَقَدْ جِئْتَ شَیْئًا نُّكْرًا (۱۸/۷۴)۔ تو نے یہ بڑی ہی ناخوش آئند بات کی ہے۔ اَنْكَرُ۔ بہت زیادہ ناخوش آئند (۳۱/۱۹)۔ اَلنَّكِیْرُ۔ انکار*۔ سورۃ شوریٰ میں ہے مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِیْرٍ (۴۲/۴۷)۔ "تم سے انکار نہیں ہوسکے گا"۔ نیز حق بات سے انکار کرنے کی سزا (یعنی تباہی اور بربادی)۔ نَكِیْرٌ کے معنے یہ بھی ہیں کہ جو کچھ برا لگے اسے بدل دیا جائے*۔ فَكَیْفَ كَانَ نَكِیْرِ (۲۲/۴۴)۔ سو میری سزا کیسی تھی؟ ان کی بد اعمالیوں پر میرا رد عمل کیسا ہوا؟

اَلنَّكِرَةُ۔ کسی چیز کو نہ پہچاننا۔ اَلْاِنْكَارُ۔ درحقیقت عِرْفَانٌ کی ضد ہے۔ یعنی نہ پہچاننا۔ چنانچہ سورۃ یوسف میں ہے۔ فَعَرَفَهُمْ وَ هُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (۱۲/۵۸)۔ یوسف نے انہیں (بھائیوں کو) پہچان لیا لیکن وہ اسے نہیں پہچان رہے تھے۔ سورۃ ہود میں ہے۔ نَكِرَهُمْ (۱۱/۷۰)۔ اس نے انہیں اجنبی سمجھا۔ ان پر اظہار تعجب کیا۔ اسی طرح سورۃ حجر میں قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ (۱۵/۶۲) کے بھی یہی معنی ہیں۔ یعنی اجنبی لوگ۔

تَنَكَّرَ۔ کسی چیز کو اس طرح بدل دینا کہ وہ پہچانی نہ جاسکے**۔ (۲۷/۴۱)۔

---

*تاج۔ **تاج و راغب۔ نیز ابن قتیبہ۔ القرطین ج/۲ صفحہ ۵۸۔

قرآن کریم میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اکثر مقامات میں آیا ہے۔ (مثلاً ۳/۱۰۴)۔ ان الفاظ (مَعْرُوْفٌ اور مُنْکَرٌ) کا صحیح مفہوم (ع۔ ر۔ ف) کے عنوان میں بتایا جاچکا ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ قرآنی معاشرہ اپنی زندگی کے معمولات کے لئے قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں آئین و قوانین اور قواعد و ضوابط مرتب کرتا ہے۔ جو باتیں اسطرح سے قابل قبول ٹھہرائی جاتی ہیں انہیں معروف کہا جاتا ہے۔ یعنی (Recognised by the Society) اور جن باتوں کو ناپسندیدہ یا ناقابل قبول قرار دیا جاتا ہے انہیں مُنْکَرٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی ان ہر دو جامع اصطلاحات (مَعْرُوْفٌ اور مُنْکَرٌ) کے تحت ایک اسلامی معاشرہ کے تمام محمود و نامحمود، معقول و نامعقول، مقبول و نامقبول، پسندیدہ اور غیرپسندیدہ امور آجاتے ہیں۔ اوراس تقسیم و تفریق کا معیار ہوتا ہے قرآن کریم کا غیر متبدل ضابطہ۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ مَعْرُوْفٌ وہ ہیں جنہیں انسان کی ''فطرت'' پہچان لے کہ وہ صحیح ہیں۔ اور مُنْکَرٌ وہ ہیں جن سے اس کی ''فطرت'' ابا (یا نفرت) کرے۔ تو یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ انسان کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو حق اور باطل کا امتیاز از خود کرسکے۔ اگر اس کے اندر کوئی ایسی چیز ہوتی (جیسے حیوانات میں جبلت ہوتی ہے) تو اس کے لئے وحی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ (دیکھئے عنوانات ف۔ ط۔ ر اور ل۔ ھ۔ م) مَعْرُوْفٌ وہ ہے جسے وحی قابل قبول قرار دے دے۔ اور مُنْکَرٌ وہ ہے جسے وہ ناپسندیدہ ٹھہرا دے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ان میں مملکت کے قوانین و آئین سے لے کر معاشرہ کے عام قواعد و ضوابط اور رسوم و رواج سب آجاتے ہیں۔ وحی نے (بجز چند احکام) ان باتوں کی فہرستیں مرتب کرکے نہیں دیں۔ اس نے عام اصول دے دیئے ہیں جن کے ماتحت قرآنی معاشرہ اس قسم کی فہرستیں خود مرتب کرتا ہے۔

لہذا مَعْرُوْفٌ وہ جسے قرآنی معاشرہ (Recognise) کرے۔ اور مُنْکَرٌ وہ جسے وہ (Recognise) نہ کرے۔ چنانچہ وہ جو سورۃ ممتحنہ میں کہا گیا ہے کہ مَعْرُوْفٌ میں رسول کی معصیت (نافرمانی) نہیں کی جائیگی (۶۰/۱۲) تو اس کے معنے یہی ہیں کہ ہر اُس بات میں اطاعت کی جائیگی جسے قرآنی نظام قانونی حیثیت دے دے۔ اور قرآنی نظام صرف انہی باتوں کو قانونی حیثیت دے سکتا ہے جو قرآنی اصول و قوانین و احکام کے مطابق ہوں۔ جو بات قرآن کریم کے خلاف ہوگی وہ معروف نہیں بلکہ منکر ہوگی۔ یہی معروف و منکر کا اٹل معیار ہے۔

ن ک س

نَکَسَ یَنْکُسُ۔ کسی چیز کو الٹ دینا ۔ اوندھا کر دینا ۔ اِنْتَکَسَ فُلَانٌ ۔ فلاں اپنے سر کے بل گر پڑا ۔ اَلْمُنْتَکِسُ ۔ وہ گھوڑا جو چلتے وقت کمزوری سے سر اور گردن جھکا کر چلے ۔ وہ گھوڑا جو دوڑ میں دوسرے گھوڑوں کے ساتھ چل نہ سکے ۔ اَلنَّاکِسُ ۔ وہ جسکا سر جھکا ہوا ہو*۔

سورہ انبیاء میں ہے کہ حضرت ابراهیمؑ نے اپنی قوم کے سربرآوردہ افراد کو دلائل و براہین سے سمجھا دیا کہ بت پرستی کس طرح وجہ تذلیل انسانیت ہے ۔ اور وہ ان دلائل سے اپنے دل میں قائل بھی ہو گئے ۔ لیکن پھر ان کی مفاد پرستیاں اور عزت نفس ان کے سامنے آگئی اور وہ اپنی بات کی طرف لوٹ گئے۔ اسے قرآن کریم نے ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰی رُءُوْسِهِمْ (۲۱/۶۵) سے تعبیر کیا ہے ۔ یعنی وہ فکر و نظر کی ان بلندیوں تک پہنچ جانے کے بعد پھر اوندھے گر گئے ۔ پھر انہی پستیوں میں آگرے جہاں وہ پہلے تھے ۔

سورہ السجدہ میں مجرمین کے متعلق ہے نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ (۳۲/۱۲) ذلت سے اپنے سر جھکائے ہوئے ۔ سورہ یٰسٓ میں ہے ۔ وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِی الْخَلْقِ (۳۶/۶۸) ۔ جو بڑھاپے کی عمر تک پہنچ جاتا ہے وہ (قویٰ وغیرہ کے لحاظ سے جوانی کی) بلندیوں سے پھر پستیوں کی طرف آجاتا ہے ۔ جن باتوں کا پہلے علم ہوتا ہے انہیں بھی بھول جاتا ہے (۱۶/۷۰ ؛ ۲۲/۵) ۔ یہ بڑھاپے کی وجہ سے قویٰ کے مضمحل ہو جانے کا عام بیان ہے ۔

ن ک ص

نَكَصَ عَنِ الْاَمْرِ ۔ کسی کام سے ھچکچانا ۔ اور پیچھے ہٹ جانا ۔ نَكَصَ عَلٰی عَقِبَيْهِ ۔ لوٹ گیا ۔ پلٹ گیا ۔ کہا گیا ہے کہ یہ لفظ خیر اور بھلائی سے پلٹ جانے کے لئے خاص ہے لیکن عام طور پر یہ لفظ لوٹ جانے کے معنوں میں آتا ہے**۔ نَكَصَ عَلٰی عَقِبَيْهِ ۔ (۸/۴۸) ۔ اُلٹے پاؤں پھر جانے کے معنوں میں آیا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس میں ڈر اور بزدلی کی وجہ سے پیچھے ہٹنے کا مفہوم ہے اور ابن درید کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کا استعمال بھلائی سے پلٹ جانے کے لئے ہوتا ہے ۔

ن ک ف

نَكَفَ کے بنیادی معنی کسی چیز کو الگ کر دینے ، کاٹ دینے اور ایکطرف کر دینے کے ہوتے ہیں***۔ ابن فارس نے بھی اسکی تائید کی ہے ۔

---

* تاج و راغب و محیط ۔ **تاج و محیط ۔ ***راغب ۔

نَكَفْتَ الدَّمْعَ ۔ انگلی سے آنسوؤں کا رخسار پر سے الگ کر دینا (پونچھ دینا) * ۔ اسی سے اِسْتَنْكَفَ کے معنی ہیں رک جانا ۔ کسی کام سے عار آنا ۔ اسے برا محسوس کرنا اور خود کو اس سے بالاتر سمجھنا ** ۔ رَجُلٌ نِكْفٌ وہ آدمی جس سے نفرت کی جائے** ۔

قرآن کریم میں ہے لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ (۴/۱۷۲) ۔ مسیح (کہ جسے ، تم اے نصاریٰ ، خدا یا خدا کا بیٹا کہتے ہو) اسے اس سے قطعاً عار و انقباض نہیں کہ وہ خدا کا عبد ہو ۔ لہذا یہ مدعی سست اور گواہ چست کا عجیب معاملہ ہے کہ وہ تو خدا کا عبد بننے میں فخر محسوس کرے اور تم اسے خدا بنا لو ۔

ن ک ل

اَلنِّكْلُ ۔ مضبوط بھاری سخت بیڑی (جمع اَنْكَالٌ) ۔ ایک سخت قسم کی لگام یا لگام کا لوہا ۔ اس سے نَكَّلَهٗ کے معنی ہیں کسی کو اس روش سے روک دینا جس پر وہ چل رہا ہو ۔ نَكَلَ عَنْهُ ۔ اس سے الٹے پاؤں لوٹ جانا ۔ نَكَّلَ بِهٖ کے معنی ہیں اسے جرم کی عبرت انگیز سزادی ، کیونکہ سزا سے خود مجرم آیندہ کے لئے اس جرم کے ارتکاب سے رک جاتا ہے اور دوسرے بھی اسی سے عبرت پکڑتے ہیں*** ۔

قرآن کریم میں مخالفین قریش کے متعلق ہے ۔ اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا (۷۳/۱۲) ۔ ہمارے پاس ان کے لئے سخت بیڑیاں ہیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ بیڑیاں وہ ہیں جو جنگ بدر و حنین وغیرہ میں انہیں پہنائی گئیں ۔ یا وہ تمام تدبیریں جن سے یہ لوگ اس مخالفت سے روکے گئے[1] ۔ سورہ النّٰزِعٰت میں ہے ۔ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (۷۹/۲۵) ۔ خدا نے سزا دے کر فرعون کو " آخرۃ و اولی " کے لئے عبرت بنا دیا ۔ (یہاں اخذ کے وہی معنی ہونگے جو اتَّخَذَ کے ہیں) ۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے نَكَالٌ میں ہر وہ تدبیر شامل ہوگی جس سے کسی کو اسکی غلط روش سے روک دیا جائے اور عبرتناک سزا دی جائے ۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں ہے کہ یہودیوں میں سے جن لوگوں نے احکام سبت کی خلاف ورزی کی تھی انہیں ایسی ذلت آمیز سزا دی گئی کہ وہ دوسروں کے لئے نَكَالًا بن گئی (۲/۶۶) ۔ یعنی موجب عبرت ۔ اسی طرح چوری (سرقہ) کی سزا کے متعلق ہے نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ (۵/۳۸) ۔ یہ خدا کی تجویز کردہ ایسی سزا ہے جس سے وہ مجرم آئندہ ارتکاب جرم سے رک جائے ۔ یہ اس قسم کے جرائم کے لئے روک کا کام دیگی ۔ یعنی مقصد اس جرم کی روک تھام ، انسداد ہے ،

*راغب ۔ **تاج ۔ ***تاج و ابن فارس ۔

[1] (مسلسل پڑھئے) یہ بیڑیاں ہر اُس دشمن کو پہنائی جائینگی جو حق کی مخالفت کریگا ۔ آخرت میں یہ بیڑیاں اس کے ارتقاء کے رستے میں حائل ہونگی ۔ اسی کو جہنم کہا جاتا ہے ۔

جس طریق سے بھی یہ مقصود حاصل ہو جائے ۔ ارتکاب جرم کے بعد عبرتناک سزا بھی انسداد جرم کا ایک طریق ہوتا ہے ۔ اور مناسب حالات میں (احساس ندامت رکھنے والے) مجرم کو معاف کرکے اسکی اصلاح کر دینا بھی ایک طریقہ ۔ (۳۸-۳۹ ۵) میں یہ دونوں باتیں آگئی ہیں ۔

ن م ر ق

اَلنُّمْرُقُ ۔ اَلنُّمْرُقَةُ ۔ گدّا ۔ تکیہ ۔ وہ نمدہ وغیرہ جسے سوار کجاوہ کے نیچے اونٹنی کے پشت پر بچھاتا ہے*۔ قرآن کریم میں نَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ (۸۸/۱۵) آیا ہے یعنی صف میں بچھے ہوئے گدّے یا تکیے ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ میں قاف زیادہ ہے ۔ اسکی اصل نَمِرَةٌ ہے جس کے معنی دھاری دار کمبل کے ہیں ۔ (غالباً وہ گدہ اس قسم کے کمبلوں کا بنتا ہوگا) ۔

ن م ل

اَلنَّمْلُ ۔ نَمْلَةٌ کی جمع ہے ۔ چیونٹیاں** ۔ قرآن کریم میں حضرت سلیمان کے قصہ میں ہے حَتّٰى اِذَا اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۔ قَالَتْ نَمْلَةٌ يٰاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ (۲۷/۱۸) ۔ صاحب تاج کے نزدیک وادی النمل ، جبرین اور عسقلان کے درمیان ہے* ۔ بعض کا قول ہے کہ وہ ارض شام میں ہے ۔ لیکن اگر یہ وادی اُس راہ گزر پر واقع تھی جو ملکہ سبا کے ملک کی طرف جاتی تھی تو اس کا محل وقوع یمن کے نواح میں ہوگا ۔ بہرحال وادی نمل چیونٹیوں کی جگہ نہیں ، بلکہ ایک قبیلہ کے مسکن کا نام ہے ۔ اور اَلنَّمْلُ اُس قبیلہ کا نام ۔ نَمْلَةٌ ۔ اس قبیلہ کی ایک عورت ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں عام طور پر عورتیں قبائل کی رئیس ہوتی تھیں ۔ جیسا کہ ملکہ سبا کے واقعہ سے ظاہر ہے ۔ یعنی ان قبائل کا تمدن (Matriarchal) تھا ۔

اَنَامِلُ (اَنْمُلَةٌ کی جمع ہے) ۔ انگلیوں کے بالائی سرے ۔ (۳/۱۱۸) ۔

ن م م

اَلنَّمُّ ۔ بھڑکانا اور برانگیختہ کرنا ۔ فساد پیدا کرنے کے لئے بات کو پھیلانا ۔ بات میں جھوٹ ملا کر اسے مزین بنانا ۔ اَلنَّمِيْمَةُ ۔ چغلی ۔ آہستہ بات کی آواز ۔ لکھنے کی آواز یا ترکش کی آواز کو بھی کہتے ہیں ۔ اَلنَّامِقَةُ ۔

*تاج ۔ **تاج و قاموس ۔ دیکھئے مادہ ''و د ی''

حس و حرکت ۔ حیات نفس*۔ اَلنَّمَّامُ ۔ جو شخص اپنے پیٹ میں بات نہ رکھ سکے**۔ ادھر ادھر باتیں کرتا رہے ۔ چغلخور۔

قرآن کریم میں ہے ۔ مَشَّآءٍ بِنَمِیْمٍ (۶۸/۱۱) ۔ چغل خور ۔ ادھر کی باتیں اُدھر بہت زیادہ پہنچانے والا ۔ (یہاں نَمِیْمٌ بمعنی نَمِیْمَۃٌ ہے)۔ لوگوں میں فساد پیدا کرنے کے لئے بہت زیادہ جھوٹی باتیں، اور باتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش ،کرنے والا ۔

ن و ء

نَاءَ ۔ یَنُوْءُ ۔ نَوْءً ۔ دشواری اور مشقت سے اٹھنا ۔ نَاءَ بِالْحِمْلِ ۔ وہ بوجھ کو لیکر گراں باری سے اٹھا ۔ نَاءَ بِهِ الْحِمْلُ ۔ بوجھ نے اسے گرانبار کر دیا اور جھکا دیا***۔ قرآن کریم میں قارون کے خزانے کے متعلق ہے ۔ لَتَنُوْءُ بِالْعُصْبَةِ (۲۸/۷۶) ۔ انہیں ایک مضبوط طاقتور جماعت بھی بمشکل اٹھا سکتی تھی ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ نَاءَ کے معنی ہیں وہ بوجھل چیز کو لیکر اٹھا ۔

ن و ب

اَلنَّوْبُ ۔ کسی چیز کا بار بار لوٹنا ۔ شہد کی مکھیوں کو اسی لئے نُوْبٌ کہتے ہیں کہ وہ بار بار اپنے چھتے کی طرف آتی ہیں ۔ حادثہ یا واقعہ کو نَائِبَۃٌ ۔ (جمع نَوَائِبُ) کہتے ہیں کہ یہ چیز انسانی زندگی میں بار بار پیش آتی رہتی ہے ۔ نُوْبَۃٌ ۔ نیز (نَوْبَۃٌ) باری کو کہتے ہیں ۔ (دراصل پانی پلانے کی باری کو کہتے ہیں)۔ اَلْمُنْتَابُ ۔ پانی کی طرف جانے کا راستہ کیونکہ لوگ اس پر باری باری سے گذرتے ہیں ۔ اَلنِّیَابَۃُ ۔ قائم مقامی کرنا ۔ باری ۔ اَنَابَ زَیْدٌ عَنْهُ وَکِیْلاً ۔ زید نے اپنی جگہ وکیل کو قائم مقام کر دیا****۔

انابت الی اللہ ۔ قرآن کریم کی ایک خاص اصطلاح ہے ۔ اَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ (۳۹/۵۴) ۔ مُنِیْبِیْنَ اِلَیْهِ (۳۰/۳۱) ۔ وغیرہ ۔ اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے شہد کی مکھی (نَوْبٌ) کی مثال سامنے لائیے ۔ وہ فضا کی پہنائیوں میں سینکڑوں میل ادھر اُدھر نکل جاتی ہے ۔ مختلف وادیوں میں پھرتی اور مختلف باغات میں گھومتی ہے ۔ لیکن اپنی محنت کے ماحصل کو لیکر ہر بار اپنے چھتہ (مرکز) کی طرف لوٹتی ہے ۔ وہ کہیں ہو اسکا چھتہ

*تاج و راغب ۔ **ابن فارس ۔ ***تاج و محیط ۔ ****تاج و راغب و محیط ۔

اسکی نگاہوں کا مرکز اور اس کی گردش کا محور ہوتا ہے۔ وہ اسکی نظروں سے ایک ثانیہ کے لئے بھی اوجھل نہیں ہوتا۔ وہ اسکی تمام توجہات کا قبلہ ہوتا ہے۔ یہی کیفیت، سفر زندگی میں ایک مرد مومن کی ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے کسی شعبے اور دنیا کے کسی گوشے میں ہو، اسکی توجہات کا مرکز اور گردشوں کا محور خدا کا قانون (اور اسے نافذ کرنے والا نظام) ہوتا ہے۔ وہ ہر فیصلہ کے لئے اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنی متاع حیات اور حاصل تگ و تاز کو لیکر اس کی طرف لوٹتا ہے۔ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهُ (۲/۱۵۴)۔ "اور جہاں کہیں تم ہو اپنی توجہات کو اسی طرف مرکوز رکھو"۔ مومن کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

پرد در وسعت گردوں یگانہ نگاہ او بشاخ آشیانہ

بعینہ یہی کیفیت شہد کی مکھی کی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا (۱۶/۶۹)۔ "تو تمام پھلوں (پھولوں) کا رس چوس، اور اپنے رب کے راستے پر فرمانبرداری سے چلی جا"۔ ایک مومن دنیا بھر کے علوم و فنون کا اکتساب کرتا ہے لیکن ان کے ماحصل کا مرکز قرآن کریم کو بناتا ہے۔ قرآنی نظام اسے پھر تمام نوع انسانی کی منفعت کے لئے استعمال میں لاتا ہے۔

یہ ہے اِنَابَت اِلَى اللّٰہ کا صحیح مفہوم۔ زندگی کے ہر دوراہے پر فیصلہ کے لئے اسی کی طرف رجوع کرنا۔ وہیں سے راہ نمائی لینا۔ اور اپنی محنتوں کے ماحصل کو لیکر اسی کی طرف لوٹنا۔

صاحب لطائف اللغة نے لکھا ہے کہ توبہ، لغزش کے بعد ندامت کے لئے آتا ہے اور انابت، مستقبل میں لغزشوں سے محفوظ رہنے کے لئے۔ یعنی توبہ میں انسان، غلط قدم اٹھ جانے کے بعد، واپس آکر صحیح راستے پر گامزن ہوتا ہے اور انابت میں قدم اٹھانے سے پہلے ہی سوچ لیتا ہے کہ صحیح راستہ کونسا ہے اور پھر اسی راستے پر چلتا ہے۔ یہ حفظ ما تقدم (Preventive) ہے، وہ تدبیر بعد مرض (Curative)۔

ن و ح

نَاحَ۔ وہ چیخ چیخ کر رویا۔ نَوْحٌ۔ وہ عورتیں جو نوحہ کرنے کے لئے جمع ہوں۔ نیز نوحہ کرنا۔ اَلنِّيَاحَةُ۔ نوحہ کرنا۔ اَلتَّنَاوُحُ۔ ایک

دوسرے کے آمنے سامنے ہونا (جسطرح عورتیں نوحہ کرتے وقت ہوتی ہیں)*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں (یعنی ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونا)۔

نُوْحٌ۔ حضرت نوحؑ (۲۷/۵۹)۔ یہ غیر عربی لفظ ہے۔ اگرچہ بعض نے کہا ہے کہ یہ ان کا لقب ہے کیونکہ وہ بہت روتے اور گڑگڑاتے رہتے تھے*۔ لیکن زیادہ صحیح یہی نظر آتا ہے کہ یہ غیر عربی لفظ ہے۔

قرآن کریم نے سلسلۂ نبوت کا آغاز بالعموم حضرت نوحؑ کے تذکرہ سے کیا ہے۔ مثلاً سورہ نساء میں ہے اِنَّا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ كَمَا اَوْحَيْنَا اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ.... (۴/۱۶۳)۔ " بیشک ہم نے تیری طرف وحی کی ہے جسطرح نوح کیطرف اور اس کے بعد دیگر انبیاء کیطرف وحی کی تھی"۔۔۔۔۔ (البتہ قرآن کریم میں ایک مقام پر حضرت نوحؑ کے ساتھ آدم کا بھی نام آیا ہے۔ اس کے لئے دیکھئے عنوان (ا۔ د۔ م)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوع انسانی میں سلسلۂ رشد و ہدایت کی ابتداء قوم نوح سے ہوئی۔

انسانی آبادی کی ابتدا کس خطۂ زمین اور کونسی نسل سے ہوئی، یہ مسئلہ ایک مدت سے ارباب علم و تحقیق کے پیش نظر ہے۔ لیکن اب فیصلہ کا رخ اس طرف ہے کہ اسکی ابتدا عرب کے علاقہ سے ہوئی جہاں کی سامی نسل انسان کی تمدنی زندگی کی مؤسس تھی۔ اسی قوم میں دجلہ اور فرات کی وادیوں میں، آج سے قریب چھ سات ہزار سال قبل، حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے۔ یہ تحقیق صرف تاریخی ہے۔ قرآن کریم (ان معاملات میں) نہ زمان سے بحث کرتا ہے نہ مکان سے۔ وہ قوموں کی زندگی اور موت کے اصولوں کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ تاریخی جزئیات سے بحث نہیں کرتا۔

حضرت نوحؑ اپنی قوم کے ایک فرد تھے۔ اسی لئے قرآن کریم انہیں ان کے مخاطبین کا بھائی کہکر پکارتا ہے۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ.... (۲۶/۱۰۶)۔ " جب ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا"۔

اگرچہ قرآن کریم نے سلسلۂ نبوت کا آغاز حضرت نوحؑ کے تذکرہ سے کیا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے پہلے بھی اس قوم میں خدا کے رسول آچکے تھے۔ قرآن کریم میں ہے وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ.... (۲۵/۳۷)۔ " قوم نوح نے جب رسولوں کی تکذیب کی تو ہم نے انہیں غرق کردیا"۔

*تاج و راغب۔

ایسا نظر آتا ہے کہ اس زمانے میں ذہن انسانی ہنوز اپنے عالمِ طفولیت میں تھا اور وہ لوگ تمدنی زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضروریات بھی اپنی عقل سے پوری نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کو وحی کے ذریعے بتایا گیا کہ وہ کشتی کسطرح بنائیں ... وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا .... (۱۱/۳۷) "ہم نے نوح کی طرف وحی کی کہ .... وہ ہماری زیرِ نگرانی ہماری وحی کے مطابق کشتی بنائے"۔

حضرت نوحؑ کا پیغام وہی تھا جو تعلیمِ ربانی کا اصل الاصول ہے۔ یعنی يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهُ ... (۷/۵۹)۔ "اے میری قوم۔ تم خدا کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی الٰہ نہیں"۔ قوم مختلف بتوں کی پرستش کرتی تھی (۷۱/۲۳)۔ اگر دعوت حضرت نوحؑ کا مقصد صرف اتنا ہوتا کہ وہ لوگ بتوں کی پرستش چھوڑ کر "خدا کی پرستش" میں لگ جائیں تو (ظاہر ہے کہ) اس کی مخالفت ساری قوم کی طرف سے ہونی چاہئے تھی۔ لیکن قرآن کریم بتاتا ہے کہ قوم کے نچلے طبقہ نے اس دعوت پر لبیک کہا (۲۶/۱۱۱) اور اربابِ دولت و حشمت (سرداران قوم) کی طرف سے اسکی مخالفت ہوئی (۱۱/۲۷)۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ دعوت ایسی تھی جس میں مترفین (آسودہ حال سرمایہ داروں) کا طبقہ اپنی ہلاکت دیکھتا تھا اور غریبوں کا طبقہ اپنے لئے زندگی کے آثار پاتا تھا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو اعلٰے طبقہ کے نزدیک قابلِ نفرت شمار ہوتا تھا کیونکہ وہ انہیں اراذل (کمینے) کہتے تھے (۲۶/۱۱۱؛ ۱۱/۲۷)۔

مترفین کے طبقہ نے اس دعوت کی سخت مخالفت کی۔ حضرت نوحؑ کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں (۵۴/۹)۔ اور یہ مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ حضرت نوحؑ نے محسوس کیا کہ وہ مغلوب ہوجائینگے (۵۴/۱۰)۔ اس کے بعد طوفان آیا (۵۴/۱۱-۱۲)۔ مخالفین غرق ہوگئے اور حضرت نوحؑ اور ان کے متبعین کشتی میں سوار ہو کر صحیح و سلامت خشکی پر اتر گئے۔

اسی سلسلہ میں قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ "غیر" جو حضرت نوحؑ کی دعوت پر ایمان لائے تھے ان کا شمار "اپنوں" میں ہوگیا تھا اور خود حضرت نوحؑ کا بیٹا اور آپ کی بیوی (جو آپ پر ایمان نہیں لائے تھے) ان کے متعلق کہہ دیا کہ وہ آپ کے اہل میں سے نہیں (۶۶/۱۰؛ ۱۱/۴۶)۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحی نے پہلے دن سے اس حقیقت کا اعلان کر دیا تھا کہ ملت کی تشکیل آئیڈیالوجی کے اشتراک سے ہوتی ہے۔ وطن اور خون کے رشتوں سے نہیں ہوتی۔

حضرت نوحؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا (۲۹/۱۴) ”وہ ان میں پچاس کم ایک ہزار برس رہا“۔ اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نوسو سال کی تھی۔ لیکن قدیم زمانے کی تاریخ میں ”بادشاہوں کی عمر“ سے مراد ہوتا تھا وہ زمانہ جس میں حکومت ان کے خاندان میں رہتی۔ اس اعتبار سے ساڑھے نوسو برس کا زمانہ وہ مدت ہے جس میں شریعت حضرت نوحؑ کا دور دورہ رہا۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ سَنَةٌ کے معنی سال کی چار فصلوں میں سے ایک فصل (چوتھائی سال) کے بھی ہیں لہذا ”أَلْفَ سَنَةٍ“ کے معنی ہوئے اڑھائی سو برس۔ اس میں سے پچاس سال نکال دینے سے باقی عمر دو سو سال رہ جاتی ہے جو مستبعد نہیں۔ [مزید تفصیل (س۔ ن۔ و) اور (ع۔ و۔ م) کے عنوانات میں دیکھئے]۔

ن و ر

اَلنُّوْرُ۔ روشنی، جس قسم کی بھی ہو۔ یا روشنی کی شعاع۔ زمخشری نے کہا ہے کہ ضِيَاءٌ میں نُوْرٌ سے زیادہ زور اور شدت ہوتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ضِيَاءٌ ذاتی روشنی کو کہتے ہیں اور نُوْرٌ اس روشنی کو جو ذاتی نہ ہو۔ چنانچہ قرآن کریم میں سورج کے لئے ضِيَاءٌ اور چاند کے لئے نُوْرٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے*۔ (نیز دیکھئے عنوان ض۔ و۔ أ)۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُوْرًا (۱۰/۵)۔ ”اللہ نے سورج کو درخشندہ اور چاند کو نورانی بنایا“۔ واضح رہے کہ ضیاء اور نور کا یہ فرق وہاں ہی ہوگا جہاں ان الفاظ کو ایک دوسرے کے مقابل لایا جائے گا۔ ورنہ نور کے معنے روشنی ہونگے۔ نُوْرٌ اسے کہتے ہیں جو خود واضح اورظاہر ہو اوردوسری چیزوں کوروشن اور واضح کردے*۔ اللہ نے اپنی کتاب (قرآن کریم) کو نُوْرٌ کہا ہے سورۃ مائدہ میں ہے قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُوْرٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ (۵/۱۵)۔ ”یقیناً تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی یعنی واضح کتاب آگئی“۔ روشنی کا خاصہ ہے کہ وہ اپنی دلیل آپ ہوتی ہے۔ یعنی وہ اپنے آپ کو دکھانے کے لئے کسی اور روشنی کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس لئے قرآن کریم اپنی دلیل آپ ہے اور اس قدر روشن اور واضح ہے کہ اسے اپنی وضاحت کے لئے کسی خارجی روشنی کی ضرورت نہیں۔ روشنی کا

*تاج۔

دوسرا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر شے کے اصلی مقام کو متعین کر دیتی ہے اور اس کی کیفیت کو ٹھیک ٹھیک واضح کر دیتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم، انسانی زندگی میں ہر شے کے متعلق بتا دیتا ہے کہ اس کا صحیح مقام کیا ہے اور قیمت کیا۔ اسی کا نام ہدایت یا راہنمائی ہے۔ یعنی غلط اور صحیح میں امتیاز کر دینا۔ لہذا جہاں اللہ نے قرآن کریم کو نور کہا ہے تو اس کے ساتھ ہی بتا دیا کہ اس نور (روشنی) سے مقصود کیا ہے۔ یَهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ یَهْدِیْهِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۵/۱۶)۔ ”اللہ اس روشنی کے ذریعے، ہر اس شخص کو جو اس کے قانون سے ہم آہنگ ہوتا ہے سلامتی اور تکمیلِ ذات کے راستوں کی طرف راہنمائی کر دیتا ہے اور اس طرح انہیں (ہر قسم کی) تاریکیوں سے نکال کر (زندگی کی) روشنی کی طرف لے آتا ہے“**۔ یعنی انہیں زندگی کی متوازن شاہراہ کی طرف راہ نمائی کر دیتا ہے۔ یہ لوگ اسی مشعل ہدایت کو لے کر دنیا میں چلتے پھرتے ہیں۔ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ (۶/۱۲۳)۔

مَنَارَةٌ اور مَنَارٌ اس مقام کو کہتے ہیں جہاں سے روشنی نکلے (اس کے بعد مجازاً اذان دینے کی جگہ کو بھی مَنَارَةٌ کہنے لگے)*۔ مَنَارٌ۔ ان حدود کو بھی کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لئے قائم کی جائیں*۔ مُنِیْرٌ۔ خوش رنگ اور روشن چیز یا آدمی کو کہتے ہیں*۔ نیز روشن کرنے والا۔

اَلنَّارُ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ نَارٌ اور نُوْرٌ دونوں لفظ ایک ہی اصل سے ہیں۔ (۲/۱۷)۔ نَارٌ کے معنے ہیں شعلے کی لپٹ جو نظر آجائے*۔ نیز اَلنَّارُ کے معنی علامت اور نشانی کے بھی آتے ہیں، اس لئے کہ عرب اپنے اونٹوں کو گرم لوہے سے داغ دے کر نشان لگایا کرتے تھے*۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ نَارٌ اور نُوْرٌ کے الفاظ بعض اوقات ایک ہی معنی میں استعمال ہو جاتے ہیں، لیکن اس کے لئے اسکی دلیل کچھ وزنی نہیں۔ نُوْرٌ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ نَارٌ میں نفرت اور وحشت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ اسی لئے نَارَتِ الْمَرْاَةُ تَنُوْرُ کے معنی ہیں عورت کا متنفر اور متوحش ہونا۔ ہرن نیز، وحشی (غیر مانوس) جانوروں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بَقَرَةٌ نَوَارٌ۔ اُس گائے کو کہتے ہیں جو نر سے متنفر ہو۔ حتّٰی کہ مُنَاوَرَةٌ کے معنی آپس میں گالی گلوچ کے ہیں۔ نیز نَائِرَةٌ کے معنی

*تاج۔ **موت کی تاریکی اور زندگی کی روشنی کے لئے دیکھئے (۶/۱۲۳)۔

عداوت ، بغض اور فتنہ کے ہیں کیونکہ عداوت اور بغض بھی ایک اندرونی آگ ہے ۔ نَائِرَۃٌ اَلْحَرْبِ ۔ سے مراد جنگ کا شر اور ہیجان ہے* ۔ نَارُ الْحَرْبِ ۔ اُس آگ کو کہتے تھے جسے عرب پہاڑ کی چوٹی پر جلاتے تھے اور جس سے مراد اعلانِ جنگ ہوتا تھا** ۔ نَارَ الْقَوْمُ کے معنے ہیں قوم نے شکست کھالی** ۔

اس سے عَذَابُ النَّارِ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں ۔ یعنی انسانی اعمال کے وہ تباہ کن نتائج جن سے متاعِ حیات جل کر راکھ کا ڈھیر ہوجائے ۔ (بمقابلہ جنت کے جس کے نیچے پانی کی نہریں ہیں ۔ پانی اور آگ کا تقابل مفہوم کو واضح کردیتا ہے ۔ دیکھئے عنوان ن ۔ ھ ۔ ر)۔ اس میں اس دنیا کی زندگی کی تباہی و بربادی بھی شامل ہے اور اس کے بعد کی زندگی کی ہلاکت سامانی بھی۔ اَصْحٰبُ النَّارِ وہ ہیں جو خوف و حزن کے عذاب میں مبتلا ہوں (۲/۳۸-۳۹)۔ یہ آگ دلوں کو محیط ہوتی ہے ۔ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ (۱۰۴/۶-۷) ۔ ''قانون خداوندی کی بھڑکائی ہوئی آگ جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہیں'' ۔ (مزید تفصیل جَھَنَّمُ اور ج ۔ح ۔ م کے عنوانات میں ملیگی) ۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ ابلیس کی تخلیق نَار سے ہوئی ہے (۳۸/۷۶)۔ اس لئے جہاں نَار سے بچنے کی تاکید ہے تو اس کے معنی ابلیسی روش سے بچنا ہے ۔ ابلیس تخریبی قوت کا مظہر ہے ۔ اسی لئے عَذَابُ النَّارِ تخریبی اعمال کے تباہ کن نتائج کا نام ہے جس سے انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کا نقشہ بھی بگڑ جاتا ہے اور خود اس کی اپنی ذات کی صلاحیتیں بھی جھلس جاتی ہیں ۔ اس طرح اس کی دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہو جاتی ہیں ۔

سورۃ حجر میں ہے ۔ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰہُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (۱۵/۲۷) ۔ جَآنّ سے مراد وہ تمام چیزیں یا قوتیں ہیں جو انسان کی نگاہ سے پوشیدہ (Invisible) ہیں ۔ اس آیت میں نَارِ سَمُوْم (سخت تیز آگ) سے مراد وہ حرارت ہوسکتی ہے جو مادہ کی اُس حالت میں ہوتی ہے جب اس نے ہنوز کوئی متشکل صورت اختیار نہ کی ہو ۔ ایٹم وغیرہ کی حرارتیں اسی قبیل سے ہیں ۔ نیز جان سے مراد وہ مخلوق بھی ہوسکتی ہے جو انسان سے پہلے اس دنیا میں آباد تھی اور جو اب نابود (Extinct) ہوچکی ہے ۔ انسان اس مخلوق کا جانشین ہے (دیکھئے عنوان خ ۔ ل ۔ ف) ۔ چونکہ اس زمانے میں زمین کی

*تاج ۔ **محیط ۔ ***روح المعانی ۔

سطح نسبتاً زیادہ گرم تھی اس لئے اُس مخلوق میں حرارت برداشت کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوگی ۔ ہوسکتا ہے کہ اس اعتبار سے بھی یہ کہا گیا ہو کہ اسکی تخلیق نار سے تھی ، جس طرح انسان کی تخلیق کے متعلق کہا کہ اس کی ابتدا مٹی سے کی گئی ہے ۔

(ابلیس اور جان وغیرہ کے مفہوم کے لئے متعلقہ عنوانات ب ۔ ل ۔ س اور ج ۔ ن ۔ ن دیکھئے) ۔ سورۃ نور میں ہے اللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ . . . . (۲۴/۳۵) ۔ اس سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اللہ نے اس مثال سے اپنی ذات کو سمجھایا ہے ۔ لیکن یہ صحیح نہیں ۔ ذاتِ خداوندی کے متعلق انسانی ذہن کچھ تصور نہیں کرسکتا ۔ یہاں خدا نے مَثَلُ نُوْرِہٖ کہا ہے ۔ یعنی اس کے نور کی مثال ایسی ہے (جیسی آگے بیان کی گئی ہے) ۔ نورِ خداوندی بڑا جامع لفظ ہے اور قرآن کریم میں مختلف مقامات پر اسکا استعمال آیا ہے ۔ اسکی جامعیت کے اعتبار سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ کائنات میں جہاں کہیں بھی ''روشنی'' ہے اس کا سرچشمہ خدا ہے ۔ عقل کی روشنی ۔ علم کی روشنی ۔ وحی کی روشنی وغیرہ ۔ یہ سب خدا کی عطا کردہ ہیں ۔ اس ''روشنی'' میں خدا کی کتاب (قرآن کریم) بھی شامل ہے ۔ اس مثال میں قرآن ہی کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے ۔ خود مثال کے مختلف حصے اور تشبیہات اس کی تائید کرتی ہیں ۔

ن و ش

اَلنَّوْشُ ۔ کسی چیز کو لے لینا ۔ تَنَاوَشَہٗ ۔ اس نے اسے لے لیا ۔ اَلنَّوْشُ ۔ طلب کرنا ۔ اَلنَّوُوْشُ ۔ قوی آدمی جسکی گرفت سخت ہو ۔ نَاشَ بِہٖ یَنُوْشُ ۔ وہ اس سے چمٹ گیا اور لٹک گیا *۔ نَاشَ فُلَانًا ۔ اس نے فلاں کو پکڑا تاکہ اس کی ڈاڑھی اور سر کو کھینچے **۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَ اَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ (۳۴/۵۲) ۔ اب وہ ایمان کو کیسے پا سکتے ہیں ۔ اب وہ ان کی دسترس سے بہت دور نکل گیا''۔

ن و ص

اَلنَّوْصُ ۔ پیچھے ہٹنا ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے آمد و رفت بتائے ہیں ۔ اَلنَّوْصُ ۔ بھاگنا ۔ نَاصَ یَنُوْصُ نَوْصًا ۔ متحرک ہونا اور کہیں چلے جانا ۔ بھاگ کر چھٹکارا حاصل کرلینا ۔ نَاصَ عَنْہُ ۔ وہ اسکے پاس سے پلٹ گیا ، کترا کر نکلا اور بھاگ گیا ۔ ایک طرف ہو گیا ۔ نَاصَ اِلٰی کَذَا ۔ اسنے اسکی طرف پناہ لی***۔

*تاج ۔ **محیط ۔ ***تاج و راغب ۔

قرآن کریم میں ہے وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ۔ (۳۸/۳) پیچھے ہٹنے اور بھاگ کر کہیں پناہ لینے کا وقت نہیں رہا تھا** ۔ مَنَاصٌ کے معنیٰ بھاگنے کی جگہ بھی ہیں اور خود بھاگنا بھی ۔

ن و ق

اَلنَّاقَةُ ۔ اونٹنی ، جب وہ جوان ہو جائے (تقریباً چوتھے برس میں) ۔ اَلتَّنْيِقَةُ ۔ کھانے اور لباس کو بہت زیادہ عمدہ ، خوشگوار اور پسندیدہ بنانا ۔ نفاست ۔ پختگی ۔ عمدگی ۔ مہارت ۔ باریک بینی ۔ تَنَوَّقَ فِی الْاَمْرِ کے معنے ہیں کسی کام میں انتہا کرنا ، نہایت باریک بینی سے کام لینا ۔ تاج نے ابن فارس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ نَاقَةٌ ہی سے بنایا گیا ہے کیونکہ عربوں کے ہاں اونٹنی نہایت پسندیدہ اور عمدہ شے مانی جاتی تھی ۔ جسطرح جَمَلٌ (اونٹ) سے جَمَالٌ (حسن اور خوبصورتی) اور اَجْمَلُ سب سے زیادہ حسین اور خوبصورت ہے ، اسی طرح نَاقَةٌ سے تَنَوَّقَ اور الْمُتَوَّقُ ہے جس کے معنے ہیں صاف کیا ہوا کھجور کا خوشہ* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی بلند اور اونچا ہونے کے ہیں ۔ ممکن ہے اونٹنی کو اَلنَّاقَةُ اسکی بلندی کی وجہ سے کہتے ہوں ۔

قوم ثمود کے ہاں پانی کی قلت تھی (دیکھئے ث ۔ م ۔ د) ۔ جتنا کچھ پانی جمع ہوتا ، قوم کے بڑے بڑے لوگ اسے اپنے مویشیوں کے لئے مخصوص کر لیتے اور غریبوں کے جانور پیاسے مرجاتے ۔ حضرت صالح ؑ نے ان لوگوں سے کہا کہ جو چارہ اور پانی خدا نے تمام مخلوق کے فائدے کے لئے بلا قیمت دیا ہے ، اسے کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص کر لینا ظلم ہے ۔ تم اس روش سے باز آجاؤ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے ۔ چنانچہ بہت سی حیل حجت کے بعد وہ لوگ اس پر آمادہ ہو گئے کہ پانی میں سب کی باری مقرر کر دی جائے ۔ اس کے لئے حضرت صالح ؑ نے کہا کہ بہت اچھا ۔ یہ ایک اونٹنی ہے ۔ میں اسے چھوڑتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ تم اسے اسکی باری پر پانی پینے دیتے ہو یا نہیں ۔ اگر تم نے اسے پانی پینے دیا تو سمجھ لیا جائیگا کہ تم اپنے عہد پر قائم ہو اور اگر تم نے اسے روک دیا تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے یہ عہد محض زبان سے کر لیا ہے ، دل سے اسے نہیں مانتے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ، اور انہوں نے اس اونٹنی کو بے دردی سے قتل کر دیا ۔

اسے قرآن کریم میں نَاقَةُ اللّٰهِ (۷/۷۳) کہا گیا ہے ۔ خدا کی مخلوق میں سے وہ اونٹنی جو اس بات کی علامت تھی (لَكُمْ اٰيَةً) کہ وہ لوگ اپنے اس

---

*تاج و محیط ۔　**ابن فارس ۔

معاهده پر جو انہوں نے خدا سے کیا تھا کار بند رہتے ہیں یا نہیں ۔ جسطرح کعبہ کو خدا نے بَیْتِیْ (میرا گھر) کہا ہے اسی طرح اس اونٹنی کو نَاقَۃُ اللہ کہکر پکارا گیا ہے ۔

ن و ل (ن ی ل)

اَلنَّیْلُ ۔ اَلنَّائِلُ ۔ عطیہ جو کچھ انسان کو مل جائے یا پہنچ جائے ۔ نَالَ اس نے پا لیا ۔ نَالَ مِنْ عَدُوِّہٖ مَطْلُوْبَہٗ ۔ وہ اپنے دشمن کو جو گزند پہنچانا چاہتا تھا وہ اسے پہنچا دیا *۔ اور یوں اپنا مقصد پورا کر لیا ۔ اَنَلْتُہٗ اِیْتَاہُ وَنِلْتُہٗ ۔ میں نے اسے کوئی چیز حاصل کرائی، دیدی یا پہنچا دی ۔ نَالَ الرَّحِیْلُ ۔ روانگی قریب آگئی* ۔ تَنْوِیْلٌ ۔ عطا کرنا ۔ اَلنَّوَالُ ۔ عطاء** ۔

اَلنِّیْلُ ۔ مصر کا مشہور دریا ۔ نیز عِظْلِیْم کا درخت جس سے نیل (رنگ) بنایا جاتا ہے* ۔ یہ ھندی لفظ نیل سے معرب ہے ۔

سورہ بقرہ میں ہے ۔ لَا یَنَالُ عَہْدِی الظّٰلِمِیْنَ ($\frac{2}{124}$) ۔ میرا عہد ظالمین کو نہیں پہنچے گا ۔ یعنی جو لوگ میرے قوانین سے سرکشی اختیار کر جائینگے اور انسانی حقوق میں کمی کرینگے انکے لئے میرا یہ وعدہ نہیں کہ انہیں نوع انسانی کی امامت ملیگی ۔ سورہ توبہ میں ہے ۔ لَا یَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّیْلًا ($\frac{9}{120}$) ۔ نہ وہ دشمن کو کوئی نقصان پہنچاتے ہیں ۔ سورہ اعراف میں ہے ۔ لَا یَنَالُہُمُ اللہُ بِرَحْمَۃٍ ($\frac{7}{49}$) ۔ "اللہ ان پر رحمت نہیں کریگا" ۔

ن و م

اَلنَّوْمُ نیند ($\frac{2}{255}$) نیز ($\frac{45}{9}$) ۔ مَنَامٌ ۔ سونے کی جگہ یا وقت ۔ یا نیند اور خواب ($\frac{37}{102}$; $\frac{39}{42}$) ۔ نیز اس کے معنی آنکھ کے بھی آتے ہیں اس لئے کہ نیند کی جگہ آنکھ بھی ہے*** ۔ چنانچہ سورہ انفال میں جو ہے اِذْ یُرِیْکَہُمُ اللہُ فِیْ مَنَامِکَ ($\frac{8}{43}$) ۔ تو اس کے معنی بعض مفسرین نے آنکھ ھی کے لئے ہیں*** ۔ یعنی جب اللہ انہیں تیری نگاھوں میں (کم) دکھاتا تھا ۔

نَامَتِ الرِّیْحُ ۔ ہوا سو گئی یعنی ساکن ہو گئی ۔ نَامَتِ النَّارُ ۔ آگ کی تپش اور تندی ماند پڑ گئی ۔ نَامَ عَنْ حَاجَتِہٖ ۔ وہ اپنی ضرورت سے غافل ہو گیا ۔ اَلنُّوْمَۃُ ۔ جسے درخور اعتناء نہ سمجھا جائے ۔ اَلنَّوِیْمُ ۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **ابن فارس ۔ ***تاج ۔

جو شخص اپنی چیزوں کی طرف سے غفلت برتے - نیز گمنام* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی جمود اور حرکت کے ٹھہر جانے کے ہیں - اِسْتَنَامَ اِلٰی فُلَانٍ - فلاں کیطرف پہنچکر اس نے اطمینان حاصل کرلیا -

ن و ن

نُـوْنٌ - اسے عبرانی اور سریانی زبان میں بھی نُـوْنٌ ہی کہتے ہیں - اس کے معنی بڑی مچھلی کے آتے ہیں - اس حرف (ن) کی قدیم شکل بہت کچھ مچھلی سے مشابہت رکھتی تھی**- قرآن کریم میں حضرت یونس ؑ کو ذَا النُّوْنِ (۲۱/۸۷) بھی کہا گیا ہے - اور صَاحِبِ الْحُوْتِ بھی (۶۸/۴۹) - یعنی مچھلی والا - سورۃ الصّٰفّٰت میں انہیں یونس کے نام سے پکارا گیا ہے (۳۷/۱۳۹) -

تعریفات میں ہے کہ نُـوْنٌ علم اجمالی کـو کہتے ہیں جس سے مراد دوات ہے ، کیونکہ وہ حروف جو علم کی صورت اختیار کرتے ہیں اجمالی طور پر اس کی روشنائی میں موجود ہوتے ہیں - یعنی معنی اس کے دوات ہیں اور مراد اس سے اجمالی علم ہے**- سورۃ القلم میں ہے نٓ وَ الْقَلَمِ وَ مَا یَسْطُرُوْنَ (۶۸/۱) - "دوات اور قلم اور جو کچھ لوگ ان سے لکھتے ہیں (یعنی علم) اس پر شاہد ہے کہ . . . . " (ہوسکتا ہے کہ یہاں ن مقطعات میں سے ہو) - تاج اور اقرب الموارد میں ہے کہ نُـوْنٌ کے معنی تلوار کے پھل (یا دھار) کے بھی ہیں - اس اعتبار سے دیکھئے تو ن - وَ الْقَلَمِ وَ مَا یَسْطُرُوْنَ کے معنی یہ ہونگے کہ سیف (تلوار) اور قلم یعنی جو کچھ اس سے لکھتے ہیں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ . . . (دین خداوندی کی بالآخر کامیابی ہوگی) - تلوار سے مراد قوتِ نافذہ اور قلم سے مراد قانونِ خداوندی ہے - "قرآن کریم اور تلوار" وہ محکم شہادات ہیں جن کی موجودگی میں اسلام کا کوئی دعویٰ بلا دلیل نہیں رہ سکتا - یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اقبال نے یہ کہکر توجہ دلائی ہے کہ

در کمر تیغِ دو رو ، قرآن بدست   تن بدن ہوش و حواس اللہ مست
ایں دو قوت حافظ یک دیگراند   کائنات زندگی را محور اند

سورۃ حدید میں اسی ضمن میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے رسولوں کو بھیجا - ان کے ساتھ ضابطۂ قوانین نازل کیا - اور فولاد (شمشیر) بھی - فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷/۲۵) - جس میں سخت قوت ہے اور نوع انسانی کے لئے فوائد کثیر - واضح رہے کہ قرآن کریم اور شمشیر کے ساتھ ساتھ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کریم کو شمشیر کے زور سے منوایا جائے گا - اس

*محیط - **محیط و لسان العرب -

کے معنی یہ ھیں کہ ایک معاشرہ قائم کیا جائے گا جس میں قرآنی اصول و قوانین نافذ کئے جائیں گے ۔ اسی قوت نافذہ کو شمشیر سے تعبیر کیا گیا ھے ۔ وہ قوت جو دنیا میں عدل قائم رکھنے کا موجب بنتی ھے اور جس سے مجرمین کو تباہ کاریوں سے روکا جاتا ھے ۔

ن و ی

نَوَی الشَّیْءَ یَنْوِیْهِ ۔ کسی چیز کا قصد اور دل میں عزم کرنا۔ پختہ ارادہ کرنا ، اوراس کی طرف دل سے متوجہ ھونا ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی دو ھیں ۔ (۱) کسی چیز کا قصد اور (۲) کسی چیز کی گٹھلی ۔ اَلنِّیَّۃُ ۔ وہ سمت جس کی طرف سفر کیا جائے* ۔ دل سے کسی کام کا عزم کرنا ۔ بعض کا خیال ھے کہ اس کے معنی ھیں دل کا جلبِ منفعت اور دفعِ ضرر کے لئے کسی مناسب کام کے لئے آمادہ ھونا** ۔ نَوَاکَ اللہُ ۔ خدا سفرمیں تیرے ساتھ رھے اور تیری حفاظت کرے ۔ اَلنَّوِیُّ ۔ رفیق یا رفیقِ سفر* ۔ ھم نیت ۔ اَلنَّوَاۃُ ۔ گٹھلی ۔ اس کی جمع اَلنَّوَی ھے ۔ (۶/۹۶)۔ نَوَاۃُ التَّمْرِ ۔ کھجور کی گٹھلی ۔

ن ھ ج

اَلنَّھْجُ ۔ اَلْمِنْھَاجُ ۔ واضح راستہ ۔ اَنْھَجَ الطَّرِیْقُ وَالْاَمْرُ ۔ راستہ اور معاملہ واضح ھوگیا ۔ نَھَجَ الْاَمْرُ کے بھی یہی معنی ھیں ۔ فُلَانٌ اِسْتَنْھَجَ طَرِیْقَ فُلَانٍ ۔ فلاں آدمی فلاں کے طریق پر چلا*** ۔

قرآن کریم میں ھے لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّ مِنْھَاجًا (۵/۴۸) ۔ ''ھم نے تم میں سے ھر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک منہاج مقرر کیا،، ۔ (اس کے تفصیلی مفہوم کے لئے عنوان ش ۔ ر ۔ ع دیکھئے) ۔

ن ھ ر

نَھْرٌ ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے کھلنے یا کھولنے کے ھیں ۔ اَنْھَرْتُ الدَّمَ ۔ میں نے خون کو کھول دیا اور بہا دیا ۔ نَھْرٌ کے معنے ھیں پانی بہنے کی جگہ ۔ بعض نے کہا ھے کہ نَھْرٌ دراصل پانی کو کہتے ھیں اور اس کے بہنے کی جگہ کو مجازاً نَھْرٌ کہہ دیتے ھیں ۔ اس کی جمع اَنْھَارٌ ھے ۔ اَلنَّھَرُ ۔ بمعنی نَھْرٌ ھے ۔ نیز اس کے معنی وسعت و فراخی اور روشنی بھی ھیں ۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں ھے

*تاج ۔ **محیط ۔ ***تاج و محیط و راغب ۔

إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ (۵۴/۵۴) ۔ تو اس میں نَهَر کے معنی روشنی اور فراخی کے ہیں ۔ اَلنَّهِيْرُ کے معنی ہیں کثیر اور وافر* ۔ روشنی کی جہت سے اَلنَّهَارُ دن کے لئے بولا جاتا ہے ۔ یعنی لَيْل کی ضد ۔ اَلنُّهْرَةُ کے معنے کسی چیز کو اچک کر لے جانا بھی ہیں ۔ اسی لئے نَهَرَ الرَّجُلُ نَهْرًا کے معنی ہیں اس آدمی نے دن میں حملہ کیا* ۔ غالباً اسی جہت سے نَهَرَ الرَّجُلَ کے معنی ہیں اس نے آدمی کو جھڑک دیا ۔ اَلْمَنْهَرَةُ ۔ مکانات کے سامنے کی کھلی جگہ جہاں کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا ہے* ۔ یہاں سے وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (۹۳/۱۰) کے معنی واضح ہوجاتے ہیں ۔ یعنی صاحبِ احتیاج کو ذلیل و حقیر نہ سمجھ ۔ اور (۱۷/۲۳) میں والدین کے متعلق جو کہا ہے فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (۱۷/۲۳) تو وہاں بھی لَا تَنْهَرْ کے معنے واضح ہو جاتے ہیں ۔ یعنی انہیں جھڑکو نہیں ۔ ان کی تحقیر مت کرو ۔ اور ان سے شرافت سے بات کرو ۔

قرآن کریم میں جنت کے متعلق بار بار آتا ہے تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۲/۲۵) ۔ ان باغات کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی ۔ پہلی چیز تو یہ سمجھ لیجئے کہ ہمارے ہاں نہر کا ایک خاص مفہوم ہے لیکن عربی زبان میں نَهْر اس پانی کو کہتے ہیں جو دو ساحلوں کے درمیان بہ رہا ہو ۔ اس میں دریا ، ندی ، نہر سب ہی آجاتے ہیں ، جن سے کھیت یا باغات سیراب ہوتے ہیں** ۔

قرآن کریم کے ان مقامات میں جہاں جنت سے مراد دنیوی زندگی میں جنتی معاشرہ ہے ، اس کی انہار سے مراد یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے گا ۔ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا (۱۳/۳۵) ۔ اس کے پھل اور آسائشیں سدا بہار ہونگی ۔ تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ (۱۴/۲۵) ۔ وہ اپنے پھل ہمیشہ دیتا رہتا ہے ۔

اور جہاں جنت سے مراد اُخروی جنت ہے ، ۔ تو اس کی تمام تفاصیل تمثیلی ہیں ۔ (۱۳/۳۵ و ۴۷/۱۵) ۔ لہذا وہاں بھی اَنْهٰر سے مراد اس قسم کی نہریں نہیں جو ہمارے ذہن میں ہیں ۔

اصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے پانی کو زندگی کہا ہے (۲۱/۳۰) اور اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے ۔ اس لئے جس معاشرہ میں آبِ رواں کی فراوانی ہو اس میں زندگی کی فراوانی ہوگی ۔ "باغات میں نہریں رواں ہونے" سے مراد زندگی کی شادابیاں اور سرسبزیاں ہیں ۔

*تاج ۔ **لین ۔

ن ھ ی

نَهَاهُ يَنْهَاهُ نَهْيًا - اَمَرَ کی ضد ہے - روکنا - منع کرنا - باز رکھنا - اِنْتَهٰی - رک جانا - باز آجانا - اَلنُّهْيَةُ - کسی چیز کی انتہا اور آخری حد کو کہتے ہیں - اَلنِّهَايَةُ کے بھی یہی معنی ہیں* - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں - یعنی انتہا تک پہنچ جانا - انتہا تک پہنچکر ہر بات رک جاتی ہے - اس لئے اس کے معنی رک جانے کے آتے ہیں - اَلنُّهْيَةُ - عقل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ انسان کو بعض امور سے روکتی ہے - اسکی جمع النُّهٰی ہے* - (خود عَقْلٌ کے معنی بھی روکنے کے ہیں - دیکھئے عنوان ع - ق - ل) - رَجُلٌ مَنْهَاةٌ - وہ شخص جس کی رائے پر لوگ اعتماد کریں*۔

قرآن کریم میں ہے فَاِنِ انْتَهَوْا ($\frac{2}{193}$) - ,, اگر وہ لوگ لڑائی سے رک جائیں ,, - يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ بمقابلہ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ($\frac{3}{109}$) آیا ہے - یعنی معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا - یہ امت مسلمہ کا فریضہ ہے - (مَعْرُوْفٌ اور مُنْكَرٌ کے لئے دیکھئے عنوانات (ع - ر - ف) اور (ن - ک - ر)- اُولِی النُّهٰی ($\frac{20}{54}$) - صاحبان عقل و بصیرت - اِنْتَهٰی ($\frac{2}{275}$) رک جانا - اَلْمُنْتَهٰی - انتہائی کنارہ - آخری حد - ($\frac{53}{14}$) - (سِدْرَةٌ کے لئے عنوان س - د - ر دیکھئے)

---

*تاج -

و

وَ (حرف)

وَ ۔ (۱) ''اور'' (And) کے معنوں میں ۔ اَنْعَامُهُمْ وَ اَنْفُسُهُمْ (۳۲/۲۷) ۔ ان کے چوپائے اور وہ خود . . .

(۲) مَعَ (ساتھ) کے معنوں میں ۔ فَاَجْمِعُوْا اَمْرَكُمْ وَ شُرَكَاءَكُمْ (۱۰/۷۱) ۔ تم اپنے معاملہ کو اپنے شرکاء کے ساتھ مل کر بالکل پختہ کرو ۔

(۳) اَوْ (یا) کے معنوں میں ۔ بِحَبْلٍ مِنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِنَ النَّاسِ (۳/۱۱۱) ۔ اللہ کے عہد کے ذریعہ یا لوگوں کے عہد کے ذریعے ۔

(۴) تاکہ ۔ کے معنوں میں ۔ يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُكَذِّبَ (۶/۲۷) اے کاش ہم واپس بھیجدئے جاتے تاکہ ہم پھر تکذیب نہ کرتے ۔ (یہاں دراصل كَیْ یا لامِ تعلیل محذوف ہے)۔

(۵) یعنی ۔ کے معنوں میں ۔ اسے واو تفسیری کہتے ہیں اور اس کا استعمال خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یعنی یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ واو عاطفہ (اور کے معنوں میں) ہے یا واو تفسیری (یعنی کے معنوں میں) ۔ مثلاً قُلْنَا يَا نَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَ سَلَامًا عَلٰی اِبْرَاهِيْمَ (۲۱/۶۹) ۔ اس کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ ۔ اے آگ ! تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا ۔ اور یہ بھی کہ ۔ اے آگ ! تو ابراہیم پر ٹھنڈی یعنی سلامتی والی (نقصان نہ پہنچانے والی ٹھنڈک) ہو جا ۔ لیکن مفہوم کے اعتبار سے یہاں واو کا ترجمہ یعنی زیادہ موزوں ہے ۔

(۶) قسم کے لئے ۔ وَالْعَصْرِ (۱۰۳/۱) ۔ زمانہ کی قسم ۔ یا زمانہ اس پر شاہد ہے کہ ۔

(۷) کبھی یہ زائد بھی ہوتا ہے ۔ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۔ وَ نَادَيْنَاهُ (۳۷/۱۰۴) ۔ سو جب وہ دونوں جھک گئے اور اس نے (بیٹے کو) کنپٹی کے بل لٹا دیا تو ہم نے آواز دی ۔ (یہاں ۔ وَ ۔ کے بغیر بھی معنے وہی رہتے ہیں) ۔

(۸) "حالانکہ" ۔ "دراں حالیکہ" ۔ کے معنوں میں (اسے واو حالیہ کہتے ہیں) ۔ وَ أَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتَابَ (۲/۴۴) ۔ دراں حالیکہ تم کتاب کی پیروی (یا تلاوت) کرتے ہو ۔ نیز وَ أَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲/۴۲) ۔ دراں حالیکہ تم (خوب) جانتے ہو ۔

و أ د

اَلْوَأْدُ وَ الْوَئِيْدُ ۔ بلند اور سخت آواز ۔ اونٹ کی بڑبڑاہٹ ۔ وَأَدَ فُلَانًا ۔ اس نے فلاں آدمی کو گرانبار کر دیا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں ۔ چنانچہ بوجھ لیکر چلنے والے اونٹوں کی گراں رفتاری وَئِيْدٌ کہلاتی ہے ۔ یہیں سے وَأَدَ الْبِنْتَ يَئِدُ وَأْدًا کے معنی ہیں (لڑکی کو) زندہ زمین میں دفن کر دیا ۔ اور مٹی تلے دبا دیا ۔ مٹی کا بوجھ اس پر ڈال دیا ۔ عرب جاہلیت میں قبیلہ کندہ کے لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے* ۔ اس لڑکی کو جسے اس طرح زندہ دفن کر دیا جاتا اَلْمَوْءُوْدَةُ وَ الْوَئِيْدَةُ کہتے تھے* ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے ۔ وَ إِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (۸۱/۸-۹) ۔ جب زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تجھے کس جرم کی سزا میں یوں مار دیا گیا تھا ۔ رسول اللہؐ عورتوں سے عہد لیا کرتے تھے کہ وہ اولاد کو قتل نہیں کریں گی ۔ (۶۰/۱۲) ۔ اس سے (غالباً) بھی لڑکیاں مراد ہیں، بجز اس کے کہ یہاں قَتْلٌ سے مراد اولاد کو تعلیم و تربیت سے بے بہرہ رکھنا ہو ۔ (دیکھئے عنوان ق ۔ ت ۔ ل و ذ ۔ ب ۔ ح) ۔

اس سے مراد صرف عرب جاہلیت کے زمانہ کی لڑکیاں ہی نہیں بلکہ وہ تمام لڑکیاں ہیں جنہیں ہمارے معاشرہ میں "زندہ در گور" کر دیا جاتا ہے ۔ جو اپنی ساری عمر اس طرح بسر کردیتی ہیں کہ نہ مردہ ہیں نہ زندہ ۔ وہ گھروں میں نہیں ہوتیں ، قبروں میں دفن شدہ ہوتی ہیں جہاں سے ان کی نجات کی کوئی شکل نہیں ہوتی ۔ جب تک ہمارے معاشرہ میں نکاح و طلاق وغیرہ کے قوانین قرآن کریم کے مطابق نہیں ہوتے ، بیچاری بے زبان لڑکیوں کی حالت ایسی ہی رہے گی ۔ اور ان کی نشو و نما کی صلاحیتیں دفن ہی رہینگی ۔

*تاج و محیط ۔

و أ ل

وَئَلَ اِلَیْہِ ۔ یَئِلُ وَأْلاً ۔ کسی کی طرف پناہ لی ۔ اس کی طرف تیزی سے گیا ، اس کی طرف پلٹا ۔ وَأَلَ مِنْہُ ۔ اس سے نجات چاھنا ۔ اَلْوَأْلُ وَ الْمَوْئِلُ وَ الْمَوْأَلَۃُ ۔ نجات اور پناہ کی جگہ ۔ جائے پناہ ۔ اَلْـۃُ الرَّجُلِ ۔ آدمی کے گھر والے جن کی طرف وہ پناہ لیتا ہے* ۔ ابن فارس نے اس کے معنی مجتمع ہونے اور پناہ لینے کے لکھے ہیں ۔

سورۃ کہف میں مَوْئِلاً (۱۸/۵۸) پناہ اور بچاؤ کی جگہ کے معنوں میں آیا ہے ۔

و ب ر

اَلْوَبَرُ (جمع اَوْبَارٌ) ۔ اونٹ ، خرگوش اور لومڑی کے بال ۔ اَھْلُ الْوَبَرِ ۔ بادیہ نشین** ۔ قرآن کریم میں اَوْبَارٌ ۔ (۱۶/۸۰) آیا ہے ۔ (نیز دیکھئے عنوان ص ۔ و ۔ ف) ۔

و ب ق

وَبَقَ ۔ یَبِقُ ۔ وَبَقًا و وُبُوْقًا وَ مَوْبِقًا ۔ ہلاک ہونا ۔ اَلْمَوْبِقُ ۔ ہلاکت گاہ ۔ مَوْبِقٌ روک اور آڑ کو بھی کہتے ہیں ، اور قید خانہ کو بھی ۔ اَوْبَقَہٗ اس نے اسے روک دیا ۔ قید کر دیا ۔ نیز ہلاک کردیا*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْمَوْبِقُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہو جائے ۔ اور وَبَقَ کے معنی ہیں ہلاک ہو جانا ۔ سورۃ کہف میں ہے ۔ وَ جَعَلْنَا بَیْنَہُمْ مَوْبِقًا (۱۸/۵۲) ۔ اس کے دونوں معنی ہوسکتے ہیں ۔ یعنی ان کے درمیان آڑ یا روک بنا دی یا ان کے باہمی تعلقات کو ان کے لئے وجہ ہلاکت بنا دیا ۔ سورۃ شوریٰ میں ہے ۔ اَوْ یُوْبِقْہُنَّ (۴۲/۳۴) ۔ یا انہیں تباہ و برباد کردے ۔ چنانچہ اَلْمُوْبِقَاتُ ہلاک کرنے والے گناہوں کو کہتے ہیں*** ۔

و ب ل

اَلْوَبْلُ ۔ اَلْوَابِلُ ۔ موسلا دھار بارش** ۔ (۲/۲۶۴) ۔ اَلْوَبِیْلُ ۔ شدید** ۔ فَاَخَذْنَاہُ اَخْذًا وَّبِیْلاً (۷۳/۱۶) ۔ ضَرْبٌ وَبِیْلٌ ۔ سخت مار ۔ وَبِیْلٌ دراصل دھوبی کی اس موگری کو کہتے ہیں جس سے وہ کپڑوں کو کوٹتا ہے** ۔ اسی

---

*تاج و محیط و اقرب الموارد ۔ **تاج ۔ ***تاج و محیط و راغب ۔

سے اَلْوَبَالُ ۔ شدت ، سختی ، ناپسندیدہ ، فساد ، نیز بمعنی مصیبت اور ناموافق وناسازگار آتا ہے*۔ وَبَالَ اَمْرِہٖ (۵/۹۵) ۔ اپنے کام کا برا نتیجہ ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں شدت (سختی) پائی جاتی ہے ۔ نیز اکٹھا ہونا ۔

و ت د

اَلْوَتَدُ ۔ کھونٹا اسکی جمع اَوْتَادٌ ہے ۔ وَتَدَ الْوَتِدَ یَتِدُہٗ ۔ وَتْدًا ۔ اس نے زمین یا دیوار میں میخ یا کھونٹی گاڑ دی ۔ اَلْمِیْتَدُ ۔ وہ ہتھوڑی جس سے میخ یا کھونٹی ٹھونکی جائے ۔ اَلْوَاتِدُ ۔ ثابت (محکم گڑی ہوئی) چیز ۔ وَتَدَ فُلَانٌ رِجْلَہٗ فِی الْاَرْضِ ۔ فلاں نے زمین میں اپنا قدم جما لیا ۔ اسی سے اَوْتَادُ الْاَرْضِ پہاڑوں کو کہتے ہیں اور اَوْتَادٌ مِنَ الْبِلَادِ شہروں کے رؤساء اور امراء کو**۔

قرآن کریم نے فرعون کو ذُوالْاَوْتَادِ (۳۸/۱۲) کہا ہے ۔ اس کے معنی ہیں بڑی محکم قوتوں کا مالک ۔ جسکے کھونٹے دور دور تک گڑے ہوئے تھے ۔ اور پہاڑوں کو بھی اَوْتَادًا (۷۸/۷) کہا ہے کیونکہ وہ بھی کھونٹوں کیطرح زمین میں گڑے ہوئے ہیں ۔

(اہل تصوف کے ہاں جو ابدال اور اوتاد کی اصطلاحات ہیں وہ قرآنی نہیں) ۔

و ت ر

اَلْوَتْرُ ۔ اَلْوِتْرُ ۔ فرد ، یعنی اکیلی چیز ۔ (شَفْعٌ کے خلاف)**۔ قرآن کریم میں وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (۸۹/۳) آیا ہے ۔ عددِ طاق (Odd) ۔ برخلاف عددِ جفت ۔ وَتَرَہٗ مَالَہٗ وَحَقَّہٗ ۔ اس نے اس کا مال اور حق کم کر دیا ۔ قرآن کریم میں ہے وَلَنْ یَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ (۴۷/۳۵)۔ وہ تمہارے اعمال (کے ثمرات) کو کم نہیں کریگا ۔ وَتَرَ کے معنی بدلہ لینا اور اس میں زیادتی کرنا بھی ہیں ۔ نیز جوڑے کو الگ الگ کر دینا** ۔ اَلْوِتْرُ ۔ قتل کے سبب سے عداوت اور دشمنی***۔

تَتْرَیٰ (اصل میں وَتْرَیٰ تھا ۔ واو ، تاء سے بدل گئی) چیزوں کا اسطرح پے درپے آنا کہ ان کے درمیان کچھ وقفہ ہو ۔ اگر وہ مسلسل طور پر آتی رہیں تو انہیں مُتَوَاتِرٌ نہیں کہینگے بلکہ مُتَتَابِعٌ یا مُتَدَارِکٌ یا مُتَوَاصِلٌ کہینگے ۔ جَاءَتِ الْخَیْلُ تَتْرَیٰ کے معنی ہوتے ہیں

*تاج ۔ **تاج و راغب ۔ ***محیط ۔

گھوڑے یکے بعد دیگرے کچھ کچھ وقفہ کے بعد آئے ۔ مُوَاتَرَةُ الصَّوْمِ ۔ ایک دن روزہ رکھنا اور پھر ایک یا دو دن کا ناغہ کر دینا ۔ مُوَاتَرَةٌ میں وقفہ لازمی ہے ۔ اگر وقفہ نہ ہو تو اسے مُدَارَکَۃٌ ومُوَاصَلَۃٌ کہینگے***۔ قرآن کریم میں ہے ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرًا (۲۳/۴۴) ۔ پھر ہم نے اپنے رسولوں کو وقفوں کے ساتھ متواتر بھیجا ۔ اَلْوَتِيرَةُ ۔ کسی کام پر مداومت کرنا***۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے جو مختلف الفاظ آتے ہیں ان میں عدم مشابہت کی بنا پر قیاس کام نہیں کرتا ۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ الگ الگ معنی رکھتے ہیں ۔

و ت ن

اَلْوَاتِنُ ۔ اپنی جگہ مقیم ، ثابت اور ہمیشہ رہنے والی چیز ۔ اَلْمَاءُ الْوَاتِنُ ۔ ہمیشہ بہنے والا پانی جو ختم نہ ہو ۔ اَلْوَتِينُ ۔ رگ جان ، جس کے کٹ جانے سے انسان مر جاتا ہے* ۔ قرآن کریم میں ہے ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ (۶۹/۴۶) ۔ پھر ہم اسکی رگِ جان کاٹ دیتے ۔

و ث ق

وِثَاقٌ ۔ یا وَثَاقٌ ۔ اس رسی ، بیڑی یا بندھن وغیرہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو کس کر باندھا جائے ۔ بعض نے کہا ہے کہ وَثَاقٌ باندھنے کو اور وِثَاقٌ رسّی کو کہتے ہیں ۔ اَوْثَقَهُ ۔ اسے رسّی سے کس کر باندھ دیا* ۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ (۸۹/۲۶ نیز ۴۷/۴) ۔ وَثُقَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں وہ چیز محکم اور مضبوط ہو گئی* ۔ قرآن کریم میں الْعُرْوَةُ الْوُثْقَى کی تفسیر لَا انْفِصَامَ لَهَا نے کردی (۲/۲۵۶) ۔ یعنی جو ٹوٹ نہ سکے ۔ مِيثَاقٌ اور مَوْثِقٌ کے معنی ہیں پکا وعدہ ۔ مستحکم عہد ۔ وَثِقَ بِهٖ کے معنی ہیں کسی پر اعتماد کرنا ۔ اسے امانت دار سمجھنا* ۔ اِسْتَوْثَقَ مِنْهُ ۔ اس سے قابل اعتماد عہد حاصل کرلیا* ۔ كَلَأٌ مُوثِقٌ ۔ اتنا وافر چارہ جس پر اعتماد کرلیا جائے کہ یہ سال بھر کے لئے کافی ہو جائیگا ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْمِيثَاقُ اس عہد و پیمان کو کہتے ہیں جو قسموں کے ساتھ موکد ہو** ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔ ***تاج و راغب ۔

و ث ن

وَثَنَ بِالْمَكَانِ ۔ وہ کسی جگہ قیام پذیر ہو گیا ۔ اَلْوَاثِنُ ۔ مقیم اور جما ہوا ۔ جو حرکت نہ کرے۔ اسی سے وَثَنٌ بُتْ کو کہتے ہیں جو حرکت نہیں کر سکتا *۔ (جمع اسکی اَوْثَانٌ ہے ۲۹/۱۷) ۔ تاج نیز صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ وَثَنٌ چھوٹے صَنَمٌ (بت) کو کہتے ہیں ۔ اس بنیادی مفہوم کی رو سے ہر وہ تصور، یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وَثَنٌ ہے ۔ ذہنی جمود کہ جسے تقلید کہتے ہیں بدترین قسم کا وَثَنٌ ہے جسکی پرستش ہر مردہ قوم میں ہوتی رہتی ہے ۔

قرآن کریم تمام نوع انسان کے لئے مستقل ضابطہ حیات ہے جسے جب عملی شکل دی جائے تو ایک متحرک معاشرہ وجود میں آتا ہے ۔ '' متحرک '' کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتا ہوا زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتا رہتا اور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے ۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (Dynamic Movement) کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ اگر یہ کسی ایک مقام پر رک جائے ، اس میں جمود پیدا ہو جائے ، تو یہ '' وثنیت '' ہوگی ۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ بدقسمتی سے ہم پتھر کے بتوں کو تو دیکھتے اور انہیں معیوب سمجھتے ہیں لیکن اپنے قلب و دماغ میں رکھے ہوئے بتوں پر کبھی نگاہ نہیں ڈالتے !

و ج ب

وَجَبَ الْبَعِيْرُ تَوْجِيْبًا ۔ اونٹ نے اپنے آپ کو زمین پر ڈال دیا اور جم کر بیٹھ گیا * ۔ اَلْمُوَجِّبُ ۔ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو فربہی کی وجہ سے اٹھ نہ سکے ۔ اس اعتبار سے وَجَبَ الْحَائِطُ کے معنی ہیں دیوار گر پڑی ۔ وَجَبَ الرَّجُلُ وُجُوْبًا ۔ آدمی مر گیا ۔ (یعنی ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا) ۔ اَلْوَجْبَةُ ۔ کسی چیز کا آواز کے ساتھ گرنا ۔ اَلْمَوْجِبُ موت کو کہتے ہیں * ۔ قرآن کریم میں ذبح کردہ اونٹوں کے متعلق ہے فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا (۲۲/۳۶) ۔ جب وہ اپنے پہلوؤں پر گر پڑیں، یعنی ٹھنڈے ہو جائیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ گر پڑنا اور واقع ہو جانا اس کے بنیادی معنوں میں سے ہے ۔ وَجَبَ الشَّيْءُ ۔ کسی چیز کا پختہ طور پر جمنا اور

*تاج و راغب ۔

لازم اور ضروری ہونا ۔ اَوْجَبَہٗ ۔ وَجَّبَہٗ ۔ اس نے اسے جمایا اور لازم کر دیا۔ اِسْتَوْجَبَہٗ ۔ وہ اسکا مستحق ہو گیا * ۔ نیز اس کے معنی ہیں ، اس نے اُسے واجب سمجھا * ۔ وَاجَبَ لِفُلَانٍ حَقَّہٗ ۔ اس نے اسکے حق کی رعایت کی ** ۔

و ج د

وَجَدَ وُجُوْدًا کے بنیادی معنی کسی چیز کو پا لینا ہیں ۔ کبھی کسی چیز کو جاننے اور اس کا علم حاصل کرلینے کے لئے بھی بولا جاتا ہے ۔ لیکن یہ فعل، مصدر و ابواب یا صلوں کے فرق کے ساتھ اورمعنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً مَوْجِدَۃً وَ وِجْدَانًا غصے کے لئے آتا ہے ۔ وَجَدَ عَلَیْہِ ۔ وہ اس پر ناراض ہوا ۔ نیز وَجَدَ یَجِدُ کے معنے مالدار اور فارغ البال ہونا بھی ہیں ۔ چنانچہ اَلْوُجْدُ ۔ اَلْوَجْدُ اور اَلْوِجْدُ ۔ مالداری ۔ فراخی ۔ اور وسعت کو کہتے ہیں ۔ وَجَدَ بِہٖ وَجْدًا ۔ اس سے محبت کی ۔ اِنَّہٗ لَیَجِدُ بِفُلَانَۃَ وَجْدًا شَدِیْدًا ۔ وہ فلاں عورت کی محبت کرتا اور اس کی جدائی میں غمکین رہتا ہے ۔ وَجَدَ بِہٖ ۔ اس نے اسے چاہا اور غمکین ہوا ۔ اَلْوَجِیْدُ ۔ ہموار زمین کو کہتے ہیں *** ۔ اَلْوَاجِدُ ۔ غنی ۔ تونگر ۔ دولتمند *** ۔ وُجْدٌ ۔ استطاعت ، مقدرت (۶۵/۶) ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَلَتَجِدَنَّھُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ (۲/۹۶) تو انہیں سب سے زیادہ حریص پائیگا ۔ یہ لفظ زیادہ تر انہیں معانی میں استعمال ہوا ہے ۔ وُجُوْدٌ یا مَوْجُوْدٌ وغیرہ الفاظ قرآن کریم میں نہیں آئے ۔ یہ متکلمین کی اصطلاحات ہیں ۔

و ج س

اَلْوَجْسُ ۔ خفی آواز یا دل کی گھبراہٹ کو کہتے ہیں ۔ اس سے اَلْوَاجِسُ دل میں گذرنے والی بات کو کہتے ہیں ۔ اَلْاِیْجَاسُ ۔ دل ہی دل میں کسی بات کو محسوس کرنا اور اسے پوشیدہ رکھنا ۔ یونہی ذرا سا احساس ہونا یا خیال گذرنا جس میں خوف کا بھی شائبہ ہو* ۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے وَاَوْجَسَ مِنْھُمْ خِیْفَۃً (۱۱/۷۰) ۔ اس نے ان کی طرف سے دل ہی دل میں ذرا خوف محسوس کیا۔

---

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔ ***تاج و محیط ۔

و ج ف

وَجَفَ الشَّیْءُ - چیز کا مضطرب ہونا - قَلْبٌ وَاجِفٌ - مضطرب (تیز دھڑکنے والا) دل*- قرآن کریم میں ہے - قُلُوْبٌ یَوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ (۷۹/۸) - اس دن دل مضطرب و پریشان ہونگے -

وَجَفَ الْفَرَسُ - گھوڑے کا تیز دوڑنا - اَوْجَفْتُهُ - میں نے اسے تیز دوڑایا* - سورۃ حشر میں ہے - فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْهِ مِنْ خَیْلٍ وَّلَا رِکَابٍ (۵۹/۶) - تم نے اس پر گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے - لشکر کشی نہیں کی -

و ج ل

اَلْوَجَلُ - گھبراہٹ اور خوف - وَجِلَ - یَوْجَلُ - گھبرانا - ڈرنا - ڈرنے اور گھبرانے والے کو وَجِلٌ کہتے ہیں ، اس کی جمع وَجِلُوْنَ ہے - (۱۵/۵۲) - اَلْوَجِیْلُ - اَلْمَوْجِلُ - گڑھا جس میں پانی اکٹھا ہو جائے - اَلْوَجْوَلُ - بوڑھے لوگ** - راغب نے لکھا ہے کہ اَلْوَجَلُ - دل ہی دل میں خوف کے احساس کرنے کو کہتے ہیں*** -

قرآن کریم میں مومنین کی صفت یہ لکھی ہے کہ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (۸/۲) - جب ان کے سامنے خدا کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل میں خوف کا احساس پیدا ہو جاتا ہے - جیسا کہ دوسرے مقامات میں بتایا گیا ہے ، خدا کے خوف سے مراد یہ ہے کہ اگر اس کے قوانین کے خلاف روش اختیار کی جائے تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے - اس تباہی اور بربادی کے احساس سے انسان کے دل میں خوف اور گھبراہٹ ہوتی ہے - اسی کو خدا کا خوف کہتے ہیں - یعنی قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے نتائج و عواقب کا احساس -

و ج ه

وِجَاهُ الشَّیْءِ - کسی چیز کے سامنے یا بالمقابل****- اَلْوَجْهُ - کسی چیز کا وہ حصہ جو سب سے پہلے سامنے آئے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کے سامنے آنے کے ہیں - اس جہت سے اَلْوَجْهُ انسان کے اس حصہ جسم کو کہتے ہیں جو سب سے پہلے سامنے آتا ہے - اور

*تاج و راغب - **تاج - ***راغب - ****محیط -

چونکہ انسان کا چہرہ نمایاں طور پر سامنے آتا ہے اسی لئے اسے وَجْہٌ کہتے ہیں *۔ لیکن اس کے بعد یہ لفظ خود نفس شے یا ذات کے لئے بھی بولا جانے لگا**۔ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ (۲/۱۱۲) میں وَجْہٌ کے معنی پورا اپنا آپ ہیں نہ کہ اپنا چہرہ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ (۱۷/۷) کے معنی بھی یہ ہیں کہ وہ تمہارا برا حال کردیں۔ یا یہ کہ وہ تمہارے سرداروں کا برا حال کردیں۔ وَجْہُ الْقَوْمِ۔ قوم کے معزز اور شریف فرد یا سردار کو کہتے ہیں۔

وَجْہُ النَّهَارِ۔ دن کا ابتدائی حصہ۔ اَلْوَجْہُ مِنَ الدَّهْرِ۔ زمانہ کا ابتدائی حصہ۔ یعنی زمانہ کا وہ حصہ جو سب سے پہلے سامنے آئے**۔

اَلْوَجْہُ۔ جاہ۔ مرتبہ اور عزت کو بھی کہتے ہیں۔ اَلْوَجِیْہُ۔ صاحب جاہ۔ صاحبِ وجاہت۔ اَلْوَجِیْهَةُ۔ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو دونوں طرف سے ایک جیسا ہو۔ حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے۔ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا (۳۳/۶۹)۔ اس کے معنے صاحبِ عزت کے ہیں۔

وَجْہٌ کے معنی ہوتے ہیں مقصد (Purpose)۔ مطلوب (Object)۔ راستہ، جو مقصد تک پہنچنے کے لئے اختیار کیا جائے (Course)۔ سمت (Direction) جس طرف کوئی جا رہا ہو۔ وہ منزل مقصود جس کی طرف کوئی جا رہا ہو۔ چنانچہ وَجْہُ الطَّرِيْقِ۔ اس منزل کو کہتے ہیں جس کی طرف راستہ لے جا رہا ہو***۔ اور وَجْہُ الْاَمْرِ کسی بات کے مقصد اور اس کے صحیح رخ کو کہتے ہیں۔ (جِهَةٌ اور وِجْهَةٌ کے بھی یہی معنے ہوتے ہیں۔ سمت۔ مقصد۔ وجہ۔ سبب)۔ مُتَوَجَّهٌ۔ وہ مقام جس کی طرف کوئی جا رہا ہو۔

قرآن کریم نے انسانی اعمال کی غایت یہ بتائی ہے۔ اِبْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ (۲/۲۷۲)۔ عام طور پر اسکا ترجمہ کیا جاتا ہے خدا کی رضا جوئی یا خوشنودی کے لئے۔ اس سے ذہن انسانوں کے خوشی یا ناراضگی کے جذبات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے جذبات سے بلند و بالا ہے۔ وَجْہُ اللّٰهِ کا صحیح مفہوم ہے وہ مقصود جو اللہ نے مقرر کردیا ہے۔ وہ منزل جسکی طرف قوانین خداوندی لے جاتے ہیں۔ یعنی انسان کا ہر عمل اس مقصد کے حصول کے لئے ہونا چاہئے جو اس کے لئے خدا نے مقرر کردیا ہے۔ اس کا ہر کام اس منزل تک پہنچنے کے لئے ہونا چاہئے جو قوانین خداوندی نے اس کے

*محیط۔ **تاج نیز لطائف اللغۃ۔ ***لین۔

لئے مقرر کر دی ہے ۔ سورۃ روم میں ہے وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ (۳۹/۳۰) ۔ جو کچھ تم نوعِ انسانی کی نشو و نما کے لئے کرتے ہو، اس مقصد کے پیش نظر کہ تم اُس منزل تک پہنچ جاؤ جو قوانین خداوندی نے مقرر کر رکھی ہے ۔ یعنی اس سے خود تمہاری اپنی ذات کی نشو و نما اور صلاحیتوں کی نمود ہو جائے ۔ اسی سے اس آیت کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں کہا ہے کہ کُلُّ شَیْءٍ هَالِکٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (۸۸/۲۸) ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے وہ تغیر پذیر ہوتا ہے (هَالِکٌ کے یہی معنی ہیں) لیکن استمرار اور دوام ان اعمال کو حاصل ہوتا ہے جو اس منزل کے حصول کے لئے سرزد ہوں جو خدا نے مقرر کر رکھی ہے ۔ یا یہ کہ دنیا کا ہر راستہ تغیر پذیر ہوتا ہے، بجز اس راہ کے جو خدا کی مقرر کردہ منزل کی طرف لے جاتی ہے* ۔ یہی مفہوم سورۃ رحمٰن کی ان آیات کا ہے ۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّکَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ (۲۶-۲۵/۵۵) ۔ دنیا کا ہر نظام اور ہر راستہ تغیر پذیر ہے بجز اس راستے کے جو خدائے ذوالجلال و الاکرام کی ربوبیت اعلیٰ کی طرف لے جائے* ۔ اسی کو اِبْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی (۹۲/۲۰) کہا گیا ہے ۔ دنیا میں ہر شخص کا اپنا اپنا مقصود و مطلوب اور ہر قوم کی اپنی اپنی منزل ہے ۔ وَلِکُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّیْهَا (۲/۱۴۸) ۔ جماعت مومنین وہ ہے کہ وہ زندگی کے جس گوشے اور کار و بارِ حیات کے جس شعبے میں بھی ہو اس کے سامنے ہمیشہ وہ منزل مقصود رہتی ہے جو قوانینِ خداوندی نے متعین کر دی ہے ۔ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (۲/۱۱۵) ۔

و ح د

اَلْوَاحِدُ ۔ گنتی میں پہلا عدد ۔ ایک ۔ وَاحِدٌ اور اَحَدٌ دونوں کے معنی "ایک" ہیں لیکن ان کے استعمال کا فرق اس مثال سے سمجھ میں آجائے گا کہ جب کہا جاتا ہے کہ مَا اٰتَانِیْ مِنْهُمْ اَحَدٌ تو اس کے معنی ہونگے میرے پاس ان میں سے کوئی بھی نہیں آیا ۔ لیکن جب کہا جائے گا کہ جَآءَنِیْ مِنْهُمْ وَاحِدٌ تو اس کے معنی ہونگے ان میں سے میرے پاس صرف ایک شخص آیا (دو نہیں آئے)** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ هُوَ وَاحِدُ قَبِیْلَتِهٖ، کے معنی ہیں وہ اپنے قبیلہ میں یکتا ہے ۔

---

*وَجْهُ رَبِّکَ یا وَجْهَهٗ کے معنی خود ذاتِ خداوندی بھی ہیں [دیکھئے عنوانات (ب ۔ ق ۔ ی) اور (ف ۔ ن ۔ ی)] لیکن راغب نے ان معانی کو ترجیح دی ہے جو اوپر لکھے گئے ہیں ۔ ** تاج ۔

قرآن کریم میں اللہ کے لئے وَاحِدٌ بھی آیا ہے (۱۲/۳۹) اور اَحَدٌ بھی (۱۱۲/۱)۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اَحَدٌ وہ ہے جسکی ذات میں کوئی اور شریک نہ ہو اور وَاحِدٌ اسے کہتے ہیں جسکی صفات میں کوئی اور شریک نہ ہو*۔ چنانچہ اَحَدٌ کے معنی ہونگے وہ ذات جو بے مثل و بے نظیر ہو۔ جو یگانہ ہو۔ ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیت (Basic characteristic) یہ ہے کہ وہ یگانہ (Unique) ہو۔ قُلْ ھُوَ اللہُ اَحَدٌ (۱۱۲/۱) میں ذات خداوندی کی اس بنیادی خصوصیت، یعنی اسکی یگانگت (Uniqueness) کا ذکر ہے۔

اَلْاُحْدَانُ ان تیروں کو کہتے ہیں جو یکتا اور بے نظیر ہوں**۔ اَلْمِیْحَادُ۔ اس ٹیلے کو کہتے ہیں جو دوسرے ٹیلوں سے بالکل الگ تھلگ کھڑا ہو*۔ اِتَّحَدَ الشَّیْئَانِ۔ دونوں چیزیں خلط ملط ہو کر ایک ہو گئیں۔ مجازاً یہ لفظ متفق ہونے کے لئے بھی بولا جاتا ہے*۔

قرآنی تعلیم کی بنیاد خدا کی وحدت پر ہے، یعنی اس حقیقت کے اعتراف اور یقین پر کہ کائنات میں صرف ایک قوت ہے جس کا اقتدار و اختیار ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کسی اور قوت کا آئین و قانون نہیں چلتا۔ لہذا انسانوں کی دنیا میں بھی اُسی کا قانون و آئین چلنا چاہئے۔ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖ اَحَدًا۔ (۱۸/۲۶) وہ اپنے حکم اور قانون میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ اسلئے مومن وہ ہے جو لَا یُشْرِکْ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖ اَحَدًا (۱۸/۱۱۰)۔ جو اپنے رب کی محکومیت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ جو خدا کے قوانین کے علاوہ (جنہیں اس نے قرآن کریم میں بیان کر دیا ہے) اور کسی کے قانون کے سامنے نہیں جھکتا۔

(نیز دیکھئے عنوان ا۔ ح۔ د)۔

و ح ش

اَلْوَحْشُ۔ جنگلی جانور جو انسانوں سے مانوس نہ ہو۔ جمع وُحُوْشٌ ہے۔ ایک کو وَحْشِیٌّ کہتے ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ (مَکَانٌ وَحْشٌ) بے آباد ویران جگہ سے منسوب چیز کو وَحْشِیٌّ کہتے ہیں۔ مَکَانٌ وَحْشٌ۔ خالی جگہ۔ بَلَدٌ وَحْشٌ۔ وہ علاقہ جو ویران ہو اور وہاں کوئی آبادی نہ ہو۔ بَاتَ وَحْشًا۔ اس نے بھوکے رات گذار دی۔ وہ خالی پیٹ رہا** اَلْوَحْشُ۔ اَلْاِنْسُ کی ضد ہے***۔ یعنی نامانوس، وحشی، جنگلی۔ ذَالِکَ مِنْ وَحْشِ النَّاسِ۔ یہ آدمی رذیل اور آدم بیزار لوگوں میں سے ہے*۔

---

*محیط۔ **تاج۔ ***راغب۔

قرآن کریم میں ہے وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (۸۱/۵) ۔ اس میں وُحُوْشٌ کے معنی نامانوس جانور بھی ہو سکتے ہیں اور وحشی اور جنگلی لوگ بھی ۔

و ح ی

اَلْوَحْیُ ۔ اشارہ، جس میں تیزی اور سرعت ہو ۔ وَحَیْتُ لَکَ بِخَبَرِ کَذَا ۔ میں نے تمہیں فلاں بات کا اشارا کر دیا ۔ یا چپکے سے مطلع کردیا*۔ چنانچہ سورہ مریم میں حضرت زکریا ؑ کے متعلق ہے کہ ان سے کہدیا گیا تھا کہ وہ لوگوں سے بات نہ کریں ۔ فَاَوْحٰی اِلَیْهِمْ (۱۹/۱۱) لہذا اس نے لوگوں کو اشارہ سے کہا ۔

(۲) راغب نے کہا ہے (اور صاحب تاج نے بھی اسکی تائید کی ہے) کہ اَلْوَحْیُ کے معنی تیز اشارہ کے ہیں ۔ اسی لئے شَیْءٌ وَحِیٌّ کے معنی ہیں وہ چیز جو جلدی سے آجائے، اور اَمْرٌ وَحِیٌّ ۔ تیز رفتار معاملہ ۔ اَلْوَحٰی جلدی ۔ تیزی کرنا ۔ اَوْحٰی الْعَمَلَ ۔ اس نے کام میں جلدی کی*۔

(۳) اَلْوَحْیُ کے معنی کتابت (یعنی لکھنا) بھی ہیں ۔ وَحَیْتُ الْکِتَابَ ۔ میں نے کتاب کو لکھا ۔ واحٍ ۔ لکھنے والا (کاتب) ۔ اَلْوَحْیُ لکھی ہوئی چیز یا نامہ ۔ چنانچہ جوھری نے کہا ہے کہ اَلْوَحْیُ کے معنی اَلْکِتَابُ ہیں ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے بھی ان معانی کی تائید کی ہے ۔ اور ابن فارس اور راغب نے بھی ۔ سورہ مائدہ میں جو ہے وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ (۵/۱۱۱) ۔ تو اس میں وحی کے معنی ”لکھے ہوئے حکم“ کے ہیں* ۔ یعنی اس وحی کے ذریعے جو (بقول راغب) حضرت عیسیٰ ؑ کی وساطت سے (انجیل میں لکھی ہوئی) بھیجی گئی تھی ۔

(۴) اَوْحٰی کے معنی حکم کرنا ۔ امر کرنا ۔ چنانچہ صاحب تاج نے کہا ہے کہ مندرجہ بالا آیت (۵/۱۱۱) میں حواریوں کی طرف وحی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے انہیں حکم دیا تھا* ۔ اور یہ وحی حضرت عیسیٰ ؑ کی وساطت سے حواریوں کو ملی تھی ** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ وہ چیز جسے تم کسی کی طرف پہنچا دو اور اسے اس کا علم ہو جائے، وَحْیٌ کہلاتی ہے خواہ اسے پہنچانے کی کیفیت کچھ ہی ہو ۔ مخفی طور پر یا ویسے ہی ۔

سورہ حٰمٓ سجدہ میں ہے وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (۴۱/۱۲) ”اس نے ہر سماء میں اس کا امر وحی کر دیا“ اس میں امر وحی (یا وحی

*تاج و راغب ۔ **راغب ۔

امر) کے معنی مامور کرنے کے ھیں - یعنی وہ قانون خداوندی جسکی رو سے خارجی کائنات کی ہر شے اپنے اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں سرگرداں ھے - اسی کو سورہ النور میں اسطرح بیان کیا گیا ھے - کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ (۲۴/۴۱) - کائنات کی ہر شے جانتی ھے کہ اس کے فرائض کیا ھیں اور وہ مقصد کیا ھے جس کے حصول کے لئے انہیں سرگرم عمل رھنا ھے - یہی وہ وحی ھے جو ان میں جاری و ساری ھے - یعنی امر خداوندی - خدا کا قانون - اس کے متعلق سورہ زلزال میں ھے - بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (۹۹/۵) - یعنی اس مقصد کے لئے خدا نے زمین کی طرف وحی کی ھے - زمین کو اسکا حکم دے رکھا ھے - زمین کے متعلق خدا کا قانون یہ ھے - اسی طرح سورہ النحل میں ھے وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ (۱۶/۶۸) - شہد کی مکھی کی طرف خدا نے وحی کر رکھی ھے - یعنی اس کے لئے خدا کا قانون یہ ھے کہ وہ یہ کچھ کرے -

کائنات میں ہر شے خدا کے امر (حکم) کے مطابق سرگرم عمل ھے - یہ خدا کی وہ وحی ھے جو ہر شے میں ازخود ودیعت کر دی گئی ھے - اسی کو قانون فطرت کہتے ھیں - یا، جانداروں کے لئے جبلت ((Instinct) - یہ قانون ان چیزوں کا خود پیدا کردہ نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے عائد کردہ ہوتا ھے -

انسان بھی کائنات کا ایک حصہ ھے اسلئے اسکے لئے بھی ضروری ھے کہ یہ ایک ایسے قانون کے مطابق زندگی بسر کرے جو اسکا خود پیدا کردہ نہ ہو بلکہ اسے خارج سے ملے - جہاں تک اس کی طبیعی زندگی کا تعلق ھے اس پر وھی قانون فطرت عائد ہوتا ھے جو دوسرے حیوانات پر ہوتا ھے - کھانا، پینا - سونا، جاگنا - افزائش نسل - بیماری، موت - سب اسی قانون کے مطابق واقع ہوتی ھے - یہ قانون انسان کا اپنا وضع کردہ نہیں -

لیکن انسان کی زندگی طبیعی زندگی (Physical life) ھی نہیں بلکہ اسکی معاشرتی اور تمدنی زندگی بھی ھے - نیز اس کی ذات (Personality) بھی ھے - اس کے لئے بھی ایسے قانون کی ضرورت ھے، اور وہ قانون ایسا ہونا چاھئے جو اس کا خود ساختہ نہ ہو بلکہ قانون فطرت کی طرح اسے خارج سے ملا ہو - اس قانون کا نام بھی وَحْیٌ ھے - لیکن فرق یہ ھے کہ :-

(۱) یہ وحی ہر فرد کو الگ الگ نہیں ملتی - اس کے لئے خدا کی طرف سے قاعدہ یہ مقرر ہوا تھا کہ یہ وحی کسی ایک انسان کو دی جائے اور وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچائے - اس انسان کو نبی اور رسول کہتے ھیں - یہ وحی انہیں حضرات سے مخصوص ھے -

(۲) کائنات کی کسی چیز کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ چاہے تو اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرے جو اس کے لئے وحی کیا گیا ہے اور چاہے تو اس کے خلاف کوئی اور طریقہ اختیار کرے۔ لیکن انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اس وحی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے اس کے خلاف کوئی دوسری روش اختیار کرے ۔ یہ اسلئے کہ انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا اختیار و ارادہ استعمال کرے ۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی کے لئے یہ جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ وہ ہر فرد کو براہ راست نہ ملے بلکہ رسول کی معرفت دوسرے انسانوں تک پہنچے تو اس میں بھی یہی مصلحت پوشیدہ ہے کہ انسان وحی کے راستے پر اپنے اختیار و ارادہ سے چلے ۔ اس لئے کہ اشیائے کائنات کو جو وحی براہ راست دے دی جاتی ہے ، تو انہیں اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اس سے سرکشی برتیں۔ انہیں بہر حال اس کے مطابق چلنا ہوتا ہے ۔

(۳) انسان کو یہ تو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو وحی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے اس کے خلاف روش اختیار کرے ، لیکن یہ اسکے بس میں نہیں کہ وہ وحی کے خلاف زندگی بسر کرکے وہ نتائج حاصل کر لے جو وحی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتے ہیں ۔ جس طرح اسے اس کا تو اختیار ہے کہ وہ سنکھیا کی ڈلی نگل جائے یا اسے اٹھا کر پھینک دے ، لیکن اس کا اختیار نہیں کہ وہ سنکھیا کھا کر اس کا اثر مصری کی ڈلی کا سا پیدا کرلے ۔

خدا کا قانون جو حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے انسانوں کو ملتا ہے ۔ اَلْوَحْیُ کہلاتا ہے ۔ اس کے خدا سے پانے میں نبی کے سوا کوئی دوسرا انسان شریک نہیں ہوتا ۔ یعنی انبیاء کے سوا کسی اور کو وحی نہیں مل سکتی، اور اس وحی کو انبیاء کرامؑ اپنے کسب و ہنر سے حاصل نہیں کرتے بلکہ یہ انہیں خارج سے اسی طرح ملتی ہے جس طرح اشیائے کائنات کو از خود خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے ۔ اسی کو کہتے ہیں کہ وحی منزل من اللہ ہوتی ہے ۔ خدا کی طرف سے نازل شدہ ۔ یعنی یہ شخص اپنی کوشش سے وحی کے مقام تک نہیں پہنچتا بلکہ وحی خود اتر کر اس تک پہنچتی ہے ۔ بالفاظ دیگر ، اس میں انسان کی داخلیت (Subjectivity) کو دخل نہیں ہوتا۔ اس میں یکسر خارجیت (Objectivity) ہوتی ہے ۔ منزل من اللہ کہنے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے ۔ انسان اپنی کوشش سے طبعی دنیا کے پوشیدہ حقائق کو منکشف (Discover) کرسکتا ہے لیکن جو حقائق اسے وحی کے ذریعے ملتے ہیں

وہ صاحب وحی پر (Revealed) ہوتے ہیں - یعنی وحی کے ذریعے حقیقت خود اپنے آپ کو صاحب وحی پر منکشف کرتی ہے - یہ اپنا ہاتھ بڑھا کر عروس حقیقت کے چہرے سے پردہ نہیں اٹھا سکتا - اسی کو نزولِ وحی کہتے ہیں - فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (۲/۹۷) - اسے جبریل نے تیرے قلب پر نازل کیا ہے - چونکہ وحی صرف حضرات انبیاء کرامؑ کو ملتی ہے اس لئے ہم بالکل نہیں سمجھ سکتے کہ اس کی کیفیت اور ماہیت کیسی ہوتی ہے ، وہ کس طرح ملتی ہے - ہمیں صرف اس بات پر ایمان رکھنا ہوتا ہے کہ وہ نبی کو منجانب اللہ ملتی ہے - (البتہ ہم علم و بصیرت - دلائل و براہین نیز وحی کے نتائج سے (Pragmatically) اس کی صداقت کو علیٰ وجہ البصیرت دیکھ سکتے ہیں) - انبیاء کو یہ وحی کبھی ''اشارۂ سریعہ'' کے ذریعے ملتی تھی، کبھی ''من وراء حجاب'' - لیکن ہمیں یہ وحی صرف رسول کی وساطت سے مل سکتی ہے - اسی حقیقت کو قرآن کریم نے سورۃ شوریٰ میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے - وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (۴۲/۵۱) - اس میں بتایا گیا ہے کہ بشر (انسانوں) کے ساتھ خدا کس طرح کلام کرتا ہے - بشر کی دو قسمیں ہیں - ایک انبیاء اور دوسرے غیر انبیاء - پہلے انبیاء کا ذکر ہے کہ ان تک خدا کا کلام یا تو وحی (فرشتے) کے ذریعے پہنچتا ہے (جیسے رسول اللہؐ کے متعلق فرمایا) اور یا براہ راست پردے کے پیچھے سے بات سنائی دیتی ہے (جیسے حضرت موسیٰؑ کی صورت میں ہوا) - باقی رہے غیر انبیاء تو ان تک صرف رسولوں کے ذریعے سے خدا کا کلام پہنچتا ہے - یہ کلام اب قرآن کریم کے اندر ہے، اسکے باہر اور کہیں نہیں - اس اعتبار سے یہی قرآن کریم ہم پر بھی نازل ہوا ہے (يُنَزِّلَ عَلَيْكُمْ ۲/۱۰۵ و ۳/۱۹۹)- یعنی رسول اللہؐ کی وساطت سے ہماری طرف نازل ہوا ہے - چونکہ رسول اللہؐ کے بعد نبوت کا سلسلہ بند ہوگیا اس لئے اب کسی انسان کو براہ راست وحی نہیں مل سکتی - اب انسان کے پاس علم کے دو ہی سرچشمے رہ گئے - ایک اس کی اپنی عقل اور دوسری خدا کی وحی جو قرآن کریم کے اندر ہے - اس کے علاوہ کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہ راست علم نہیں ملتا - الہام - کشف وغیرہ کے تصورات کی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی - (الہام کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ل - ہ - م) - قرآن کریم اور عقل کے ملنے سے انسانی علم مکمل ہو جاتا ہے - نیز یہ تصور بھی غیر قرآنی ہے کہ خود رسول اللہؐ کو جو وحی ملی تھی اس کی دو قسمیں تھیں - ایک وحی متلو (جو قرآن کریم کے اندر ہے) اور دوسری وحی غیر متلو جو قرآن کریم سے باہر (روایات کے اندر) ہے -

قرآن کریم میں وحی کی اس تقسیم کا کوئی ذکر نہیں ۔ اسکی رو سے صرف قرآن کریم وحی کے ذریعے ملا ہے (۶/۱۹) ۔ یہ تصور یہودیوں کے ہاں رائج تھا، اور وہیں سے مسلمانوں کے ہاں آگیا ۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں وحی متلو اور وحی غیر متلو کی اصطلاحات کا کہیں ذکر نہیں ملتا ۔

(اس مقام پر وحی کے متعلق انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔ اگر آپ مزید تفاصیل معلوم کرنا چاہیں تو میری کتاب ''ابلیس و آدم'' میں وحی کا باب ملاحظہ کیجئے جس میں اس موضوع پر بڑی وضاحت سے لکھا گیا ہے) ۔

اَوْحیٰ اِلَیْہِ ۔ کے معنے رسول بنا کر بھیجنے کے بھی ہیں ۔ چنانچہ اَوْحیٰ الرَّجُلَ کے معنی ہیں اس نے اپنے معتمد پیامی کو اپنے معتمد غلام کے پاس ایلچی بنا کر بھیجا* ۔ ابن الانباری نے کہا ہے کہ وحی کو وحی اسلئے کہتے ہیں کہ فرشتہ اسے پوشیدہ طور پر مخلوق میں سے اسی شخص کو پہنچاتا ہے جس کی طرف وہ بھیجی جاتی ہے ۔ اِیْحَاءٌ کے اصلی معنی ایک کا دوسرے کے ساتھ علیحدگی میں خفیہ باتیں کرنا ہیں ۔ ابو اسحٰق نے بھی کہا ہے کہ وحی کے اصلی معنی اِعْلَامٌ فِیْ خَفَاءٍ ہیں* ۔ اسی لئے قرآن کریم میں حضرات انبیاء کرامؑ کے مخالفین کے متعلق ہے یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلیٰ بَعْضٍ (۶/۱۱۳) ۔ اس کے معنی خفیہ سازشوں کے ہیں (نیز ۶/۱۲۲) ۔ اِخْفَاء کے اعتبار سے اس کے معنی ہوتے ہیں کسی بات کو دل میں ڈال دینا ۔ چنانچہ اَوْحَتْ نَفْسُهٗ کے معنے ہیں اس کے دل میں خوف پیدا ہوگیا ۔ اس کے دل میں خدشہ پیدا ہوگیا ۔

قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کی والدہ کے متعلق ہے کہ اَوْحَیْنَآ اِلیٰ اُمِّ مُوْسیٰ (۲۸/۷ و ۲۰/۳۸) ۔ ہم نے ام موسیٰ کی طرف وحی کی ''کہ اس بچے کو دودھ پلا اور جب تجھے اس کے متعلق کوئی خطرہ لاحق ہو تو اسے صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دینا'' ۔ جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے، وَحْیٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی کی طرف بھیجی جائے اور اس طرح اسے اس کا علم کرا دیا جائے، یا اس کی طرف حکم بھیجا جائے خواہ اس کی کیفیت یا طریق کچھ ہی ہو ۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی طرف وحی بھیجنے کے معنے ہیں، حضرت عیسیٰؑ کی وساطت سے حکم بھیجنا ۔ اسی طرح والدہ موسیٰؑ کی طرف وحی بھیجنے کے معنی ہونگے ان کی طرف کسی کی وساطت سے حکم بھیجنا یا باخبر کر دینا ۔ جس انداز سے انبیاء کی طرف وحی ہوتی تھی وہ

*تاج ۔

انہی سے مخصوص تھی۔ محض اَوْحَیْنَا کے لفظ سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ غیر نبی کی طرف بھی (اسی قسم کی) وحی ہو سکتی ہے قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔

یاد رکھئے وحی ، جسکے معنی خدا کی طرف سے براہ راست راہ نمائی حاصل ہونے کے ہیں وہ آخری مرتبہ رسول اللہؐ کو مل گئی اور اب وہ قرآن کریم کے اندر کتابت شدہ شکل میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد انسانوں کو ان کی راہ نمائی کے لئے خدا کی طرف سے کچھ اور نہیں ملا۔ نہ ملے گا۔ جو اس کا دعویٰ کرتا ہے وہ یا تو خود فریب خوردہ ہے ، یا دانستہ لوگوں کو فریب دیتا ہے۔

چونکہ وحی میں کسی انسانی خیال یا آرزو کا کوئی دخل نہیں ہوتا اس لئے قرآن کریم نے اسے ایسا اَلْعِلْمُ کہا ہے جو انسانی خیالات اور خواہشات سے یکسر متمیز ہوتا ہے (۲/۱۲۰)۔ اس کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ رسول کی وحی میں اس کے اپنے خیالات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰی۔ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰی (۵۳/۳-۵)۔ وہ اپنی خواہش سے نہیں کہتا بلکہ یہ وہ وحی ہے جو اسکی طرف بھیجی گئی ہے۔ بڑی قوتوں والے (خدا) نے اسے اس کا علم دیا ہے" ۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) نبی کے علاوہ اور کسی کو یہ علم نہیں مل سکتا۔ اس لئے رسول کا اعلان یہ ہوتا ہے کہ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ (۷/۶۲)۔ "میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے" ۔ لہذا جو حقائق وحی کی رو سے ملتے ہیں عقلِ انسانی انہیں دریافت نہیں کر سکتی۔ عقلِ انسانی کو وحی کی روشنی کی اسی طرح ضرورت ہے جسطرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔ عقل کے لئے قابل اعتماد راستہ وہی ہے جو وحی نے متعین کر دیا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ انبیاء کرامؑ کو وحی بالفاظ ملتی تھی۔ یعنی وحی کے الفاظ بھی خدا کیطرف سے ہوتے تھے۔ اَلْوَحْيُ کے معنے الطَّرِيْقُ الْمُعْتَمَدُ قابل اعتماد راستہ بھی ہیں (لطائف اللغة)۔

و د د

اَلْوُدُّ ۔ اَلْوِدَادُ ۔ دوستی ۔ محبت ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز سے محبت کرنا اور اسکے ہوجانے کی تمنا کرنا ہیں ۔ اَلْمَوَدَّةُ محبت ۔ اَلْوَدُّ ۔ میخ کو کہتے ہیں اگرچہ بعض کا خیال ہے کہ یہ اَلْوَتَدُ کا ایک لغت ہے (جس کا مادہ و ـ ت ـ د ہے) *۔

* تاج ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ یَوَدُّ اَحَدُھُمْ (٢/٩٦) ۔ ان میں سے ہر ایک کی یہ تمنا ہے ۔ سورہ مریم میں ہے سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (١٩/٩٦) ۔ خدائے رحمٰن ان کے لئے جاذبیت اور محبت پیدا کر دیگا ۔ اَلْوَدُوْدُ خدا کی صفت ہے ۔ (٨٥/١٤) ۔ یعنی بہت زیادہ محبت کرنے والا ۔

سورہ روم میں میاں بیوی کے تعلقات کے متعلق ہے کہ جَعَلَ بَیْنَکُمْ مَوَدَّۃً (٣٠/٢١) ۔ تم میں باھمی مودّت پیدا کر دی ۔ تمہیں ایک دوسرے کے ساتھ اسطرح جوڑ دیا کہ تم ایک دوسرے کے لئے تقویت (Support) کا موجب بن گئے ۔ سورہ ممتحنہ میں مَوَدَّۃٌ بمقابلہ عداوت آیا ہے (٦٠/٧) ۔

سورہ شوریٰ میں ہے قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی (٤٢/٢٣) '' تم ان سے کہدو کہ میں تم سے اس (رسالت) کا کوئی اجر نہیں مانگتا ۔ میں صرف رشتہ داری کے تعلقات (مودت) چاھتا ھوں ''۔ اس کے صحیح مفہوم کے لئے عنوان ق ۔ ر ۔ ب دیکھئے ۔

وَدٌّ

وَدًّا ۔ سُوَاعًا ۔ یَغُوْثَ ۔ یَعُوْقَ اور نَسْرًا قوم نوحؑ کے بت تھے ۔ (٧١/٢٣) ۔ عرب ان بتوں کے ناموں سے بخوبی متعارف تھے ۔ چنانچہ وَدّ نام کے ایک بت کی پرستش دومۃالجندل میں قبیلہ بنو کاب کے ھاں ھوتی تھی ۔

و د ع

وَدَعَ ۔ یَدَعُ ۔ کوئی چیز ٹھہر گئی ۔ قرار پا گئی ۔ وَدَعَ و وَدَّعَ ۔ چھوڑا ۔ ترک کیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی چھوڑنے اور خالی کر دینے کے ھیں ۔ تَوَادَعَ الْفَرِیْقَانِ ۔ دونوں فریقوں نے ترک جنگ کا معاھدہ کر لیا ۔ اس عہد و پیمان کو وَدِیْعٌ کہتے ھیں ۔ پھر اَلْوَدِیْعُ ہر عہد و پیمان کو کہنے لگے ۔ اور اَلْوَدِیْعَۃُ ۔ امانت کو جو کسی کے پاس حفاظت کے لئے رکھی جائے ۔ تَوْدِیْعُ الثَّوْبِ ۔ کپڑے کو محفوظ جگہ رکھکر اسے گرد و غبار سے بچا لینا ۔ تَوَدَّعَہٗ ۔ اسے محفوظ مقام میں رکھ دیا* ۔

اَلْوَدِیْعُ ۔ پرسکون اور باوقار آدمی ۔ الوَدَعُ ۔ قبر یا مقبرہ ، جہاں مردہ سکون اور آرام سے پڑا رھتا ہے ۔ اَلْمُسْتَوْدَعُ ۔ وہ مقام جہاں کسی چیز کو بحفاظت رکھ دیا جائے* ۔ قرآن کریم میں ہر جاندار شے کے مُسْتَقَرًّا

---

*تاج و محیط ۔

اور مُسْتَوْدَعٌ کا ذکر ہے - (دیکھئے - ۹۹/۶ ؛ ۶/۱۱) - جاندار اشیاء کے سلسلہ ارتقاء (Organic evolution) کا اصول یہ ہے کہ ہر شے کچھ وقت کے لئے ایک خاص مقام میں، ایک خاص حالت میں، ٹھہرتی ہے - پھر وہاں سے نشو و نما پاتی ہوئی اگلی منزل میں پہنچتی ہے - اور اسطرح منزل بہ منزل آگے بڑھتی ہوئی اپنی تکمیل تک جا پہنچتی ہے - یہ راستے میں رکنے کے مقامات اس کے مُسْتَقَرٌّ ہیں اور آخری منزل اسکی مُسْتَوْدَعٌ - جیسے ہم ” راستے میں رکنے کا مقام “ (مُسْتَقَرٌّ) کہتے ہیں اس میں بھی وہ شے جمود کی حالت میں نہیں ہوتی - وہاں بھی اسمیں تبدیلی ہوتی رہتی ہے - لیکن وہ تبدیلی ایسی غیر مرئی ہوتی ہے کہ ہم اسے محسوس نہیں کرتے - ہمیں اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ تبدیلی نمایاں شکل اختیار کر لیتی ہے - اسے ہم اس کی اگلی منزل کہتے ہیں -

وَدَعَہُ، وَدْعاً - اور وَدَّعَہُ، تَوْدِیعاً - کسی کو الوداع کہنا - کسی کو رخصت کرنا - (وَدْعٌ کا ایک مصدر دَعَةٌ ہے جسکے معنی فراخی عیش اور راحت و آرام کے ہیں) - اَلْوَدَاعُ کہنے والا، مسافر کو یہ دعا دیتا ہے کہ خدا اسے سفر کی مشقت سے محفوظ رکھے اور آرام کی حالت میں پہنچا دے - یہ تھی اس لفظ کی اصل - بعد میں یہ لفظ مسافر کو رخصت کرنے اور چھوڑنے کے لئے بولا جانے لگا - اور اس کے بعد صرف چھوڑ دینے (ترک کر دینے) کے معنی میں استعمال ہونے لگا *** - چنانچہ سورہ الضحٰی میں مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی (۹۳/۳) - اور سورہ احزاب میں دَعْ اَذَاھُمْ (۳۳/۴۸) کے معنی چھوڑ دینے کے ہیں -

و د ق

وَدَقَ اِلَیْہِ - اس کے قریب ہوا - وَدَقَ الْمَطَرُ - آسمان سے بارش برسی - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آنے اور مانوس ہونے کے ہیں - آسمان سے آنے کی وجہ سے بارش کو الوَدْقُ کہا جاتا ہے - محیط نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے اصل معنی قریب آنا اور مائل ہونا ہیں ** - وَدَقَتِ الدَّابَّةُ وَاسْتَوْدَقَتْ کے معنی ہیں مادہ چوپایہ کا، نر کی خواہش کے وقت، رطوبت باہر نکالنا - جب سخت بارش ہو رہی ہو اور اس میں غبار سا نظر آئے تو اس غبار کو وَدْقٌ کہتے ہیں - اسی طرح جب گرمی کی شدت سے ہوا میں لہریں سی نظر آئیں تو انہیں وَدِیْقَةٌ کہتے ہیں ***-

*تاج و محیط - **محیط - ***راغب -

تاج میں ہے کہ ہر قسم کی بارش خواہ زوردار ہو یا ہلکی و دْق کہلاتی ہے۔ قرآن کریم میں اَلْوَدْق بارش کے لئے آیا ہے جب وہ بادلوں میں سے نکلے (۲۴/۴۳)۔

و د ی

وَدَی الشَّیْءُ وَدْیاً۔ وہ چیز بہ پڑی *۔ اَلْوَادِیْ۔ وہ جگہ جہاں پانی بہتا ہو۔ یہ اسکے اصل معنی ہیں۔ اس کے بعد دو پہاڑوں کے درمیان کشادہ زمین کو وادی کہنے لگے **۔ اس کی جمع اَوْدِیَۃٌ آتی ہے (۱۳/۱۷)۔ پھر استعارۃً طریقہ، مسلک اور اسلوب کو بھی وَادٍ کہدیتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں فُلَانٌ فِیْ وَادٍ غَیْرِ وَادِیْکَ۔ فلاں آدمی تمہارے طریقہ سے جداگانہ طریقہ رکھتا ہے **۔ قرآن کریم میں شاعروں (جذبات پرست انسانوں) کے متعلق کہا ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّھُمْ فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ (۲۶/۲۲۵)۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ وہ کسطرح ایک ایسے اونٹ کیطرح جسے پیاس کی بیماری بری طرح ستا رہی ہو اور اسکی کہیں تسکین نہ ہوتی ہو مختلف خیالات کی وادیوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ (مزید تفصیل ش۔ع۔ر کے عنوان میں دیکھئے)۔

اَوْدَاہُ۔ اس نے اس کا خون بہا دیا۔ اسے ہلاک کر دیا **۔ اَوْدَی الرَّجُلُ۔ آدمی ہلاک ہو گیا *۔ یہیں سے اَلدِّیَۃُ اس مال کو کہتے ہیں جو مقتول کی جان کے عوض قاتل کی طرف سے مقتول کے ولی کو دیا جاتا ہے ***۔ یعنی خون بہا (۴/۹۲)۔

و ذ ر

اَلْوَذْرَۃُ۔ گوشت کی چھوٹی بوٹی جس میں ہڈی نہ ہو۔ ذَرْہُ۔ اسے چھوڑ دے۔ ھُوَ یَذَرُہٗ۔ وہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اس لفظ کا مصدر نیز ماضی اور اسم فاعل مستعمل نہیں ہوتے۔ صرف امر اور مضارع مستعمل ہوتے ہیں ****۔ (یہ لفظ تَرَکَ کا مرادف ہے)۔

سورۂ المزمل میں ہے وَذَرْنِیْ وَالْمُکَذِّبِیْنَ (۷۳/۱۱)۔ ہمارے قانون کو جھٹلانے والوں کو ہم پر چھوڑ دو۔ انہیں ہمارے حوالے کر دو۔ ان کے متعلق تم فکر مت کرو۔ ہمارا قانون ان سے خود نپٹ لیگا۔

وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا۔ (۲/۲۳۴)۔ اور اپنی بیویوں کو پیچھے چھوڑ جائیں۔

---

*تاج۔ **راغب۔ ***محیط۔ ****تاج و محیط۔

و ر ث

وَرِثَ اَبَاهُ - وہ اپنے باپ کا وارث ہوا - اَوْرَثَہٗ اَبُوْہُ - اسکے باپ نے اسے وارث بنایا - اَلْوِرْثُ - اَلْاِرْثُ - اَلتُّرَاثُ - میراث - بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وَرْثٌ اور مِیْرَاثٌ تو مال میں ہوتی ہے اور اِرْثٌ حسب میں ہوتی ہے - اَلْوَرْثُ - تازہ چیز - اَلْوَارِثُ خدا کی صفت ہے* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا کسی کی ملکیت میں ہونا اور پھر اس کے پاس سے دوسروں کی طرف منتقل ہونا ہیں - اس اعتبار سے خدا کے لئے اَلْوَارِثُ کے معنی واضح ہیں -

راغب نے کہا ہے کہ وراثتِ حقیقی یہ ہوتی ہے کہ انسان کو کوئی ایسی چیز حاصل ہو جائے جس میں اس پر نہ تو کوئی ذمہ داری عائد ہو اور نہ ہی اس پر اس سے محاسبہ کیا جائے - نیز ہر وہ چیز جو بلا محنت و مشقت حاصل ہو جائے اس کے لئے قَدْ وَرِثَ کَذَا کہتے ہیں ، اور کسی کو خوشگوار چیز بطور عطیہ دینے کے لئے اَوْرَثَ کہا جاتا ہے - وراثت صرف مال ہی میں نہیں ہوتی - وَرِثْتُ عِلْمًا مِنْ فُلَانٍ بھی کہتے ہیں - یعنی میں نے فلاں آدمی سے علم کا استفادہ کیا** - حضرت زکریاؑ نے جب خدا سے دعا کی تھی کہ میرے ہاں بیٹا عطا کردے تاکہ وہ یَرِثُنِیْ وَ یَرِثُ مِنْ آلِ یَعْقُوْبَ ($\frac{19}{6}$) - تو وراثت سے ان کی مراد اس خاندان کے علم و فضل کی وراثت تھی ، نہ کہ نبوت کی - کیونکہ نبوت کسی کو ورثہ میں نہیں مل سکتی تھی - یعنی جس طرح بیٹا باپ کی جائداد کا وارث ہو جاتا ہے محض بیٹا ہونے کی جہت سے ، اسی طرح نبی کا بیٹا ، محض اس کا بیٹا ہونے کی جہت سے نبی نہیں ہو سکتا تھا - نبوت خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی - یہ الگ بات تھی کہ ایسے شخص کو بھی خدا نبوت کے لئے منتخب کرلیتا تھا جس کا باپ نبی تھا - اسے یہ منصب باپ سے وراثت میں نہیں ملتا تھا - خدا سے وہبی طور پر ملتا تھا -

سورۃ بقرہ میں اَلْوَارِثُ ($\frac{2}{233}$) - متوفی کے ترکہ کے وارث کے لئے آیا ہے - سورۃ آل عمران میں ہے وَلِلّٰہِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ($\frac{3}{179}$) - اس میں میراث کے معنے ملک کے ہیں - سورۃ الفجر میں ہے وَ تَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ اَکْلًا لَّمًّا ($\frac{89}{19}$) - یہ لوگ میراث کو سمیٹ کر کھا جاتے ہیں - سورۃ

*تاج و محیط - **راغب -

اعراف میں ہے۔ تِلْکُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۷/۴۳) ۔ یہ وہ جنت ہے جس کا تمہیں ، تمہارے اپنے اعمال کے بدلے میں ، وارث بنایا گیا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ وارث کے معنے صرف کسی کے ترکہ کا وارث نہیں بلکہ اپنی محنت کے ماحصل کے مالک کو بھی وارث کہا گیا ہے ۔ وراثت ارض کے بھی یہی معنی ہیں ، جس کے لئے صلاحیت شرط ہے ۔ (۲۱/۱۰۵)

و ر د

اَلْوَرْدُ ۔ ہر درخت کے پھول ۔ (اس کا واحدہ وَرْدَةٌ ہے) لیکن بعد میں یہ لفظ گلاب کے پھول کے لئے زیادہ بولا جانے لگا* ۔ اور پھر سرخ یا گلابی رنگ کے لئے ۔ قرآن کریم میں ہے فَکَانَتْ وَرْدَةً کَالدِّهَانِ (۵۵/۳۷) ۔ وہ دِهَانٌ کی طرح سرخ ہو جائے گا ۔ (دہان کے لئے دیکھئے عنوان د ۔ ہ ۔ ن)۔

اَلْوِرْدُ ۔ گھاٹ ۔ (جانوروں کا) پانی کے گھاٹ پر پہنچنا ۔ خواہ اس میں داخل ہوا جائے یا نہ ہوا جائے* ۔ ابن فارس نے بھی لکھا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز تک پہنچ جانے کے ہیں ۔ وہ لوگ یا جانور جو پانی پر آئیں ۔ انہیں بھی اَلْوِرْدُ کہتے ہیں۔ اَلْمَوْرِدَةُ اَلْوَارِدَةُ ۔ راستہ ۔ پانی یا گھاٹ تک پہنچنے کا راستہ ۔ اَلْمَوَارِدُ ۔گھاٹ یا راستے۔ اَلْوَارِدُ۔ گھاٹ پر پہنچنے یا اترنے والا ۔ جری ۔ آگے بڑھنے والا* ۔ جو شخص پہلے منزل پر پہنچ کر قافلہ کے جانوروں کے لئے پانی کھینچکر تیار رکھے** ۔ اَوْرَدَهُ اس کو گھاٹ پر لایا ۔ اَلْوَرِيْدُ ۔ قلب کی رگ* ۔

سورۃ ہود میں ہے وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ (۱۱/۹۸) ۔ کتنا برا ہے وہ گھاٹ جس پر اُترا جائیگا۔ سورۃ مریم میں ہے ۔ وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰی جَهَنَّمَ وِرْدًا (۱۹/۸۶) ۔ ہم مجرمین کو جہنم کی طرف پیاسے جانوروں کی طرح ہنکا کر لائیں گے ۔ سورۃ یوسف میں قافلے کے آگے جا کر پانی وغیرہ لانے والے کے لئے وَارِدٌ کا لفظ آیا ہے (۱۲/۱۹) ۔

سورۃ مریم میں جہنم کے متعلق ہے وَاِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (۱۹/۷۱) ۔ تم میں سے کوئی نہیں جو اس پر وارد نہ ہو۔ اس آیت سے عام طور پر یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ تمام انسان (مومن و کافر سب) جہنم میں داخل ہونگے۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **راغب ۔

پھر مومنوں کو اس سے نکال لیا جائے گا اور کافر اس میں رہیں گے (اس کی تائید کے لئے اس سے اگلی آیت - ۱۹/۷۲ - پیش کی جاتی ہے) - لیکن یہ خیال بوجوہ غلط ہے - اس لئے کہ قرآن کریم سے، جہنم سے نکلنے کا ثبوت کہیں نہیں ملتا - جہنم ایسی "جگہ" نہیں جہاں سے سزا بھگتنے کے بعد نکل آنا ہوگا - جہنم درحقیقت سلسلۂ ارتقاء میں پیچھے رہ جانے کی کیفیت (State) ہے - یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں مومنین کے متعلق ہے کہ اُولٰئِکَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَهَا (۲۱/۱۰۱-۱۰۲) - وہ اس سے دور رکھے جائینگے - اتنی دور کہ اس کی آہٹ تک بھی نہ سن سکیں گے - اس اعتبار سے آیت (۱۹/۷۱) میں مِنْكُمْ سے مراد تمام نوع انسانی نہیں بلکہ (جیسا کہ پیچھے سے سلسلۂ کلام چلا آ رہا ہے) اس سے مراد وہی کفار اور سرکش مجرم ہیں جو حیات بعد الممات جیسی اہم حقیقت کے منکر تھے - اور اس کے بعد (۱۹/۷۲ میں) جو ہے ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا تو اس میں ثُمَّ کے معنی "اس کے بعد" نہیں - یہ ایک الگ بات کا ذکر ہے - (دیکھئے عنوان ثُمَّ) - نیز نجات کے معنے عذاب سے محفوظ رکھنے کے بھی ہیں - (دیکھئے عنوان ن - ج - و) -

لیکن اگر اس پر اصرار کیا جائے کہ (۱۹/۷۱) میں مِنْكُمْ سے مراد تمام انسان (مومن و کافر سب) ہیں تو، جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، وِرْدٌ میں اندر داخل ہونا ضروری نہیں - اس سے مراد کسی مقام تک صرف پہنچنا ہیں -

اس اعتبار سے یوں سمجھا جائیگا کہ جنت، خواہ دنیوی ہو خواہ اُخروی، اس تک پہنچنے کے لئے تکلیفوں اور مصیبتوں کی بھٹی سے گزرنا پڑے گا - آگ اور خون میں کھیلنا ہوگا - یہ "پل صراط" دنیا میں ایک ایک قدم پر موجود ہے جس سے گزر کر جنت کا دروازہ ملتا ہے - جو شخص ان پُرخار وادیوں میں ذرا غیر محتاط (غیر متقی) ہوا - یا مشکلات و مصائب سے گھبرا کر بھاگ اٹھا - وہ تباہیوں کے جہنم میں گر جائے گا - جو احتیاط برتے گا اور مصائب میں ثابت قدم رہے گا وہ اس سے محفوظ رکھا جائے گا - قرآن کریم کے متعدد مقامات میں اس حقیقت کو سامنے لایا گیا ہے کہ جنت میں داخل ہونے سے پہلے سخت دشوار گذار مراحل سے گذرنا ہوگا - (مثلاً ۲/۲۱۴ و ۳/۱۴۱ و ۹/۱۶ و ۳۳/۱۰) - اس کے یہ معنی نہیں کہ مرنے کے بعد کی زندگی میں پہلے مشقتوں اور تکلیفوں سے گذرا جائے گا اور اس کے بعد جنت میں پہنچا جائے گا - اسکے معنی یہ ہیں کہ اس دنیامیں حق و صداقت کے پیامبروں کو مخالفین کی طرف سے تکالیف پہنچائی جائینگی - جو ان تکالیف کو برداشت کرکے جادۂ حق و صداقت

پر قائم رہے گا وہ جنت کا مستحق قرار پائے گا۔ وہ مرنے کے بعد سیدھا جنت میں چلا جائے گا۔ جنت اور جہنم کا فیصلہ انسان کے اس دنیا کے اعمال کرتے ہیں۔

جو حقیقت اوپر بیان ہوئی ہے اسے فلسفہ کی زبان میں یوں کہا جائیگا کہ تخلیق (Creation) کا طریق (Process) یہ ہے کہ ہر تخلیقی تصور (Creative Idea) کے مشہود (Manifest) ہونے سے پہلے ایک داخلی ہیجان اور خلجان ہوتا ہے۔ (اسے Labour Pains کہئے) ایک کامیاب نابغہ (Genius) اس فکری خلجان اور ہیجان سے کامیاب باہر نکل آتا ہے۔ خام اور ناکام اس کشمکش میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ کتنے ہی خامکار مفکر اس گرداب میں پھنسے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

نبوت اس طریق (Process) سے ماورا ہوتی ہے کیونکہ وہ صاحب وحی کی خود پیدا کردہ فکر نہیں ہوتی۔

و ر ق

اَلْوَرَقُ درخت کے پتے۔ ایک پتے کو وَرَقَۃٌ کہتے ہیں *۔ قرآن کریم میں ہے وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَۃٍ (۶/۵۹)۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ اَلْوَرِقُ چاندی کو کہتے ہیں خواہ وہ ٹھپہ لگی ہوئی ہو یا نہ ہو۔ ابوالہیثم نے کہا ہے کہ اَلْوَرَقُ۔ اَلْوَرِقُ اور اَلرِّقَۃُ۔ خصوصیت کے ساتھ دراہم کو کہتے ہیں *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) خیر اور مال۔ اور (۲) خاکستری رنگ کے ہیں۔ سورۂ کہف میں ہے فَابْعَثُوْا اَحَدَکُمْ بِوَرِقِکُمْ (۱۸/۱۹)۔ اس کے معنی سکے کے ہیں۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ کلام قدیم میں وَرَقٌ ان جھلیوں اور کھالوں کو کہتے تھے جن پر لکھا جاتا تھا **۔ اسی سے کتاب کے اوراق ہیں۔

و ر ی

اس مادہ میں چھپنے اور ظاہر ہونے کے، دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ وَرَتِ النَّارُ۔ آگ بھڑکی۔ اَوْرَی النَّارَ۔ آگ بھڑکائی۔ اور وَرَّاہُ تَوْرِیَۃً۔ اس کو چھپا دیا۔ دراصل اس میں چھپانے اور ظاہر کرنے کے دونوں پہلو بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً چقماق کے اندر آگ پوشیدہ ہوتی ہے۔ اور جب اس سے نکلتی ہے تو روشن ہوجاتی ہے۔ اس لئے کہتے ہیں

* تاج۔ ** محیط۔

وَرَی الزَّنْدُ ۔ چقماق سے آگ نکلی ۔ اسی بناء پر وَرَّی الْخَبَرَ کے معنی ہیں اصل بات کو چھپا کر اسے کسی اور طریق سے ظاہر کیا* ۔ وَارَاہُ اسے چھپایا ۔ یُوَارِیْ (۳۱/۵) چھپائے ۔ تَوَارٰی ۔ چھپا* ۔ تَوْرِیَۃٌ* ۔ ابہام* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مادہ کسی قیاس کا پابند نہیں ۔

اَلْوَرَاءُ ۔ پوتے کو کہتے ہیں*** ۔ وَمِنْ وَّرَاءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ (۷۱/۱۱) کی یہی تفسیر کی گئی ہے ۔ یعنی حضرت ابراہیم ؑ کو ان کے بیٹے اسحٰق ؑ کی بشارت ملی اور اسحٰق ؑ سے آگے ، ایک پوتے یعقوب ؑ کی ۔

تَوْرَاۃٌ کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اسی مادہ سے ہے* ۔ ایسی صورت میں اس کے معنے ہوں گے ۔ وہ شے جس سے آگ یا روشنی حاصل کی جائے ۔ (کتاب تورات کے لئے دیکھئے عنوان تَوْرَات*) ۔ وَرَاءَ ذٰلِکَ ۔ یعنی سوٰی ذٰلِکَ ۔ اس کے سوا کچھ اور** ۔ وَیَکْفُرُوْنَ بِمَا وَرَاءَهٗ (۹۱/۲) ۔ اس کے علاوہ اور جو کچھ بھی ہے اس سے انکار کرتے ہیں ۔

سورۃ واقعہ میں ہے ۔ اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ (۷۱/۵۶) ۔ کیا تم نے آگ پر غور کیا جسے تم روشن کرتے ہو ۔ اور سورۃ عادیات میں ہے ۔ فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا (۲/۱۰۰) ۔ وہ گھوڑے جن کے ٹاپ مارنے سے آگ کی چنگاریاں نکلتی ہیں ۔

وَرَاءٌ ۔ وَرٰی* کے بنیادی معانی (چھپنے اور ظاہر ہونے) کے لحاظ سے وَرَاءُ کے معنی بھی پیچھے اور آگے دونوں آتے ہیں* ۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ، سیاق و سباق کے لحاظ سے اس کے معانی متعین کئے جائینگے ۔

و ز ر

اَلْوَزَرُ ۔ بلند اور محفوظ پہاڑ ۔ وہ پہاڑ جس میں پناہ لی جائے ۔ ہر جائے پناہ یا حفاظت گاہ* ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کَلَّا لَا وَزَرَ (۱۱/۷۵) ۔ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں بھاگ کر پناہ لی جائے**** ۔

اَلْوِزْرُ ۔ بار گراں ۔ بہت بڑی ذمہ داری ۔ اسکی جمع اَوْزَارٌ ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) ملجا ، جائے پناہ اور (۲) کسی چیز میں ، گرانی اور بھاری پن کے ہیں ۔ وَزَرَ ۔ اس نے بوجھ اٹھایا ۔ وَازِرٌ بوجھ اٹھانے والا* ۔ قرآن کریم میں ہے لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (۱۶۵/۶) ۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا ۔

*تاج ۔ **محیط ۔ ***ابن قتیبہ (القرطین ۔ جلد ۱) ۔ نیز ابن فارس ۔ ****کتاب الاشتقاق ۔

ہر ایک کو اپنی اپنی ذمہ داری خود پوری کرنی ہوگی ۔ اور کسی کو کسی دوسرے کے اعمال کی سزا نہیں ملے گی ۔ نہ ہی کوئی کسی دوسرے کے اعمال کی جزا اور سزا میں حصہ دار ہوگا ۔ قانون مکافات کا یہ عظیم الشان اصول ہے جسکا قرآن کریم نے اسطرح اعلان کیا ہے ۔ اپنی اپنی ذمہ داری اور اپنے اپنے کئے کا پھل ۔ آج کے جہنمی معاشرہ کا سا حال نہیں کہ — دانہ این می کارد ، آن حاصل برد ۔ محنت کوئی کرے ،عیش کوئی اڑائے ۔ جرم کوئی کرے ، سزا کوئی بھگتے ۔ غلطیاں کسی سے ہوں ، اسکے نتائج کوئی برداشت کرے ۔ تنخواہ کوئی پائے ، ذمہ داریاں کوئی اٹھائے ۔ قرآنی معاشرہ میں یہ کچھ نہیں ہوگا ۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰى وہاں کا غیر متبدل اصول ہوگا ۔

وَزِيْرٌ و مُوَازِرٌ ۔ جس پر ذمہ داری ہو ۔ وہ جو کسی کے بوجھ میں شریک ہو*۔ راغب نے المُوَازَرَة کے معنے معاونت بتائے ہیں اور وَزِيْرٌ کے معنے معاون و مدد گار ۔ نیز امیر کا بوجھ اور ذمہ داریاں اٹھانے والا**۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ (۲۰/۲۹) ۔ '' میرے اہل میں سے میرا بوجھ بٹانے والا بنا دے ''۔

اَوْزَارُ الْحَرْبِ ۔ جنگ کے ہتھیار (۴۷/۴) ۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ جماعت مومنین ضرورۃً جنگ اس لئے کرتی ہے کہ '' خود جنگ اپنے ہتھیار رکھدے '' ۔ یعنی جنگ کا امکان نہ رہے ۔ دنیا میں امن و سلامتی ہو جائے ۔ حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (۴۷/۴) ۔'' تاآنکہ جنگ اپنے ہتھیار رکھدے''

و ز ع

وَزَعْتُهٗ اَزَعُهٗ وَزْعًا ۔ میں نے اس کو روک دیا ۔ منع کردیا ۔ فَاتَّزَعَ ۔ پس وہ رک گیا ۔ اَلْوَازِعُ ۔ روکنے اور باز رکھنے والا ۔ اس جہت سے یہ حاکم اور والی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ نیز ان سپاہیوں اور سرکاری کارندوں کے لئے بھی جو لوگوں کو بے قانون ہونے سے روکیں ۔ نیز وہ شخص جو فوجی امور کی تدبیر کرے اور فوج کو نظم و ضبط میں رکھے ۔ کماندار***۔ سورہ نمل میں حضرت سلیمانؑ کے جیوش وعساکر (لشکروں) کے متعلق ہے فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ (۲۷/۱۷) اس کے یا تو یہ معنی ہیں کہ وہ نہایت ترتیب سے صف در صف رہتے تھے، ادھر ادھر بکھرے ہوئے نہیں ہوتے تھے ۔ یا یہ کہ انہیں ایسے نظم و ضبط میں رکھا تھا کہ وہ کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے تھے ۔ نہ ہی کسی پر ظلم و زیادتی کرتے تھے ۔ اسی سورۃ میں ذرا

*تاج ۔ **راغب ۔ ***تاج و راغب ۔

آگے چل کر حضرت سلیمان* کی یہ دعا مذکور ہے کہ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ (۲۷/۱۹) - اس کا مطلب یہ ہے کہ اے میرے نشو و نما دینے والے مجھے ایسی تمام چیزوں سے روک دے جو تیرے شُکر کے راستے میں حائل ہوتی ہوں - مجھے اتنا ضبط عطا کر دے کہ میں اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف تیرے متعین کردہ راستے میں صرف کروں - اہل لغت نے کہا ہے کہ یہاں اَوْزِعْنِیْٓ کے معنی توفیق دینا - سُجھانا - اور کسی چیز کا شیدائی بنانا بھی ہیں - جب کسی کو غلط راستے پر چلنے سے روک دیا جائے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اسے صحیح راستے پر لگ جانے کی توفیق دیدی -

سورہ حم سجدہ میں اہل جہنم کے متعلق ہے کہ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ (۴۱/۱۹) وہ روک دیئے جائینگے (اس کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ج - ح - م میں جَحِیْم*) -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے الفاظ کسی قیاس اور قاعدے کے پابند نہیں -

و ز ن

اَلْوَزْنُ - ہاتھ سے کسی چیز کے ہلکے یا بھاری ہونے کا اندازہ کرنا*- کسی چیز کی مقدار معلوم کرنا** - بعض نے کہا ہے کہ وَزْنٌ - ہلکا یا بھاری ہونے کو کہتے ہیں ، لیکن لیث کا قول ہے کہ وَزْنٌ ایک چیز کے بوجھ کا دوسری چیز کے بوجھ کے برابر ہو جانا ہے - وَزَنَ - يَزِنُ - وزن کرنا - وزن کرکے دینا * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی استقامت اور تناسب و اعتدال کے ہیں نیز دو چیزوں کے وزن کو برابر کرنے کے -

قرآن کریم نے وَزْنٌ کو بڑی اہمیت دی ہے اور اسے خاص اصولی معنوں میں استعمال کیا ہے - نظام کائنات پر غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ یہ سارا سلسلہ تَوَازُن کی رو سے قائم ہے - اگر مختلف اشیاء کا باہمی توازن بگڑ جائے تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے - اس کے لئے فرمایا - وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَ وَضَعَ الْمِيْزَانَ (۵۵/۷) - خدا نے اس سلسلۂ کائنات کو ان بلندیوں پر قائم کیا اور تمام اشیاء میں ایک توازن رکھ دیا - مختلف فضائی کرّوں اور اجرام فلکی کی باہمی جذب و کشش اس عظیم المثال توازن کی زندہ شہادت ہے - چونکہ انسان بھی کائنات ہی کا ایک جزو ہے اس لئے ضروری ہے کہ اسکی دنیا میں بھی یہی توازن (Equilibrium) قائم رہے -

*تاج - **راغب -

اَلاَّ تَطْغَوا فِی الْمِیْزَانِ (۵۵/۸) - لہذا تم اپنی تمدنی، معاشرتی اور معاشی دنیا میں ہمیشہ اس اصول کو پیش نظر رکھو وَ اَقِیْمُوْا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوْا الْمِیْزَانَ (۵۵/۹)- معاشرتی اور معاشی توازن کو عدل و انصاف کے ساتھ برقرار رکھو اور معاشرہ کا توازن کبھی بگڑنے نہ دو- ظاہر ہے کہ معاشرہ کا یہ توازن صرف قانون کے الفاظ سے قائم نہیں رہ سکتا - اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک عملی نظام قائم کیا جائے جو اس توازن کے قیام کا ذمہ دار ہو- یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ خدا نے صرف ضابطۂ قوانین هي نازل نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ اَلْمِیْزَانُ بھی نازل کی ہے - یعنی معاشرہ میں توازن قائم رکھنے کا ذمہ دار عملی نظام - وهي نظام وہ معیار بنتا ہے جس سے ہر شے کا صحیح صحیح ''وزن'' متعین ہوتا ہے - وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِیْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷/۲۵) - لیکن دنیا میں کوئی نظام قوت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا اس لئے کہا کہ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ (۵۷/۲۵)- اس کے لئے ہم نے فولاد (کی شمشیر) بھی نازل کی - یہ ہے قرآنی نظام کا صحیح نقشہ - یعنی خدا کی طرف سے ابدی قوانین کا ضابطہ (الکتاب)- اس ضابطہ کو عملی طور پر متشکل کرنے کے لئے نظام (المیزان)- اور اس نظام کے قیام و استحکام کے لئے قوت (الحدید) - حدید کے متعلق فرمایا کہ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷/۲۵)- اس کی شدت اور سختی، فتنہ و فساد برپا کرنے والے عناصر کے لئے روک تھام کا کام دیتی ہے اور یوں یہ قوت، نوع انسانی کے لئے فی الجملہ - باعث منفعت بن جاتی ہے - اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جو کچھ ملتا ہے سعی و عمل کے مطابق ملتا ہے - فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ - فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ و اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ - فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ (۱۰۱/۶-۹) - جس کی سعی و عمل کا پلڑا بھاری ہوگا اسے عیش فراواں کی زندگی نصیب ہوگی - جسکا پلڑا ہلکا ہوگا وہ ذلت و رسوائی کے آغوش میں چلا جائیگا - (مَوَازِیْنُ - مِیْزَانٌ کی جمع ہے)- اس نظام میں ہر چیز کا وزن ٹھیک ٹھیک، یعنی ہر عمل کا نتیجہ صحیح صحیح مرتب ہوگا- وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ (۷/۸)- اور تمام وہ کوششیں جو خدا کے نظام ربوبیت عامہ کے خلاف ہوں گی بے نتیجہ ہو کر رہ جائینگی - فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَزْنًا (۱۸/۱۰۵) - اسطرح یہ معاشی اور معاشرتی نظام، کائناتی نظام سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے جس میں ہر شے موزون ہے - وَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ (۱۵/۱۹)- یعنی ایک خاص تناسب (Proportion) کو لئے ہوئے -

توازن کے اعتبار سے وَزِيْنُ الرَّأْيِ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی رائے بہت صحیح اور وزندار ہو۔ اور رَاجِحُ الْوَزْنِ اس شخص کو جو کامل العقل اور کامل الرائے ہو*۔ اور اَوْزَنُ الْقَوْمِ۔ قوم کے بہترین و معزز ترین فرد کو کہتے ہیں**۔

و س ط

اَلْوَسَطُ۔ ہر چیز کا درمیانی حصہ۔ وہ نقطہ جو دونوں اطراف سے برابر فاصلے پر ہو۔ وُسُوْطُ الشَّمْسِ۔ آفتاب کا آسمان کے درمیان آ جانا۔ مُتَوَسِّطُ الْبَيْتِ۔ وہ چیز جو خصوصیت سے گھر کے درمیان واقع ہو*۔ محیط میں ہے کہ اَلْوَسَطُ اور اَلْوَسْطُ اس درمیانی جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے تمام اطراف کا فاصلہ برابر ہو**۔

چونکہ ہر چیز کا اوسط (درمیانی نقطہ) نقطۂ اعتدال ہوتا ہے، یعنی افراط و تفریط کے بالکل درمیان، اس لئے یہ لفظ ہر عمدہ اور بہترین چیز کے لئے بولا جاتا ہے۔ وَاسِطَةُ الْقِلَادَةِ۔ ہار کا درمیانی موتی جو نفیس ترین ہوتا ہے۔ وَسَاطَةُ الدَّنَانِيْرِ۔ بہترین دینار*۔ اَلْوَاسِطَةُ۔ درمیانی۔ بیچ میں پڑنے والا۔ علت (کسی چیز کا ذریعہ اور سبب)**۔ اَلْوَسِيْطُ۔ وہ شخص جو جھگڑا کرنے والوں کے بیچ میں پڑے*۔ قرآن کریم میں جنگ کے گھوڑوں کے متعلق ہے فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا (۱۰۰/۵)۔ وہ دشمنوں کی صفوں کے اندر جا گھستے ہیں۔

قرآن کریم میں امت مسلمہ کے متعلق ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (۲/۱۴۳)۔ اس طرح ہم نے تمہیں ایک امت وَسَطْ بنایا ہے جس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام نوع انسانی کے اعمال کی نگرانی کرے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ اس قوم کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو اور وہ ہر قوم سے برابر فاصلے پر ہو (Equidistant) ہو۔ یعنی نہ کسی کی طرف جھکی ہوئی اور نہ کسی سے کھنچی ہوئی۔ اس کی نگاہوں میں سب برابر ہوں، جس طرح دائرے کے مرکز سے محیط کا ہر نقطہ برابر فاصلے پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پوزیشن اس قوم کو حاصل ہو سکتی ہے جو عدل اور انصاف کے راستے سے ذرا بھی ادھر ادھر نہ ہٹے۔ اس قسم کی قوم صحیح معنوں میں اقوام عالم کے اعمال و افعال کی نگران اور محتسب ہوسکتی ہے۔ لہذا امت وَسَطْ سے مراد ایسی قوم ہے جسے بین الاقوامی

*تاج۔ **محیط۔

اور مرکزی پوزیشن حاصل ہو۔ جو تمام اقوام کے افعال و حرکات کی نگران ہو اور بین الاقوامی معاملات کو پورے پورے عدل و انصاف سے سلجھائے۔ قرآن کریم نے یہ مقام متعین کیا تھا جماعت مومنین کا۔

یہ نقطہ بھی غور طلب ہے کہ قرآن کریم نے اس قسم کا بین الاقوامی نظام اور اقوام عالم کے متنازعہ فیہ امور کے تصفیہ کے لئے اس قسم کا انتظام اس زمانے میں تجویز کیا تھا جب دنیا ہنوز ''بین الاقوامی'' تصور تک سے نا آشنا تھی۔

و س ع

وَسِعَ۔ یَسَعُ۔ سَعَۃً۔ قدرت رکھنا۔ طاقت رکھنا۔ اختیار رکھنا۔ مَا اَسَعُ ذَالِکَ۔ میں اس کی قدرت نہیں رکھتا۔ ھٰذَا الْاِنَاءُ یَسَعُ عِشْرِیْنَ کَیْلًا۔ اس برتن میں بیس پیمانہ بھر چیز سمانے کی گنجائش ہے۔ اَلْوَاسِعُ۔ اَلْوَسِیْعُ۔ فراخ۔ کشادہ۔ اَلْوَسْعُ اَلْوُسْعُ اَلْوِسْعُ اَلسَّعَۃُ۔ ان سب کے معنی، فارغ البالی۔ کشادگیٔ رزق۔ قدرت اور طاقت کے ہیں۔ اَلْوَسَاعُ۔ اُس گھوڑے کو کہتے ہیں جو لمبی لمبی ڈگ بھرتا ہوا تیزی سے دوڑے*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی تنگی اور بدحالی کی ضد بتائے ہیں۔

راغب نے لکھا ہے کہ وُسْعٌ اس طاقت کو کہتے ہیں جو اس کام سے ذرا زیادہ ہو جو اس کے سپرد کیا جائے۔ اس لئے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا (۲/۲۸۶) کے معنی یہ ہیں کہ خدا بندے کے ذمہ اتنا ہی کام لگاتا ہے جو اس کی طاقت سے ذرا کم ہوتا ہے**۔ (اس کا صحیح مفہوم آگے آتا ہے)۔ اَلْمُوْسِعُ۔ صاحب اختیار و وسعت*۔ اَلْوَاسِعُ۔ خدا کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے*۔

قرآن کریم میں اَلْمُوْسِعُ۔ اَلْمُقْتِرُ۔ کے مقابلہ میں آیا ہے (۲/۲۳۶)۔ یعنی وہ جسے رزق کی کشادگی نصیب ہو۔ یہی معنی سورۃ نور میں اُولُو السَّعَۃِ کے ہیں (۲۴/۲۲)۔ یعنی آسودہ حال اور کشائش والے لوگ۔ سورۃ ذاریٰت میں ہے اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (۵۱/۴۷)۔ ہم صاحب وسعت ہیں۔ یعنی ہماری قدرت اور اختیارات بھی وسیع ہیں اور ہم رزق میں فراخی اور کشادگی بھی عطا کرتے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (۲/۲۵۵)۔ اس کا علم تمام کائنات کو محیط ہے۔ علم ہی نہیں بلکہ رحمت (سامان ربوبیت) بھی (۴۰/۷)۔

---

*تاج۔ **محیط۔

قرآن کریم میں ہے ۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶ و ۶/۱۵۳ و ۷/۴۲ و ۲۳/۶۲) ۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ خدا جو اپنے احکام و قوانین کی اطاعت چاہتا ہے تو اس سے اس کا اپنا کوئی فائدہ مطلوب نہیں ۔ یہ صرف اس لئے ہے کہ انسانی ذات میں وسعت پیدا ہو جائے ۔ اس کی قدرت و اختیارات کا دائرہ وسیع ہو جائے ۔ ایسے کشادگی اور فراخی نصیب ہو جائے** ۔ سورۃ اعراف میں اس کے ساتھ کہا گیا ہے اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ (۷/۴۲)۔ ان وسعتوں اور فراخیوں کا نام جنت کی زندگی ہے ۔ یعنی اس دنیا میں رزق اور زندگی کی خوشگواریوں کی وسعت اور کشاد ، اورخود انسانی ذات (Personality) کے اختیارات و ممکنات کے دائرے کی وسعت ، جس سے انسان اُخروی زندگی میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے ۔ یہ وہ جنت ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو محیط ہے ۔ عَرْضُهَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ (۵۷/۲۱) ۔

راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کےمعنی یہ ہیں کہ ان احکام کا ثمرہ وسعت ہے ۔ یعنی جنت ۔ یہ اسی مفہوم کی تائید میں ہے جسے دوسری جگہ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (۲/۱۸۵) سے ادا کیا گیا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا ہے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے یہ معنے بھی ہیں کہ خدا ایسے احکام دیتا ہے جو کسی کی قوت برداشت سے زیادہ نہ ہوں ۔ اس آیت کا عام مفہوم بھی لیا جاتا ہے ۔ لیکن قرآن کریم میں بعض مقامات پر پہلا مفہوم زیادہ موزوں نظرآتا ہے ۔ قرآنی تعلیم کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ انسانی ذات کی نشو و نما ہے جس سے اس کی صلاحیتوں اور ممکنات کا دائرہ بڑا وسیع ہو جاتا ہے ۔

و س ق

وَسَقَ یَسِقُ وَسْقًا ۔ چیزوں کو ملانا ۔ متفرق چیزوں کو اکٹھا اور جمع کرنا ۔ نیز بوجھ اٹھانا ۔ کسی چیز کو اپنے اندر لے لینا ۔ وَسَقَتِ النَّاقَةُ ۔ اونٹنی نے نر کے جنسی مادہ کو اپنے اندر رحم میں جمع کرکے اس کا منہ بند کر لیا ۔ یعنی وہ حاملہ ہوگئی ۔ اِسْتَوْسَقَتِ الْاِبِلُ ۔ اونٹ جمع ہوگئے* ۔ نواب صدیق خاں نے لکھا ہے کہ (و ۔ س ۔ ق) کا خاصہ شدت اور اجتماع ہے*** ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو اٹھا لینا بتائے ہیں ۔

*تاج و راغب ۔ **راغب ۔ ***العلم الخفاق ۔

قرآن کریم میں ہے وَ اللَّیْلِ وَمَا وَسَقَ (۸۴/۱۷) - رات اور ہر وہ شے جسے وہ جمع کرلیتی ہے - یعنی تاریکیاں - یا ستارے اور چاند - وَسْقٌ - ایک اونٹ کا بار - ساٹھ صاع - اِتِّسَاقٌ - ہر چیز کے مل جانے اور اس کے اجزاء کے اکٹھے ہو جانے کو کہتے ہیں* - قرآن کریم میں ہے - وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ (۸۴/۱۸) - اس میں چاند کے کامل ہو جانے کا مفہوم ہے - اِتِّسَاقُ الْقَمَرِ - چاند کے بھرپور، کامل اور برابر ہو جانے کو کہتے ہیں - یہ حالت تیرھویں سے سولھویں رات تک ہوتی ہے -

و س ل

اَلْوَسِیْلَةُ - کسی چیز کی طرف رغبت کے ساتھ پہنچنا - لہذا مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ اَلْوَصِیْلَةُ سے زیادہ خاص ہے کیونکہ وَصِیْلَةٌ کے معنی کسی چیز تک پہنچنا ہیں اور وَسِیْلَةٌ کے معنی رغبت کے ساتھ پہنچنا* - اس کے معنی منزلت - مقام - مرتبہ کے ہیں* - نیز ہر وہ چیز جس کے ذریعے کسی دوسرے سے قرب حاصل کیا جائے - نیز قُرْبَةٌ - یعنی قدرو منزلت کے اعتبار سے کسی سے قریب ہونا** - تَوَسَّلَ اِلَیَّ بِکَذَا - اس نے میری طرف فلاں چیز کے ذریعے قرب حاصل کیا*** - صاحب تاج العروس اور محیط نے وَسِیْلَةٌ کے معنی مرتبہ - درجہ - قرب - تعلق کے لکھے ہیں - تَوَسَّلَ اِلَی اللّٰهِ تَوَسُّلًا - اس نے کوئی ایسا کام کیا جس سے اسے خدا کا قرب حاصل ہوگیا - اَلْوَاسِلُ - رغبت کرکے کسی کا قرب حاصل کرنے والا** -

سورہ مائدہ میں ایک آیت ہے جس کے غلط (مروجہ) مفہوم نے، اسلام جیسے حیات بخش دین (نظام زندگی) کو اشخاص پرستی کا طلسم بنا کر رکھ دیا ہے - وہ آیت یہ ہے - یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (۵/۳۵) - اس کا سیدھے سادے الفاظ میں ترجمہ یہ ہے - "اے ایمان والو! تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو - اور اس کی طرف "وسیلہ" طلب کرو - اور اس کی راہ میں جہاد کرو - تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ" - ہم نے اس میں لفظ "وسیلہ" کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا ہے کیونکہ اسی کے غلط مفہوم پر اشخاص پرستی کی وہ عمارت قائم کی جاتی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے - لفظ "وسیلہ" کے جو لغوی معنی اوپر دئے گئے ہیں ان کی رو سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے ایمان والو! تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو - اور خدا کے ہاں درجہ مرتبہ، قرب، منزلت طلب کرو - اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کے راستے

* راغب - ** تاج و محیط - ***ابن قتیبہ (القرطین جلد اول صفحہ ۱۶۱) -

میں پوری پوری جدو جہد کرتے رہو۔ اس سے تم مقصد زندگی کے حصول میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ یعنی خدا کے ہاں قدرو منزلت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی راہ میں مسلسل جدو جہد کرتے رہو۔

اور اگر لفظ " وسیلہ " کا ترجمہ " ذریعہ " کیا جائے تو بھی مطلب یہ ہوگا کہ تم اللہ کے ہاں عزت و منزلت۔ درجہ اور مرتبہ حاصل کرنے کا ذریعہ طلب کرو۔ یعنی اس کے راستے میں جہاد کرو۔ دونوں صورتوں میں مفہوم ایک ہی ہے۔ یعنی جہاد فی سبیل اللہ وہ عمل صالح ہے جو خدا کے ہاں درجہ اور مرتبہ ملنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس طریق سے تم خدا کے مقرب بن سکتے ہو۔ لیکن ہمارے ہاں اس آیت کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لئے " وسیلے " کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ وسیلہ ہے " پیرومرشد "۔ لہذا مرشد (پیر طریقت) کے بغیر خدا تک نہیں پہنچا جا سکتا۔

اور جب " وسیلہ " کے معنی " پیر پکڑنے " کے کر لئے تو " جَاهِدُوْا " کے معنی ہو گئے " اپنے نفس سے جہاد کرنا "۔ جسے جہاد اکبر قرار دیا جاتا ہے۔ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ، انسانوں کو قرار دینے والے اس دین (اسلام) کے نام لیوا ہیں جو دنیا سے شخصیت پرستی کو مٹا کر، خدا اور بندے کا براہ راست (قرآن کریم کے ذریعے) تعلق پیدا کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس دین کے عطا کرنے والے خدا کا اعلان یہ تھا کہ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ۔ " جب میرے بندے تجھ سے (اے رسول) میری بابت پوچھیں تو (کہدو کہ) میں ان سے قریب ہوں "، اتنا قریب کہ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ۔ " میں ہر شخص کی پکار کا، جو مجھے پکارتا ہے، جواب دیتا ہوں "۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ (۲/۱۸۶) " انہیں چاہئے کہ میری فرمانبرداری کریں۔ اور مجھ پر ایمان رکھیں۔ تا کہ انہیں رشدوہدایت مل جائے "۔ بات کسقدر صاف ہے۔ جو شخص قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور ان کی اطاعت کرتا ہے، اسے وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے جس کے لئے دوسرے لوگ " مرشد " تلاش کرتے رہتے ہیں۔ (يَرْشُدُوْنَ کا لفظ اسی طرف اشارہ کرتا ہے)۔ خدا کے علاوہ کوئی " مرشد " (راہ بتانے والا) نہیں (دیکھئے ۱۸/۱۷)۔ خدا کے قوانین کی اطاعت اس نظام کی رو سے ہوتی ہے جو اس کے قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے متشکل ہوتا ہے۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں (حضرت عمرؓ کے الفاظ میں) " خدا اور بندے کے درمیان کوئی اور طاقت حائل نہیں رہتی "۔ یہی وہ صحیح آزادی

ہے جسے عطا کرنے کے لئے نبی اکرمؐ مبعوث ہوئے تھے (۷/۱۵۷) - لیکن ہم نے اس آزادی کی جگہ ، انسان پرستی کی مقدس زنجیروں سے اپنے آپ کو اس طرح جکڑ لیا کہ ہمارے فکر و عمل کا کوئی گوشہ بھی آزاد نہ رہ سکا - یاد رکھئے - مسلمان ، دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل صرف اس وقت ہو سکے گا جب اس نے انسانوں کی چوکھٹوں سے سر اٹھا کر صرف اللہ کے سامنے جھکنے کا مسلک اختیار کر لیا -

و س م

اَلْوَسْمُ - تپائے ہوئے لوہے سے داغ دینا یا نشان لگانا - اَلْوِسَامُ - وہ نشان جو داغ دینے سے پڑ جائے - وَسَمَ یَسِمُ وَسْمًا - جانور کو لوہے سے داغ دیکر نشان زدہ کرنا -

اَلسِّمَۃُ - علامت - نشانی - فُلَانٌ مَوْسُوْمٌ بِالْخَیْرِ - فلاں آدمی پر بھلائی کا نشان ہے - مَوْسِمُ الْحَجِّ - وہ زمانہ جو اجتماعِ حج کے لئے نشان زد کر دیا جائے - تَوَسُّمٌ فراست و ذکاوت کو کہتے ہیں - اَلْوَسْمِیُّ - موسمِ بہار کی ابتدائی بارش (جس سے زندگی اور حسن کی نمود کی نشان دہی ہو جاتی ہے) * -

قرآن کریم میں ہے سَنَسِمُہٗ عَلَی الْخُرْطُوْمِ (۶۸/۱۶)- ہم اس کی ناک پر داغ دینگے - (ذلت و خواری مفہوم ہے) - سورۃ حجر میں ہے - اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ (۱۵/۷۵) - اس میں صاحبان فراست کے لئے نشانیاں ہیں - ان لوگوں کے لئے جو آثار و قرائن سے حقائق کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں -

و س ن

اَلْوَسَنُ - اَلسِّنَۃُ - نیند کی ابتدا یا اونگھ یا نیند کے جھونکے کو کہتے ہیں - اس کا اگلا درجہ نَوْمٌ ہوتا ہے - نیز اس کے معنی غفلت ہونے ہیں - ھُوَ فِیْ سِنَۃٍ - وہ غفلت میں ہے * - اسکے معنے نیند کی گرانی اور شدت بھی ہیں ** - قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے - لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ (۲/۲۵۵)- بے خبر ہونا تو ایک طرف وہ کسی شے سے غافل تک بھی نہیں ہوتا -

---

* تاج و راغب - ** تاج -

و س و س

اَلْوَسْوَاسُ ۔ ھلکی سی آھٹ ۔ شکاری کی آھٹ ۔ دبے پاؤں چلنے سے پیدا ھونے والی خفیف سی آھٹ ۔ چلنے میں زیور کے بجنے کی ھلکی آواز کو بھی کہتے ھیں (جس سے سننے والے کے دل میں عجیب سے خیالات پیدا ھوتے ھیں)*۔ دل میں مختلف قسم کے خیالات گذرنے کو بھی کہتے ھیں ۔ نیز ھر غیر واضح کلام کو جس میں مختلف آوازیں مل گئی ھوں ۔ نیز ایسی گفتگو کو جو بغیر نظم و ترتیب کے ھو* ۔ راغب نے الوَسْوَسَۃُ کے معنے برے خیال کا دل میں گذرنا لکھے ھیں ۔

قرآن کریم میں ھے فَوَسْوَسَ لَھُمَا الشَّیْطَانُ (۷/۲۰) ۔ "پھر شیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا"۔ اس سے مراد وہ خیالات ھیں جو خود غرضی کے جذبات انسان کے دل میں پیدا کرتے ھیں ۔ یا جنھیں شرپسند لوگ کسی کے دل میں پیدا کریں ۔ اَلْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ (۱۱۴/۴-۵) ۔ وہ جو دبے پاؤں آکر چپکے سے لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال دیتا ھے ۔ ایسے لوگ اسلامی معاشرہ میں فتنہ و فساد پیدا کرنے کا موجب بنتے ھیں ۔ ان سے محتاط اور محفوظ رھنے کی سخت تاکید کی گئی ھے ۔

و ش ی

اَلْوَشْیُ ۔ کپڑے پر (مختلف رنگوں سے) نقش و نگار بنانا ۔ یہ اس کے بنیادی معنی ھیں** ۔ راغب نے لکھا ھے کہ اس کے معنے کسی چیز میں اس کے تمام رنگ کے خلاف کوئی رنگ لگانا ھیں***۔ اسکے بعد یہ لفظ رنگ آمیزی کے معنوں میں استعمال ھونے لگا ۔ چنانچہ کہتے ھیں وَشَی النَّمَّامُ کَلَامَہٗ ۔ چغلخور نے اپنی بات میں جھوٹ بول کر رنگ آمیزی کی**۔ قرآن کریم میں بنی اسرائیل کی گائے کے متعلق ھے ۔ مُسَلَّمَۃٌ لَاشِیَۃَ فِیْھَا (۲/۷۱) ۔ وہ بالکل صحیح اور سالم ھے اور اس پر کوئی داغ نہیں ھے ۔ یعنی کسی ایسے رنگ کا نشان نہیں جو اسکے سارے بدن کے رنگ کے خلاف ھو ۔

و ص ب

وَصَبَ یَصِبُ ۔ وُصُوْبًا ۔ کسی چیز کا دائم اور ثابت رھنا ۔ اَوْصَبَ کے بھی یہی معنی ھیں ۔ (یہ متعدی بھی ھو جاتا ھے) ۔ وَصَبَ عَلَی الْاَمْرِ ۔ اس نے اس بات پر مداومت کی اور حسن کارانہ اسے انجام دیا ۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔

مَفَازَۃٌ وَاصِبَۃٌ - بہت ہی لمبا چوڑا لق و دق بیابان جسکی انتہا نہ ہو۔ اَلْوَصَبُ - ہمیشہ رہنے والی بیماری۔ اسی سے اَلْاَوْصَابُ بیماریوں کو کہتے ہیں* -

قرآن کریم میں ہے - وَ لَہُ الدِّیْنُ وَاصِبًا (۱۶/۵۲) - کائنات کی ہر شے خدا کی فرمان پذیری کر رہی ہے اور ایسا مداومت سے ہو رہا ہے - مسلسل و پیہم ایسا ہو رہا ہے - (انسان کے لئے بھی ایسا کرنا ضروری ہے) - دوسری جگہ ہے وَ لَہُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ (۳۷/۹) - لازم ہو جانے والا عذاب -

و ص د

اَلْوَصِیْدُ - صحن ، آنگن - دروازے کی چوکھٹ - پتھروں سے بنایا ہوا احاطہ ، جو اونٹوں کے لئے پہاڑ میں بنا لیا جاتا ہے* - سورۃ کہف میں ہے کہ ان کا کتا اپنے ہاتھ پھیلائے وَصِیْدُ میں رہتا تھا (۱۸/۱۸)- اسکے معنی غار کے صحن یا دروازے کی چوکھٹ کے ہیں - چوکھٹ سے مفہوم زیادہ واضح ہو جاتا ہے - اَوْصَدَ الْبَابَ وَ اَصَدَہٗ کے معنی ہیں اس نے دروازہ بند کر دیا - اَوْصَدَ الْقِدْرَ - اس نے ہانڈی کو ڈھانپ دیا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے کے ہیں -

[اِنَّھَا عَلَیْھِمْ مُّؤْصَدَۃٌ (۱۰۴/۸) کے لئے دیکھئے عنوان أ - ص - د]

و ص ف

وَصَفَ الشَّیْءَ یَصِفُہٗ وَصْفًا - کسی چیز کا حلیہ اور کیفیت بیان کرنا - اَلصِّفَۃُ - کسی چیز کی حالت - کیفیت** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا حلیہ بیان کرنے کے ہیں۔ نیز الصِّفَۃُ کے معنے ہیں وہ علامت جو کسی چیز سے مستقل لگی رہے -

خدا کو دنیا میں قریب قریب ہر شخص مانتا ہے - لیکن جس جگہ پہنچ کر اختلاف پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا ہے کیسا؟ کوئی انسان اپنی عقل کی رو سے یہ نہیں جان سکتا کہ خدا کیسا ہے - اس لئے کہ خدا انسانی عقل کی حد سے ماوراء ہے - لہذا خدا کے متعلق صرف وہی بات یقینی طور پر صحیح ہوسکتی ہے جسے خود خدا بتائے - اور اس کا ذریعہ وحی کے سوا اور کچھ

---

*تاج و راغب - **تاج -

نہیں ۔ اور وحی اب آخری شکل میں قرآن کریم کے اندر ہے ۔ لہذا خدا کا صحیح تصور وہی ہے جسے قرآن کریم پیش کرتا ہے ۔ جو تصور اس تصور کے خلاف ہوگا وہ غلط ہوگا ، اور خدا کی طرف اس کا انتساب باطل ۔ چنانچہ اس قسم کے (ذہن انسانی کے پیدا کردہ) تصورات کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کریم کہہ دیتا ہے کہ سُبْحَانَـهٗ وَ تَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ (۶/۱۰۱)۔ خدا کے متعلق جو تصور یہ لوگ پیش کرتے ہیں وہ اس سے بہت دور اور بلند ہے ۔ وہ اس سے مبرا اور منزہ ہے ۔

یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم ان لوگوں کو بھی ”خدا پر ایمان“ لانے کی دعوت دیتا ہے جو خدا کو مانتے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم خدا کے متعلق صحیح صحیح تصور رکھو ۔ اور یہ تصور وہی ہوسکتا ہے جسے خدا نے خود قرآن کریم میں پیش کیا ہے ۔ یہ اس کی صفات یا اَلْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی ہیں ۔ بالفاظ دیگر ، خدا کی ذات کے متعلق ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ کوئی محدود (Finite) لا محدود (Infinite) کو حیطۂ ادراک میں لا نہیں سکتا ۔ اسی لئے خدا نے صرف اپنی صفات بیان کی ہیں ۔ اور انہی صفات سے ہم اس کے متعلق اندازہ کر سکتے ہیں ۔ خدا ، علیم ہے ۔ خبیر ہے ۔ بصیر ہے (وغیرہ) لیکن خود خدا ، جو علیم و خبیر و بصیر ہے ، ہے کیا ؟ ہم اس کے متعلق نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں ، نہ سمجھا سکتے ہیں ۔

و ص ل

وَصْلٌ ۔ ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا ۔ جوڑ دینا ۔ (فصل اور قطع کی ضد) ۔ اَوْصَلَہٗ اِیْصَالاً ۔ اس کو اس تک پہنچا دیا ، یا اس کے ساتھ ملا دیا ۔ قَطْعٌ کے مقابلہ میں اِیْصَالٌ قرآن کریم میں (۲/۲۷) میں آیا ہے ۔ وَصَلَ الشَّیْئَ یا اِلَی الشَّیْئِ ۔ اس چیز کی طرف پہنچ گیا ۔ قَطَعَ الرَّحِیْمَ کے مقابلہ میں وَصَلَ فُلَانٌ رَحِمَہٗ بولتے ہیں*۔ (قطع رحم کے لئے دیکھئے عنوان ق ۔ ط ۔ ع) ۔

اَلْوَصِیْلَۃُ (۵/۱۰۳) ۔ وہ بکری جو لگاتار سات بطن میں دو دو مادہ بچے دے اور ساتویں بطن میں ایک نر اور ایک مادہ بچہ دے ۔ جاہلیت عرب میں اس نر بچہ کو ذبح نہیں کرتے تھے اور اس بکری کے دودھ کو عورتیں نہیں پیتی تھیں ۔ اس بکری کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا* ۔ (بعض

*تاج ۔

ائمہ لغت نے اس بکری کا تعارف اور طرح سے بھی کرایا ہے۔ بعض نے بکری کے بجائے اونٹنی بھی بتایا ہے* ۔ بہرحال اس سے مقصود ان توہمات کا ذکر کرنا ہے جو اسلام سے پہلے وہاں رائج تھے ۔

ہمارے ہاں کسی بزرگ کی وفات پر عام طور پر کہتے ہیں کہ ان کا ''وصال'' ہوگیا ۔ یہ تصور ہندوؤں کے تصوف (ویدانت) سے آیا ہے جس کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ انسانی روح خدا کی روح کا ایک جزو ہے جو بدقسمتی سے مادی جسم کے جیل خانے میں محبوس ہوگئی ہے ۔ اس جسم سے علیحدگی کے بعد یہ جزو اپنے کل سے جا کر مل جائے گا ۔ اس ملاپ کے لئے وصال کا لفظ بولا جاتا ہے ۔ یعنی فلاں واصل بالحق ہوگیا ۔ خدا کے ساتھ مل گیا ۔ وحدت وجود کے مسلک کی یہی تعلیم ہے ۔ یہ تمام تصورات غیر قرآنی ہیں ۔ اسی طرح ''عرس'' کا تصور ہے جو عیسائیوں کے مسلک خانقاہیت سے آیا ہے ۔ اس کے معنی شادی کرنے کے ہوتے ہیں ۔ عیسائیوں میں راہبہ عورتوں (Nuns) کے متعلق یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ان کی شادی ان کے خدا (یسوع مسیح) سے ہو چکی ہوتی ہے ۔ اور وہ گویا خدا کی عروس (دلہن) ہیں ۔ یہی تصور ہمارے تصوف میں آگیا جہاں یہ سمجھ لیا گیا کہ ''اللہ والے'' کی وفات کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کی شادی (عرس) خدا سے ہوگئی ۔ یعنی خدا سے اس کا وصال ہوگیا ۔ یہ سب تصورات غیر قرآنی ہیں ۔

و ص ی

وَصِیَ الشَّیْئُ بِہٖ وَصْیًا ۔ متصل ہوجانا ۔ مل جانا ۔ وَصَاہُ بِہٖ یَصِیْہٖ ۔ اسے اس سے ملا دینا ۔ (لازم و متعدی) ۔ وَصِیَ النَّبْتُ ۔ پودے گتھ گئے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے ۔ اَرْضٌ وَاصِیَۃٌ ۔ وہ زمین جس کے پودے قریب قریب ، اور باہم گتھے ہوئے ہوں ۔ فَلَاۃٌ وَاصِیَۃٌ ۔ وہ بیابان جو دوسرے بیابان سے ملا ہوا ہو***۔

اس سے راغب نے کہا ہے کہ اَلْوَصِیَّۃُ کے معنے ہیں کسی واقعہ کے پیش آنے سے پہلے کسی کو ایسی ہدایات دینا جن میں نصیحت بھی شامل ہو** ۔ امر و حکم اور فریضہ کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔ اسی سے اَوْصیٰ یُوْصِیْ کے معنے واجب قرار دینے ، معاملہ سونپ دینے کے آتے ہیں ۔ نیز اَوْصیٰ وَ وَصّٰی کے معنے عہد و پیمان کرنے کے آتے ہیں ۔ اور کسی کو (اپنے مرنے کے بعد) کسی چیز کا مالک بنا دینے کے***۔ اَلْوَصِیُّ ۔ وصیت کرنے والا ۔ نیز جسے وصیت کی گئی ہو (اس کے دونوں معنی آتے ہیں) ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔ ***تاج و محیط

قرآن کریم میں ہے وَ وَصّٰی بِھَآ اِبْرٰھِیْمُ بَنِیْہِ (۲/۱۳۲) ۔ ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اس کا حکم دیا ۔ اس بات کو مسلسل ان تک آگے بڑھا دیا ۔ سورۃ نساء میں ہے ۔ یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ (۴/۱۱) ۔ اللہ اولاد کے بارے میں تمہیں حکم دیتا ہے ۔ سورۃ یٰسٓ میں تَوْصِیَۃً کا لفظ آیا ہے (۳۶/۵۰)۔ سورۃ العصر میں جماعت مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳/۳) ۔ اس کے عام معنے تو یہی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو حق و استقامت کی تلقین و تاکید کرتے ہیں لیکن اس مادہ کے بنیادی معانی کے لحاظ سے اس میں یہ پہلو بھی مضمر ہے کہ وہ حق و استقامت کی بنا پر ایک دوسرے سے ملے ہوئے رہتے ہیں ۔ ان میں باہمی ربط و ضبط کا ذریعہ حق و استقامت ہے۔ ان کی وجہِ جامعیت قوانین خداوندی کی رُو سے تعمیری نظام پر ثابت قدم رہنا ہے ۔

مُوْصٍ ۔ وصیت کرنے والا (۲/۱۸۲) ۔

قرآن کریم میں ہے کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَکَ خَیْرَا نِ الْوَصِیَّۃُ لِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۔ حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ (۲/۱۸۰) ۔ ”تم میں سے جس کے سامنے موت آ موجود ہو ۔ اور وہ مال چھوڑے ۔ اس پر فرض قرار دے دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ اور دیگر اقربا کے لئے قاعدے کے مطابق وصیت کرے ایسا کرنا متقیوں کے لئے لازم ہے“۔ اس سے واضح ہے کہ ترکہ کے لئے ماں باپ اور دیگر اقرباء کے لئے وصیت کرنا خدا کی طرف سے فرض قرار دیا گیا ہے ۔ لیکن اگر ایسی صورت پیش آجائے کہ کوئی وصیت نہ کرسکے ۔ یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہو (Cover نہ کرے) ۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے وارثین کے لئے خود حصے مقرر کر دئے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان حصوں کو بیان کرتے وقت قرآن کریم میں بار بار آیا ہے کہ مِنْ بَعْدِ وَصِیَّۃٍ یُّوْصِیْ بِھَآ اَوْ دَیْنٍ (۴/۱۱۔۱۲) ۔ ”وصیت جو اس نے کی ہو اس کے بعد ۔ یا قرضے کی ادائیگی کے بعد“ ۔ یہ حکم اس قدر صاف اور واضح ہے کہ اس میں کسی قسم کی تاویل و تفسیر کی گنجائش نہیں ۔ لیکن ہمارے ہاں کہا یہ جاتا ہے کہ وصیت صرف ایک تہائی (۱/۳) مال میں کی جاسکتی ہے اور وہ بھی وارثوں کے لئے نہیں ۔ اس کی سند میں ایک روایت پیش کی جاتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہوسکتی ، اس لئے کہ رسول اللہؐ کا کوئی ارشاد قرآن کریم کے خلاف ہو نہیں سکتا ۔ لیکن اس روایت کو صحیح قرار دینے کے لئے کہا جاتا ہے کہ حدیث قرآن کریم کو منسوخ کرسکتی ہے ۔ اس لئے اس حدیث نے قرآن کریم کی آیت کو منسوخ کر دیا ہے ۔ اس قسم کے عقیدے کے

متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ خدا ہماری حالت پر رحم کرے ۔ یاد رکھئے ۔ قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ۔ اس کی کسی آیت کو نہ کوئی دوسری آیت منسوخ کرتی ہے نہ قرآن کریم سے باہر کوئی اور چیز منسوخ کرسکتی ہے ۔ خدا کے کلام کا ایک ایک لفظ اپنے مقام پر محکم ہے ۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ن ۔ س ۔ خ) ۔ لیکن اگر رسول اللہ نے ایسی بات کہی بھی ہو تو ہو سکتا ہے کہ حضور نے کسی صحابی کے مخصوص حالات کے پیش نظر یہ مشورہ دیا ہو کہ وہ اپنے مال کے ایک تہائی حصہ سے متعلق فلاں کے حق میں وصیت کردے ۔ اس صورت میں یہ چیز دائمی حکم کی حیثیت نہیں رکھیگی ۔ محض وقتی مشورہ ہوگا ۔

یہ بھی واضح رہے کہ وصیت اور وراثت کے احکام اسی وقت نافذ العمل ہوں گے جب افراد کے پاس فاضلہ دولت ہوگی ۔ جب معاشرہ ایسا قائم ہوجائے جس میں ہر فرد اپنی فاضلہ دولت کو قرآن کریم کے حکم کے مطابق قرآنی نظام کے حوالے کردے ۔ (دیکھئے عنوان ع ۔ ف ۔ و) تو اس وقت ترکہ کی تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا ۔ چنانچہ خود نبی اکرم نے ایسا ہی کیا تھا ۔ نہ حضور نے زائد از ضرورت دولت اپنے پاس رکھی ، نہ ترکہ چھوڑا ۔ نہ جائداد بنائی ، نہ وہ وراثت میں کسی کی طرف منتقل ہوئی ۔ اسطرح آپ پر ترکہ اور وراثت کے احکام عائد نہیں ہوئے ۔ یہی کیفیت تمام مومنین کی اس وقت ہوگی جب قرآنی نظام ربوبیت قائم ہوگا ۔ اس وقت تک قرآن کریم کی رو سے ہر مومن پر، جو کچھ مال چھوڑے ، وصیت کرنا فرض ہے ۔ اور وصیت کے معاملہ میں اسے پورا پورا اختیار حاصل ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے معاملات کو فرد متعلقہ سب سے بہتر سمجھ سکتا ہے ۔ ایک شخص نے اپنے بڑے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلائی ۔ ولایت بھیجا ۔ بیرسٹر کرایا ۔ وہ اب بڑا امیر اور خوش حال ہے ۔ دوسرا بیٹا حال ہی میں پیدا ہوا ہے ۔ اس کی پرورش ، تعلیم، تربیت وغیرہ کے تمام اخراجات باقی ہیں ۔ یہ شخص اپنی وصیت کی رو سے اپنا پورا ترکہ اس نوزائیدہ بچے کو دے سکتا ہے ۔ لیکن اگر اسے حق وصیت نہ دیا جائے تو اس کے ترکہ کا آدھا حصہ بڑا بیٹا لے جائیگا ۔ وصیت کے متعلق اس انفرادی حق کے بعد ، قرآن کریم نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی وصیت میں بکسر ظلم اور جانبداری سے کام لے تو معاشرہ (عدالت) کو اختیار ہے کہ عدل و انصاف کے مطابق ، وارثین میں مصالحت کی صورت پیدا کردے ($\frac{۲}{۱۸۲}$) ۔ وصیت کو قرآن کریم نے اتنی اہمیت دی ہے کہ سورۃ المائدہ میں اس کے لئے شہادت کا تفصیلی طریقہ بھی خود ہی بیان کر دیا ہے ۔ ($\frac{۵}{۱۰۶}$)

و ض ع

وَضَعَ الشَّیْءَ مِنْ یَدِہٖ یَضَعُہٗ۔ اس نے کسی چیز کو ھاتھ سے گرا دیا۔ نیچے رکھ دیا*۔ وَضَعَ الشَّیْءَ فِی الْمَکَانِ۔ کسی چیز کو کسی جگہ رکھ دیا*۔ سورۃ کہف میں ہے وُضِعَ الْکِتَابُ (۱۸/۴۹)۔ سورۃ رحمٰن میں ہے۔ وَضَعَ الْمِیْزَانَ (۵۵/۷)۔ وضع حمل کے لئے یہ لفظ (۳/۳۵) میں آیا ہے۔ وَضَعَ عَنْہُ (۹۴/۲)۔ دور کر دینا۔ ھٹا دینا۔ گرا دینا۔ وَضْعُ ثِیَابٍ۔ کپڑے اتار کر رکھ دینا۔ (۲۴/۶۰)۔ مَوْضِعٌ جمع مَوَاضِعُ۔ جگہیں۔ موقعے۔ (۴/۴۶)۔ مَوْضُوْعَۃٌ۔ رکھے ہوئے (۸۸/۱۴)۔

وَضَعَتِ النَّاقَۃُ۔ اونٹنی تیز رفتاری سے چلی۔ وَضَعَ الرَّجُلُ۔ آدمی دوڑا۔ اَوْضَعْتُہٗ۔ میں نے اسے دوڑایا*۔ سورۃ توبہ میں ہے۔ وَلَاَوْضَعُوْا خِلٰلَکُمْ (۹/۴۷)۔ وہ (فتنہ پیدا کرنے کے لئے) تمہارے اندر تگ و تاز کرتے۔ سرگرم عمل رہتے۔ بھاگ دوڑ کرتے۔

و ض ن

وَضَنَہٗ۔ اس نے اسے ترتیب وار، ایک دوسرے کے اوپر تلے رکھ دیا۔ اَلْمَوْضُوْنَۃُ۔ بنی ہوئی زرہ۔ یعنی جس کے حلقے ایک دوسرے میں ترتیب وار پڑے ہوں۔ یا وہ چیز جس میں جواھرات ٹانکے گئے ہوں۔ یا وہ چیز جسے تہ بہ تہ جما کر رکھا گیا ہو۔ چنانچہ سَرِیْرٌ مَوْضُوْنٌ۔ دھرے بنے ہوئے پلنگ کو کہتے ہیں**۔

قرآن کریم میں سُرُرٍ مَوْضُوْنَۃٍ (۵۶/۱۵) آیا ہے۔ یعنی دھرے اور مضبوط بنے ہوئے پلنگ۔ یا جواھرات سے مرصع پلنگ۔

و ط أ

وَطِئَہٗ یَطَؤُہٗ وَطْأً۔ پاؤں سے کسی چیز کو روندنا۔ وَطِیَٔ الْمَرْاَۃَ یَطَؤُھَا۔ عورت سے وطی (جماع) کرنا۔ وَطُؤَ یَوْطُؤُ۔ نرم اور سہل ہونا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کو دبا کر پھیلانے اور ھموار کرنے کے ہیں۔ سورۃ فتح میں ہے۔ لَمْ تَعْلَمُوْھُمْ اَنْ تَطَئُوْھُمْ (۴۸/۲۵)۔ جنہیں تم لاعلمی میں پامال کر دیتے۔

---

*تاج و راغب۔ **تاج و راغب و محیط۔

وَ اَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا (۳۳/۲۷) ۔ ایسی زمینیں جنہیں تم نے اپنے پاؤں سے نہیں روندا ۔ ان تک ہنوز تمہارے قدم نہیں پہنچے ۔ اَلْمَوْطَأُ وَ الْمَوْطِیُٔ ۔ قدم رکھنے کی جگہ* ۔ وَ لَا یَطَئُوْنَ مَوْطِئًا (۹/۱۲۰) ۔ نہ وہ کسی ایسی سرزمین پر چلتے ہیں ۔ مُوَاطَاَۃٌ* ۔ دراصل یہ کسی کے قدم پر قدم رکھنے کو کہتے ہیں ۔ رَجُلٌ مُوَطَّأُ الْعَقِبِ ۔ وہ شخص جس کی پیروی اور اتباع کی جاتی ہو* ۔ اس سے مُوَاطَاَۃٌ* کے معنی موافقت اور مطابقت کرنے کے آتے ہیں* ۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں ہے ۔ لِیُوَاطِئُوْا عِدَّۃَ (۹/۳۷) ۔ تاکہ اس طرح وہ اسے (مہینوں کی) گنتی کے مطابق کرلیں ۔ سورۃ مزمل میں ہے ۔ اِنَّ نَاشِئَۃَ اللَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْاً (۷۳/۵) ۔ رات کے وقت اپنی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے اٹھنا ، سرکش جذبات کو بہت زیادہ مغلوب کر دیتا ہے ۔ یا انسان کی قوتِ عمل اس کے ارادوں اور فیصلوں کا مَرْکَبٌ بن جاتی ہے (کیونکہ وَطَاَ الْفَرَسَ کے معنے ہیں وہ گھوڑے پر سوار ہوا) ** ۔ یہ نبی اکرمؐ کی اس جد و جہد کا بیان ہے جب حضورؐ (نظام خداوندی کے ابتدائی مراحل میں) دن رات مصروفِ کار رہتے تھے ۔ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے رات کا آرام بھی قربان کر دینا ، انسانی جذبات کو کنٹرول میں رکھنے کی واضح شہادت ہے ، بالخصوص جب یہ قربانی اپنے کسی ذاتی مفاد کے لئے نہ ہو ، بلکہ نوع انسان کی نجات و سعادت اور فلاح و بہبود کے لئے ہو ۔

و ط ر

اَلْوَطَرُ ۔ حاجت ۔ ایسی ضرورت جس کے پورا کرنے کی فکر اور خاص اہتمام ہو*** ۔ اہم ضرورت**** ۔

قرآن کریم میں "قضائے وطر" (۳۳/۳۷) میں آیا ہے جس کے معنے ضرورت پورا کرلینا ہیں ۔ یعنی قطعِ تعلق کر لینا ۔ یا وظیفۂ ازدواج کی خواہش و ضرورت کو پورا کرلینا ۔ یعنی یہ فیصلہ کرلینا کہ اب اسے اس کی ضرورت نہیں رہی ۔ اسی کو قطع تعلق کا فیصلہ کہینگے ۔

و ط ن

اَلْوَطَنُ ۔ انسان کے رہنے اور بسنے کی جگہ ۔ اقامت گاہ ۔ مجازاً بیل اور بکریاں باندھنے کی جگہ کو بھی کہہ دیتے ہیں ۔ وَطَنَ بِہٖ ۔ یَطِنُ ۔ اَوْطَنَ ۔ قیام کرنا ۔ اِسْتَوْطَنَہٗ وَ اتَّطَنَہٗ وَ تَوَطَّنَہٗ وَ تَوَطَّنَ بِہٖ ۔ اس نے اُس جگہ کو وطن بنا لیا ۔ اَلْمَوَاطِنُ مِنَ الْحَرْبِ ۔ جنگ کے میدان*** ۔

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔ ***تاج و محیط ۔ ****راغب ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معنوں میں آیا ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے۔ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ (۹/۲۵)۔ "یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے بہت سے جنگ کے میدانوں میں تمہاری مدد کی"۔

و ع د

وَعَدَ۔ یَعِدُ۔ وَعْدًا وَعِدَةً۔ کوئی وعدہ کرنا۔ خواہ اچھی بات کا ہو یا بری بات کا۔ اگر وَعَدَ کے ساتھ خیر یا شر کا ذکر نہ کیا جائے تو خیر کے لئے وَعَدَ کہتے ہیں اور شر کے لئے اَوْعَدَ (لطائف اللغۃ)۔ اَلْمِیْعَادُ۔ وعدہ کا زمانہ یا مقام*۔ مَوْعِدٌ کے معنی وعدہ اور عہد کے آتے ہیں، نیز وعدہ گاہ، وعدہ کا وقت*۔ سورۃ کہف میں یہ لفظ "وعدہ پورا ہونے کے وقت" کے لئے آیا ہے (۱۸/۵۸)۔

اَلْوَعِیْدُ۔ حملہ کے وقت نر اونٹ کا بڑبڑانا۔ یہ لفظ ہر دھمکی اور تہدید کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اَوْعَدَهٗ اور تَوَعَّدَهٗ کسی کو دھمکانا۔ ڈراوا دینا*۔

سورۃ بقرہ میں ہے وَاعَدْنَا مُوْسٰی (۲/۵۱)۔ اس میں اللہ کی طرف سے وقت مقرر کرنا اور حضرت موسیٰ کی طرف سے اس کا قبول کرنا اور اتباع کرنا دونوں شامل ہیں۔ اسی لئے یہ باب مُفَاعَلَةٌ سے آیا ہے۔ ویسے مُوَاعَدَةٌ کے معنی باہمی عہد و پیمان کرنے کے ہیں۔

خدا کے وعدوں سے مراد ہیں وہ نتائج جو اس کے قوانین پر عمل کرنے سے مرتب ہوتے ہیں اور جن میں کبھی خطا نہیں ہوتی۔ اسی طرح ان قوانین سے سرکشی برتنے کے نتائج وعید ہیں۔

قرآن کریم میں اعمالِ صالحہ کے خوشگوار نتائج کے لئے بھی وَعَدَ کا لفظ آیا ہے (۲۴/۵۵)۔ اور غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج کے لئے بھی (۹/۶۸)۔

سورۃ توبہ میں ہے اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَا اِیَّاهُ (۹/۱۱۴)۔ "(یہ) صرف ایک وعدہ کی وجہ سے تھا جو اس نے اس سے کیا تھا"۔

واضح رہے کہ قرآن کریم میں جہاں یہ آئے گا کہ خدا تم سے اس بات کا وعدہ کرتا ہے۔ یا خدا نے اس کا وعدہ کیا تھا۔ تو اس کے معنی یہ

*تاج و محیط۔

ہوں گے کہ خدا کے قانون پر عمل کرنے کا لازمی طور پر یہ نتیجہ ہوگا۔ گویا "اپنے وعدہ" سے خدا، اپنے قانون اور اس قانون کے فطری اور حتمی نتیجہ کا اظہار کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ جسطرح ہم ایک دوسرے سے کسی بات کا وعدہ کرتے ہیں اسی طرح خدا بھی انسانوں سے وعدہ کرتا ہے۔ اسی سے یہ بھی واضح ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ "خدا کے وعدے سچے ہیں" تو اس کا مطلب بھی یہی ہوگا کہ قوانین خداوندی اپنے ٹھیک نتائج پیدا کرکے رہتے ہیں۔ ان میں کبھی خلاف ورزی نہیں ہوسکتی۔

و ع ظ

وَعَظَ کے معنی ہیں کسی کو کسی کام کے اچھے انجام اور مضر عواقب و نتائج سے آگاہ کرکے اس کے دل کو نرم کرنا۔ ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے کہا ہے کہ اَلْوَعْظُ کہتے ہیں انذار و تخویف کو۔ نیز اس طرح خیر کی باتیں بیان کرنا جس سے دل میں نرمی پیدا ہو جائے۔ صاحب محیط کے نزدیک اس کے معنی محض " وعظ کہنے " کے نہیں بلکہ حکم دینے کے ہیں۔ یعنی کسی کو کسی ایسی بات سے حکماً روک دینا جسکا انجام خراب ہو*۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ ایسی زجرو توبیخ کو کہتے ہیں جس میں ڈراوا بھی شامل ہو**۔ قرآن کریم میں مَوْعِظَۃٌ کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے۔ حتی کہ خود قرآن کریم کو بھی مَوْعِظَۃٌ مِنْ رَّبِّکُمْ (۱۰/۵۷) کہا ہے۔ اس میں دونوں باتیں آجاتی ہیں۔ یعنی دوسروں کو غلط روش زندگی کے انجام و عواقب سے متنبہ کرکے، اُس سے روکنا۔ اور (نظام کے اندر) افراد کو غلط کاموں سے حکماً (بذریعہ قانون) روکنا۔ چنانچہ سورہ نحل میں ہے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ .... یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (۱۶/۹۰)۔ اس میں پہلے امر کا لفظ آیا ہے۔ یعنی اللہ تمہیں عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔ اور آخر میں یَعِظُکُمْ ہے۔ لہذا مومنین کے لئے خدا کا امر اور وعظ ایک ہی بات ہے۔ اس مقام پر یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ خدا کا حکم، کسی ڈکٹیٹر کا مستبدانہ حکم نہیں ہوتا۔ وہ حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اسکی حکمت، علت غائی، مقصد، فائدہ بھی بتاتا ہے۔ حکم اور حکمت کے اس مجموعہ کا نام وعظ ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں ہے وَمَا اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنَ الْکِتَابِ وَالْحِکْمَۃِ یَعِظُکُمْ بِہٖ (۲/۲۳۱)۔ خدا نے جو کتاب و حکمت (قرآن کریم) کو نازل کیا ہے جس کے ذریعے وہ تمہیں غلط کاموں کے انجام سے ڈراتا ہے۔ یہ متقین

*تاج و محیط اور لین۔ **راغب

کے لئے مَوْعِظَۃٌ ہے (۲/۶۶) - ویسے اس کے ذریعے متنبہ ہر ایک کو کیا جائیگا - چنانچہ منافقین کے متعلق ہے فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ (۴/۶۳) - ان سے اعراض کر اور انہیں ان کی غلط روش کے عواقب سے متنبہ کرتا رہ ، بڑے دلنشیں انداز سے (۴/۶۳) - لہذا غیر مسلموں کے لئے دین کی طرف دعوت کے سلسلے میں '' وعظ'' پندو نصائح کے مرادف ہوگا ، اور مسلمانوں کے لئے قرآنی احکام اور ان کے نظام کی طرف سے جاری کردہ ہدایات جن کے مقاصد و فوائد کو اس انداز سے سمجھایا گیا ہو کہ اس سے دل میں لینت و رقت پیدا ہو جائے اور وہ اسطرح ان پر عمل پیرا رہیں -

و ع ی

وَعَاہُ یَعِیْہِ وَعْیاً - نیز اَوْعَی یُوْعِیْ - اِیْتِعَاءٌ - کسی چیز کو محفوظ کر لینا - یاد کر لینا - حفظ کر لینا - کسی چیز کو برتن میں جمع کر لینا*- بالعموم وعٰی باتوں وغیرہ کو یاد کرنے اور محفوظ کرنے کے لئے آتا ہے اور اَوْعٰی اشیاء اور ساز وسامان کو محفوظ رکھنے کے لئے**- اَلْوِعَاءُ (جمع اَوْعِیَۃٌ) وہ چیز (برتن - تھیلا - بوری وغیرہ) جسمیں دوسری چیزیں اکٹھی کرکے رکھی جائیں (۱۲/۷۶) - سورہ معارج میں سرمایہ دارانہ ذہنیت والے کے متعلق ہے وَجَمَعَ فَاَوْعٰی (۷۰/۱۹) - وہ مال جمع کرتا ہے اور پھر اسے بند کرکے رکھ لیتا ہے - سورہ انشقاق میں ہے وَاللہُ اَعْلَمُ بِمَا یُوْعُوْنَ (۸۴/۲۳) - اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ لوگ اسطرح جمع کرکے بند رکھتے ہیں - اُذُنٌ وَاعِیَۃٌ بات کو محفوظ رکھنے والا کان - یعنی جس کان میں جو کچھ پڑے پھر وہ اسے باہر نہ نکالے اور اس پر غور و فکر بھی کرے*- سورہ حاقہ میں ہے وَتَعِیَھَا اُذُنٌ وَّاعِیَۃٌ (۶۹/۱۲) - '' اور یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں'' -

و ف د

اَلْوَفْدُ - ریت کے اوپر سے جھکے ہوئے ٹیلے کی چوٹی - ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی جھانکنے اور نکلنے کے ہیں - اَلْوَافِدُ - سب سے آگے نکل جانے والا (اونٹ) - اَلْاِیْفَادُ - کسی چیز کا بلند ہونا اور اوپر سے جھکنا - تیز چلنا - جلدی کرنا - ھُمْ عَلٰی اَوْفَادٍ - وہ لوگ سفر پر ہیں - الاِیْفَادُ - کسی کو کسی کے پاس ایلچی بنا کر بھیجنا -

*تاج و محیط - **راغب و ابن فارس -

وَفَدَ فُلَانٌ - وہ کسی بادشاہ یا امیر کے پاس (ایلچی بنکر) پہنچا - اَوْفَدَهُ عَلَيْهِ - اس نے اسے اس کے پاس ایلچی بنا کر بھیجا - وُفُوْدٌ - بڑے لوگوں کے پاس عطایا لینے کے لئے جانا* - اَلْوَفْدُ - وہ لوگ جو فتح کے جشن پر مبارکباد دینے کے لئے یا کسی اور موقعہ پر بادشاہ کے دربار میں پہنچیں** - راغب نے کہا ہے کہ اَلْوَفْدُ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے بادشاہوں کے پاس جائیں*** -

سورہ مریم میں ہے يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا (۱۹/۸۵) - جس دن ہم متقیوں کو رحمٰن کے پاس بطور وَفْد اکٹھا کرینگے - اوپر دئے ہوئے معانی کے لحاظ سے وَفْدًا کے اندر بلندی اور عظمت، قرب اور مسابقت، عزت اور برگزیدگی، حصول عطایا و نوازشات اور وصول سامانِ نشو و نما سب کچھ آجاتا ہے - یہ ہے متقین کے اعمال حیات کا نتیجہ اور اُن کا مقام - اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ متقین کو سب سے آگے رکھا جائیگا - اس میں بھی عزت اور برگزیدگی کا پہلو موجود ہے -

و ف ر

اَلْوَفْرُ مِنَ الْمَالِ وَالْمَتَاعِ - وسیع پیمانہ پر کثیر مال و اسباب جن میں کسی چیز کی کمی نہ ہو - وَفَرَ الْمَالُ - مال کثیر، باافراط اور پورا ہو گیا - اَرْضٌ وَفْرَاءُ - وہ زمین جس میں بکثرت پودے اور گھاس وغیرہ ہوں - وَفَّرَهُ تَوْفِيْرًا - اسنے اسکو بھرپور، کثیر اور مکمل کر دیا - اَلْوَفْرَاءُ - بھری ہوئی چیز - وہ پکھال جو پوری کھال سے بنائی گئی ہو - اَلْوَافِرَةُ - دنبہ کی بڑی چکتی (چکی) - اَلْمَوْفُوْرُ - ہر وہ چیز جو مکمل ہو چکی ہو**** - قرآن کریم میں ہے جَزَاءً مَّوْفُوْرًا - (۱۷/۶۳) - پورا پورا بدلہ - جسمیں سے کچھ کم نہ کیا گیا ہو -

و ف ض

وَفَضَ يَفِضُ وَفْضًا - وہ تیزی سے دوڑا - اِسْتَوْفَضَ - اسنے جلدی کی - نَاقَةٌ مِيْفَاضٌ - تیز رفتار اونٹنی - اصل میں اَلْاِيْفَاضُ کے معنی ترکش اٹھا کر تیزی سے بھاگنے کے ہیں - اسلئے کہ اَلْوَفْضَةُ چمڑے کا ترکش ہوتا ہے جسمیں لکڑی لگی ہوئی نہیں ہوتی - ویسے یہ اس تھیلے کو بھی کہتے ہیں جس میں چرواہا اپنا توشہ وغیرہ رکھتا ہے***** -

*تاج - **محیط - ***راغب - ****تاج و راغب و محیط - *****تاج و راغب -

قرآن کریم میں ہے۔ کَاَنَّهُمْ اِلٰی نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ (۷۰/۴۳)۔ گویا وہ کسی نشان (Goal) کیطرف بھاگے جارہے ہیں۔

و ف ق

اَلْوَفْقُ۔ دو چیزوں کے درمیان مطابقت اور ہم آہنگی ہونا۔ ضرورت کے مطابق ہونا*۔ اَوْفَقَتِ الْاِبِلُ۔ اونٹ سب برابر ہوئے اور ایک صف میں کھڑے ہوگئے*۔ اَلْاِتِّفَاقُ۔ انسان کے عمل کا اندازے اور پیمانے (تقدیر) کے مطابق ہو جانا***۔ اَلتَّوْفِیْقُ۔ اسباب کا مقصد کے مطابق کر دینا۔ حصول مقصد کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہے انہیں مہیا کر دینا**۔ موافقت پیدا کر دینا۔ وَفَّقَ بَیْنَ الْقَوْمِ۔ اس نے قوم کے درمیان صلح کرا دی**۔

سورہ نساء میں ہے کہ اگر میاں بیوی میں کشیدگی ہو جائے تو ان میں اصلاح کی کوشش کرو۔ یُوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَهُمَا (۴/۳۵)۔ اللہ ان میں موافقت پیدا کر دیگا۔ اعمال کے نتائج کو (سورہ النبأ میں) جَزَآءً وِّفَاقًا کہا گیا ہے (۷۸/۲۶)۔ یعنی عمل اور اس کے نتیجہ میں پوری پوری موافقت۔ (قرآن کریم کی رو سے جزا یا سزا خود عمل کے نتیجہ کا نام ہے)۔ سورہ ہود میں ہے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ (۱۱/۸۸)۔ میرے پیش نظر مقصد کے مطابق اسباب کا مل جانا، یا ان میں صحیح موافقت پیدا ہو جانا، قانون خداوندی کے مطابق ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا اسکی کوئی صورت نہیں۔ (۴/۶۲) میں تَوْفِیْقًا کے معنی سنوارنے اور سدھارنے کے ہیں۔ یعنی اصلاح۔ موافقت۔

و ف ی

وَفَی الشَّیْءُ وُفِیًّا۔ وہ چیز مکمل ہوگئی۔ پوری ہو گئی۔ کثیر ہو گئی۔ اسی سے وَفِیٌّ وَّ وَافٍ کے معنی ہیں مکمل اور کثیر۔ اَوْفَانِیْ حَقِّیْ۔ اس نے میرا حق پورا پورا دیدیا۔ اس میں کمی نہیں کی۔ یہی معنی وَفَّی کے بھی ہیں۔ یعنی پورا پورا دیدینا****۔ اِسْتَوْفٰی فُلَانٌ حَقَّهٗ۔ اس نے اپنا حق پورا پورا لے لیا۔ اَلْوَفِیُّ۔ وہ شخص جو پورا پورا حق ادا کرے۔ اور پورا پورا حق وصول کرے۔ نیز بہت وفاشعار۔ اَلْوَفَاءُ کے معنی ہیں وعدہ پورا کرنا۔ عہد و پیمان کا لحاظ کرنا اور پاس رکھنا۔ اَلْوَفَاةُ کے معنی ہیں موت، یعنی دنیا میں زندگی کے دن پورے کر لینا۔ تَوَفَّاهُ اللّٰہُ۔ خدا نے اسے وفات دیدی***۔ اَلْوَفْیُ۔ بلند زمین کو کہتے ہیں اور اَلْمُوَافِیْ اُس چیز کو جو آجائے یا اچانک نمودار ہو جائے****۔

*تاج۔ **محیط۔ ***راغب۔ ****تاج و محیط۔

قرآن کریم میں ایفائے عہد، نقض عہد کے مقابلہ میں آیا ہے (۱٦/۹۱)۔ اور (۳/۲۴) میں وُفِّیَتْ کے معنی لَا یُظْلَمُوْنَ نے کر دئے ہیں۔ یعنی کمی نہ ہونا۔ پورا پورا مل جانا۔ سورہ ہود میں ہے وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ غَیْرَ مَنْقُوْصٍ (۱۱/۱۰۹)۔ اس سے تَوْفِیَةٌ کے معنی واضح ہوجاتے ہیں۔ یعنی بلا کسی قسم کی کمی کئے پورا پورا دینا۔ سورہ نحل میں ہے وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰكُمْ وَمِنْكُمْ مَنْ يُّرَدُّ اِلٰى اَرْذَلِ الْعُمُرِ (۱٦/۷۰)۔ اس کے معنی ہیں، اللہ تمہیں پیدا کرتا ہے۔ پھر تمہاری جسمانی ساخت کو تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔ یعنی بھرپور جوانی تک پہنچا دیتا ہے جس میں تمام قویٰ اپنی تکمیل تک پہنچ جاتے ہیں۔ پھر تم میں سے بعض کو بڑھاپے کی عمر تک پہنچا دیتا ہے جس میں قویٰ میں ضعف اور اضمحلال آجاتا ہے۔ یہ معانی، انسان کی زندگی کے مختلف مراحل کی ترتیب کے اعتبار سے ہیں۔ یعنی پہلے پیدائش۔ پھر جوانی۔ پھر بڑھاپا۔ لیکن اگر يَتَوَفّٰكُمْ کے معنی "وفات دیتا ہے" کئے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ بعض لوگ بڑھاپے سے پہلے ہی وفات پا جاتے ہیں اور بعض بڑھاپے کی عمر تک پہنچتے ہیں۔

وفات کے معنوں میں سورہ انعام میں ہے حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا (٦/٦۱)۔ یہانتک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے فرستادے اُسے وفات دیدیتے ہیں۔ خدا کے قانون طبیعی کے مطابق اس کے زندگی کے دن پورے ہو جاتے ہیں۔ سورہ مائدہ میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ (۵/۱۱۷)۔ پھر جب تو نے مجھے وفات دیدی تو ان پر تو ہی نگہبان تھا۔

مُتَوَفٍّ۔ وفات دینے والا۔ اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ (۳/۵۴)۔ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ سے کہتے ہیں کہ یہ (مخالفین) اس قسم کی تدبیریں کر رہے ہیں کہ تجھے گرفتار کر کے سولی پر لٹکا دیں۔ لیکن ان کے خلاف ہم بھی ایک تدبیر کر رہے ہیں۔ اور ہماری تدبیر ان کی تدبیروں سے یقیناً بہتر ہے۔ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ۔ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ (۳/۵۴)۔ میری (یعنی اللہ کی) تدبیر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ لوگ تمہیں نہ گرفتار کرسکینگے نہ صلیب دے سکینگے۔ بلکہ تم اپنی طبعی موت مروگے (اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ)۔ یہ لوگ تمہیں صلیب دیکر دنیا کو بتانا چاہتے ہیں کہ تم (معاذ اللہ) لعنتی موت مرے۔ ہم تیرے مدارج کو بلند کرینگے (وَرَافِعُكَ اِلَيَّ)۔ اور یہ اسطرح سے ہوگا کہ ہم تجھے ان مخالفین کی دستبرد سے دور لے جائیں گے۔ (وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا)۔ (۳/۵۴)۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ قبل اس کے

کہ یہودی حضرت مسیحؑ پر ہاتھ ڈالتے ، آپ ایک سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے مطابق ، وہاں سے ہجرت کر چکے تھے - یہ تھی خدا کی تدبیر جو کامیاب ہوئی - (مزید تفصیل میری کتاب ''شعلہ مستور'' میں ملیگی) -

و ق ب

اَلْوَقْبُ - پہاڑ یا چٹان میں گڑھا ، جس میں پانی جمع ہو جائے - اَلْوَقْبَۃُ - ہموار میدان میں کنویں کی طرح ایک قدِ آدم یا دو قدِ آدم کے برابر گڑھا جس میں پانی جمع ہوجائے - پھر ہر گڑھے کے لئے بولا جانے لگا - اَلْوَقْبُ - کسی چیز کے اندر داخل ہو کر غائب ہو جانا - وَقَبَتِ الشَّمْسُ - سورج غروب ہو گیا - وَقَبَ الظَّلَامُ - تاریکی چھا گئی - یعنی لوگ اس کے اندر ڈوب کر غائب ہوگئے* - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا غائب ہونے کی جگہ غائب ہو جانا بتائے ہیں -

قرآن کریم میں ہے وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (۱۱۳/۳) - جب چاروں طرف سے تاریکیاں چھا جائیں - جب رات کی تاریکی میں آنے والی مصیبتیں گھیر لیں - (دیکھئے عنوان غ - س - ق) - لیکن مولانا عبید اللہ سندھی نے لکھا ہے کہ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کے معنے ہیں ''ڈوبنے والی چیز جس سے تاریکی پیدا ہو'' - اور اس سے مراد ہیں وہ تمام چیزیں جن کے نہ ہونے سے نشو و نما رُک جائے ، جیسے چاند جب ڈوب جاتا ہے تو نباتات کو ضرر پہنچتا ہے - ہماری ضروریاتِ زندگی کے نہ ہونے سے جس قدر نقصانات ہمیں پہنچ سکتے ہیں ، ہم ان سے محفوظ رہنے کے لئے ، قانونِ خداوندی کی پناہ میں آتے ہیں کہ وہ ہمیں ان نقصانات سے بچائے اور ہمیں سامانِ نشو و نما مہیا کردے - (المقام المحمود) -

و ق ت

اَلْوَقْتُ - کسی کام کے لئے مقررہ زمانہ کی آخری حد - لہذا یہ لفظ بے اندازہ زمانہ کے لئے نہیں بولا جاتا** - یعنی غیر معین عرصہ کو وقت نہیں کہہ سکتے - ہر چیز جس کے لئے اس طرح زمانہ متعین کر دیا جائے مُوَقَّتٌ کہلاتی ہے - الوَقْتُ وَ التَّوْقِیْتُ - وقت مقرر کرنا - اَلْمِیْقَاتُ - مقررہ وقت کو بھی کہتے ہیں اور مقررہ مقام کو بھی - چنانچہ مِیْقَاتُ الْحَاجِّ - حاجیوں کے احرام باندھنے کے مقام کو کہتے ہیں*** -

---

*تاج و محیط و راغب - **راغب - ***تاج -

قرآن کریم میں ہے وَ اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ (۷۷/۱۱) - جب رسولوں کا وقت مقرر کر دیا جائے گا - سورۃ نساء میں صلٰوۃ کے متعلق کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (۴/۱۰۳) کہا گیا ہے - اس کے ایک معنی ہیں "خاص طور پر مقرر کردہ فریضہ" اور دوسرے معنی ہیں ایسا فریضہ جس کا وقت متعین کر دیا گیا ہو - ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْمَوْقُوْتُ - حد مقرر کردہ چیز کو کہتے ہیں - یعنی جس کی حد مقرر ہو - سورۃ بقرہ میں نئے چاند کے متعلق ہے - هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ (۲/۱۸۹) - یہ لوگوں کے لئے اوقات معین کرنے کا ذریعہ ہیں (مِيْقَات کی جمع مَوَاقِيْت) - سورۃ نبأ میں یَوْمَ الْفَصْلِ کے متعلق ہے کَانَ مِيْقَاتًا (۷۸/۱۷) - یعنی قانون مکافات کی رو سے ظہور نتائج کا وقت متعین ہوتا ہے -

و ق د

وَقَدٌ - آگ کو کہتے ہیں ، اور آگ کے روشن ہونے کو بھی - وَقُوْدٌ - لکڑیوں کو کہتے ہیں جن سے آگ جلائی جائے - صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ اَلْحَطَبُ - ایندھن کی لکڑیوں کو کہتے ہیں - اور وَقُوْدٌ اس وقت کہتے ہیں جب ان لکڑیوں کو سلگا دیا جائے - اَوْقَدَ - اور اِسْتَوْقَدَ - آگ روشن کرنے کو کہتے ہیں* -

روح المعانی میں ہے کہ عربوں میں دستور تھا کہ جب جنگ کا اعلان کرنا ہوتا تو ایک بلند پہاڑی پر آگ جلا دیتے - اس کو نار الحرب کہتے تھے (۵/۶۴) - قرآن کریم میں اِسْتَوْقَدَ نَارًا (۲/۱۷) میں آیا ہے - سورۃ مائدہ میں اَوْقَدَ بمقابلہ اَطْفَاَ آیا ہے - (۵/۶۴) - اَطْفَاَ کے معنی آگ بجھا دینے کے ہیں - سورۃ قصص میں تذکرہ حضرت موسیٰؑ میں ہے کہ فرعون نے ہامان سے کہا کہ فَاَوْقِدْ لِیْ یٰھَامٰنُ عَلَی الطِّیْنِ (۲۸/۳۸) - جس سے مراد اینٹوں کا آگ میں پکانا ہے - وَقُوْدٌ - ایندھن (۲/۲۴ و ۶۶/۶ و ۸۵/۵) - مُوْقَدَۃٌ (۱۰۴/۶) جلائی ہوئی -

و ق ذ

اَلْوَقْذُ - شدت ضرب - بصائر میں ہے کہ مَوْقُوْذَۃٌ اس جانور کو کہتے ہیں جسے لاٹھی یا پتھر سے مار دیا جائے اور ذبح نہ کیا جائے اور جس پتھر سے اسے مارا جائے اس میں دھار نہ ہو** - جاہلیت میں اس طرح مرے

---

*تاج - **محیط -

ہوئے جانور کو کھا لیا کرتے تھے*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی لکڑی سے مارنے کے لکھے ہیں ۔ اور مَوۡقُوۡذَۃٌ ۔ جسے لکڑی کی ضرب سے مار ڈالا گیا ہو ۔ قرآن کریم نے اسے حرام قرار دیا ہے (۵/۳) ۔ ابو سعید نے کہا ہے کہ اَلۡوَقۡذُ کا مطلب ہے گدی کے اوپر اس زور سے مارنا کہ اس سے دماغ ماؤف ہو جائے* ۔

قرآن کریم نے اَلۡمَیۡتَۃُ (مردار) کو بھی حرام قرار دیا ہے ۔ اس کی تشریح یہ کہکر کر دی ہے کہ مردار میں صرف وہی جانور شامل نہیں جو طبیعی موت مرجائیں ۔ اس میں وہ جانور بھی شامل ہے جو گلا گھٹ کر مر جائے ۔ جو چوٹ کھا کر مر جائے (اَلۡمَوۡقُوۡذَۃُ) ۔ جو اوپر سے گر کر مر جائے ۔ جو سینگ لگ کر مر جائے ۔ یا جسے درندوں نے کھایا ہو ۔ ہاں ، اگر ان میں سے کسی کو مرنے سے پہلے ذبح کرلیا جائے تو وہ حرام نہیں ہوگا ۔ (۵/۳) ۔

و ق ر

اَلۡوَقۡرُ ۔ کان میں بھاری پن ہونا ۔ یا سماعت کا بالکل جاتے رہنا** ۔ قرآن کریم میں ہے وَفِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَقۡرًا (۶/۲۵) ۔ اَلۡوِقۡرُ ۔ بھاری بوجھ ۔ اَلۡوَقَارُ ۔ سنجیدگی ، بھاری بھرکم پن ، عظمت ۔ جَنَانٌ وَاقِرٌ ۔ باہمت دل کو کہتے ہیں جو گھبرا نہ اٹھے** ۔ اس سے بھی وَقَارٌ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں ۔ قرآن کریم میں ہے مَا لَکُمۡ لَا تَرۡجُوۡنَ لِلّٰہِ وَقَارًا (۷۱/۱۳) ۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم خدا سے وقار کے امیدوار (طلبگار) نہیں ہوتے ۔ یعنی زندگی کی ایسی حالت جس میں انسان ذرا ذرا سی بات سے گھبرا نہ جائے اور انسانی ذات کی ایسی کیفیت کہ موت کے دھچکے سے بھی اس کا کچھ نہ بگڑے ۔ لیکن یہ مفہوم اس صورت میں درست ہوگا جب لِلّٰہِ کے معنے مِنَ اللّٰہِ (اللہ سے) لئے جائیں ۔ ورنہ اس کے معنی یہ ہونگے کہ تم اللہ کے لئے بزرگی اور عظمت کا یقین کیوں نہیں رکھتے ۔

وَقَّرَ ۔ کسی کی تعظیم کرنا ۔ تُعَزِّرُوۡہُ وَتُوَقِّرُوۡہُ (۴۸/۹) ۔ اسے تقویت پہنچاؤ اور اس کی تعظیم کرو ۔ سورۃ احزاب میں ازواج مطہرات سے کہا گیا ہے ۔ وَقَرۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ (۳۳/۳۳) ۔ اپنے گھروں میں نہایت سنجیدگی اور وقار سے رہو ۔ تم سے ذرا بھی چھچھورے پن کا مظاہرہ نہ ہو ۔ یعنی یہ وَقۡرٌ سے ہے ۔ لیکن ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ یہ وَقَارٌ سے ہے جس سے امر قِرۡ آتا ہے ۔ جیسے وَعۡدٌ سے عِدۡ آتا ہے*** ۔

---

*تاج ۔ **تاج و محیط و راغب ۔ ***ابن فارس ۔

و ق ع

وَقَعَ يَقَعُ ۔ وُقُوْعاً ۔ چیز گر پڑی ۔ وَقَعَتِ الْاِبِلُ ۔ اونٹ بیٹھ گئے۔ وُقِعَ وَبِيْعَ بِالْاَرْضِ ۔ بہار کی پہلی بارش برسی ۔ مَوَاقِعُ الْغَيْثِ ۔ جن مقامات پر بارش برسی ہو ۔ وَقَعَتِ الطَّيْرُ ۔ پرندے اڑتے اڑتے کسی درخت یا زمین پر اتر پڑے ۔ اَلْوَقَعُ ۔ پتھر ۔ اَلْوَقِيْعَةُ ۔ اَلْوَاقِعَةُ ۔ جنگ ، معرکہ ۔ وَقَائِعُ الْعَرَبِ ۔ عربوں کے ایام جنگ ۔ اَلْوَقِيْعَةُ ۔ ہتوڑا *۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْوُقُوْعُ کسی چیز کے ثابت ہونے اور گرنے کو کہتے ہیں ۔ اَلْوَاقِعَةُ ایسا واقعہ جس میں سختی اور ناگواری پائی جائے **۔ زجاج نے کہا ہے کہ ہر آنے والی چیز جس کے متعلق یہ توقع ہو کہ وہ ضرور آئیگی ۔ اسے وَاقِعَةٌ کہدیتے ہیں* ۔

قرآن کریم میں ہے وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ (۲۲/۶۵) ۔ خدا نے (اپنے قانون کے مطابق) بارش کو روک رکھا ہے کہ وہ یونہی ازخود زمین پر نہ گر پڑے ۔ سورہ نساء میں ہے ۔ وَقَعَ اَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ (۴/۱۰۰) اس کا اجر اللہ پر واجب ہوگیا ۔ سورہ اعراف میں ہے فَوَقَعَ الْحَقُّ (۷/۱۱۸) ۔ حق محسوس شکل میں سامنے آکر ثابت ہوگیا ۔ سورہ الطور میں ہے اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ (۵۲/۷) ۔ خدا کا عذاب یقیناً واقع ہو کر رہے گا ۔ دوسری جگہ ہے اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (۵۶/۱) جب ہو جانے والی بات ہو جائیگی ۔ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ (۵۶/۲) اسکے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں ۔ مَوَاقِعُ ۔ واقع ہونے کی جگہیں (۵۶/۷۵) ۔ مُوَاقِعٌ (اسم فاعل) ۔ گر پڑنے والا (۱۸/۵۳) ۔ اَوْقَعَ ۔ ڈال دینا ۔ (۵/۹۱) ۔

و ق ف

وَقَفَ بِالْمَكَانِ يَقِفُ ۔ وُقُوْفاً ۔ وہ اس جگہ پر برابر کھڑا رہا ۔ وَقَفْتُهُ ۔ وَقْفاً ۔ میں نے اسے ٹھہرا دیا ***۔ قرآن کریم میں ہے وَقِفُوْهُمْ (۳۷/۲۴) انہیں ٹھہراؤ ۔ اَلْمَوْقِفُ ۔ ٹھہرنے اور کھڑے ہونے کی جگہ ۔ اَلتَّوْقِيْفُ فِى الْحَدِيْثِ ۔ بات کو واضح کرنا ***۔ اصطلاحاً اَلتَّوْقِيْفُ کسی بات کو معین کرنے کے لئے بولا جاتا ہے ۔

و ق ی

وَقَى الشَّيْءَ يَقِيْهِ وَقْيًا وَ وِقَايَةً ۔ کسی چیز کی حفاظت کرنا ۔ نگہبانی و نگہداشت کرنا ۔ اسے مضر اور تکلیف دہ چیز سے بچانا ۔ چنانچہ جب

*تاج ۔ **راغب ۔ ***تاج و محیط ۔

گھوڑا چلتے وقت نعل نہ ہونے کی وجہ سے سنبھال سنبھال کر پاؤں زمین پر رکھے ، خواہ اپنے سم میں درد کی وجہ سے ہو، یا سم کے چھل کر زخمی ہونے اور زمین کے سخت ہونے کی وجہ سے، تو اسے وَقِی الْفَرَسُ مِنَ الْحَفَا کہتے ہیں *۔

وِقَایَۃٌ ۔ احتیاط ۔ یا محفوظ رکھنے کا ذریعہ (Preservative) **۔

سَرْجٌ وَاقٍ ۔ ایسی زین جو گھوڑے کی پیٹھ پر بالکل ٹھیک بیٹھ جائے اور اسے زخمی نہ کرے**۔

قرآن کریم میں وَاقٍ بمعنی محفوظ رکھنے والا ، بچانے والا آیا ہے۔ مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ وَلِیٍّ وَلَا وَاقٍ (۱۳/۳۷) ’’ تیرے لئے اللہ کے مقابلہ پر نہ کوئی سرپرست ہوگا۔ نہ بچانے والا‘‘ ۔دوسرے مقام پر یہ مادہ محتاط رہنے اور اپنی حفاظت کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے ۔ جیسے فَاتَّقُوا النَّارَ (۲/۲۴) اپنے آپ کو عذاب آتش سے محفوظ رکھو۔ یا اس سے محتاط رہو۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ (جو قرآن کریم میں بار بار آتا ہے) کے معنی ہیں قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنا ۔ احکام خداوندی کا اتباع کرنا ۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرنا ۔ ان سے ہم آہنگ رہنا ۔ چنانچہ قرآن کریم نے یہ مفہوم دیگر مقامات میں واضح کر دیا ہے ۔ سورہ مائدہ میں تَقْوٰی کے مقابلہ میں عُدْوَانٌ کا لفظ آیا ہے (۵/۲) ۔ اور عُدْوَانٌ کے معنی سرکشی کے ہیں ۔ لہذا تَقْوٰی کے معنی قوانین خداوندی کی اطاعت ہوا ۔ سورہ آل عمران میں اسکی مزید تشریح کر دی گئی ہے جہاں فرمایا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (۳/۱۰۱) ۔ اے ایمان والو۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو ۔ جیسا کہ تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہوتا ہے۔ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۳/۱۰۱) یعنی تمام عمر قوانین خداوندی کے سامنے جھکے رہو۔ بالفاظ دیگر اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا (۳/۱۰۳) ۔ سب کے سب مل کر اللہ کے ضابطہ ہدایت کے ساتھ متمسک رہو۔ ان مقامات سے واضح ہے کہ وَاتَّقُوا اللّٰهَ کے معنی ہیں قوانین خداوندی (قرآن کریم) سے ہم آہنگ رہنا ۔ اس کے مطابق زندگی بسر کرنا ۔ ان کی پوری پوری نگہداشت کرنا ۔ اسی لئے سورہ شعراء میں مُتَّقِیْنَ کے مقابلہ میں غَاوِیْنَ آیا ہے (۲۶/۹۰-۹۱) ۔ غَاوِیْنَ وہ جو قوانین الٰہیہ کی راہ نمائی چھوڑ کر دوسری راہیں اختیار کر لیں اور مُتَّقِیْنَ وہ جو اسکی راہ نمائی کے پیچھے پیچھے چلیں ۔ قوانین خداوندی کی اس کامل ہم آہنگی کے اعتبار سے سورہ ص میں مُتَّقِیْنَ کے مقابلہ میں فُجَّارٌ کا لفظ آیا ہے (۳۸/۲۸) ۔ فَاجِرٌ وہ

---

*تاج ۔ **لین ۔

ہے جو پھٹ کر الگ ہو جائے (دیکھئے ف - ج - ر) لہذا متقی وہ ہے جو اس ضابطہ کے ساتھ متمسک رہے - اسکے ساتھ چمٹا رہے - اس سے ہم آہنگ رہے - پھٹ کر الگ الگ ہو جانے (Disintegration) اور ہم آہنگ رہنے (Integration) کے مفہوم کے اعتبار سے سورہ الشمس میں ہے کہ خدا نے نفس انسانی (انسانی ذات Human Personality) میں یہ دونوں صلاحیتیں رکھدی ہیں - فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (۹۱/۸) چاہے تو انسان ضابطہ خداوندی سے ہم آہنگ رہ کر اپنی ذات میں ارتکاز (Crystallisation) پیدا کرتا جائے اور چاہے اس سے الگ ہٹ کر اپنی ذات میں تشتت و انتشار پیدا کر لے - انہی دونوں گروہوں کے متعلق سورہ محمد میں ہے کہ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو اپنے ہی خیالات اور جذبات کے پیچھے چلتے ہیں (۴۷/۱۴) - لیکن دوسرا گروہ ان کا ہے جو قوانین خداوندی کی راہ نمائی میں چلتے ہیں - اس دوسرے گروہ کو ان کا تقوی مل جاتا ہے (آتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ - ۴۷/۱۷) - لیکن یہ اسی کو ملتا ہے الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ * - (۹۲/۱۷-۱۸) - جو اپنا مال (یا جو کچھ اس کی ضروریات سے زائد (۲/۲۱۹) اسکے پاس ہے وہ نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے) دیدیتا ہے اور اسطرح خود اپنی ذات کی نشوونما (Development) کا سامان بہم پہنچا لیتا ہے * -

لہذا مُتَّقِينَ وہ ہیں جو غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے بچنا چاہیں اور قوانین خداوندی سے ہم آہنگی اختیار کرکے اپنی ذات کی نشوونما کریں - تخریبی قوتوں کے تباہ کن اثرات سے حفاظت (تُقَاةً) کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ انسان قوانین خداوندی کی پوری پوری نگہداشت کرے (تَقْوَىٰ) - ان کا ہر وقت خیال رکھے - (تَقْوَى الْقُلُوبِ) اور اپنا ہر قدم ان کے مطابق اٹھائے - اسی کا نام ان سے متمسک یا ہم آہنگ رہنا ہے - ایسا تمسک جیسے زین گھوڑے کی پیٹھ پر فٹ آجاتی ہے اور اسے زخمی نہیں ہونے دیتی -

قرآن کریم نے اپنے متعلق شروع ہی میں یہ کہدیا ہے کہ یہ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (۲/۲) - ہے - یعنی یہ صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے لیکن صرف ان کی جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں اور خاردار وادیوں سے محفوظ رہ کر جانا چاہیں - جو شخص تباہ ہونا چاہے اسے صحیح اور غلط راستے کے امتیاز سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے - خودکشی کرنے والے سے یہ کہنا کہ سنکھیا

*یتزکیٰ (نشو و نما) - دیکھئے (ز - ک - و)

مہلک ہوتا ہے ، اس سے بچنا ، بے سود ہوتا ہے ۔ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲/۶)۔ '' ان کے لئے برابر ہے چاہے تو انہیں راستے کے خطرات سے آگاہ کرے یا نہ کرے۔ وہ صحیح بات کو ماننےکے ہی نہیں '' ۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں دیکھنا چاہئیے کہ کہاں اس کے معنی قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنا ہیں اور کہاں تباہیوں اور ہلاکتوں سے بچنا ۔ مثلاً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۲/۲۰۱) ۔ قُوْا أَنْفُسَكُمْ (۶۶/۶) مَنْ يُوْقَ شُحَّ نَفْسِهِ (۵۹/۹)۔ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ اور مَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ (۴۰/۹) ۔ میں معنی بچانے کے ہیں ۔ لیکن وَاتَّقُوا اللہ (۵۹/۱۸) کے معنی یہ نہیں کہ اللہ سے بچو۔ اس کے معنی ہیں قوانین خداوندی کو توڑنے یا ان سے سرکشی برتنے سے بچو۔ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اسی کو تَقْوٰی کہتے ہیں ۔ اور جو أَتْقٰى (سب سے زیادہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنے والا) ہو وہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم ہوتا ہے (۴۹/۱۳) ۔

حقیقت یہ ہے کہ تَقْوٰی قرآن کریم کی خاص اصطلاح ہے اور اس لفظ کو اس نے اسقدر اہمیت دی ہے کہ یہ بجائے خویش گویا ایک مادہ بن گیا ہے جس سے قرآن کریم مختلف الفاظ لایا ہے ۔ اس کے معنی '' پرہیزگاری '' نہیں ۔ '' پرہیزگاری '' محض سلبی صفت (Negative virtue) ہے لیکن تقوی میں زندگی کی تباہیوں سے بچکر چلنے کے ساتھ ساتھ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا بھی ہے ۔ یعنی اس میں سلبی صفت کے ساتھ ایجابی پہلو (Positive side) بھی ہے اور ایجابی پہلو غالب ہے ۔ لفظ '' تقوی '' اسقدر جامع ہے کہ اس کا ترجمہ کسی ایک لفظ میں ہو نہیں سکتا ۔ جس چیز کو عام طور پر کیریکٹر (سیرت اور کردار کی بلندی) کہا جاتا ہے ، وہ اس کے اندر آجاتی ہے ۔ '' کیریکٹر '' کی تعریف (Definition) بڑی مشکل ہے اور خود مغرب کے علمائے اخلاقیات بھی اس باب میں باہمدگر متفق نہیں ۔ لیکن قرآن کریم اس مشکل عقدہ کو بڑی آسانی سے حل کر دیتا ہے ۔ قرآن کریم کی رو سے ، انسان کی زندگی کی دو سطحیں ہیں ۔ ایک حیوانی سطح زندگی جس کے تقاضے وہی ہیں جو دوسرے حیوانات کے ہیں ۔ تحفظ خویش (Self - Preservation)؛ تغلب (Self-Assertion) اور افزائش نسل (Procreation) ۔ تحفظ خویش کا جذبہ اسقدر قوی اور شدید ہے کہ کوئی فرد اپنے مفاد کے مقابلے میں دوسرے کے مفاد کی پرواہ نہیں کرتا ۔ اسی سے تمام کشمکش پیدا ہوتی ہے ۔

دوسری سطح زندگی وہ ہے جسے '' انسانی زندگی '' کہہ لیجئے ۔ اس زندگی میں مقصد، انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے ۔ یہ نشو و نما ان بلند اور

مستقل اقدار (Permanent Values) کے تحفظ سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے ملتی ہیں اور جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں - قرآن کریم کہتا ہے کہ حیوانی سطح زندگی کے تقاضوں کا پورا کرنا بھی ضروری ہے لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ حیوانی سطح زندگی کے کسی تقاضے اور انسانی زندگی کے تقاضے (یعنی کسی بلند قدر) میں تصادم ہو جائے، (ان میں Tie پڑ جائے، تو، حیوانی زندگی کے تقاضے کو، بلند قدر کی خاطر قربان کر دینا چاہئے - یہ ''تقویٰ'' ہے - اس کو کریکٹر کہتے ہیں - (نیشنل کیریکٹر نہیں بلکہ انسانی کریکٹر) - حتیٰ کہ اگر کوئی وقت ایسا آ جائے کہ بلند قدر کی حفاظت کے لئے جان تک بھی دینی پڑ جائے تو جان دیدے اور انسانی قدر کو بچا لے - اس لئے کہ جان کا تحفظ بہر حال حیوانی سطح زندگی کا تقاضہ ہے - اور بلند قدر کی قیمت اس سے زیادہ ہے - قرآن کریم کہتا ہے کہ جو لوگ زندگی کو محض حیوانی زندگی (Physical Life) سمجھتے ہیں اور انسانی سطح زندگی (انسانی ذات) پر ایمان نہیں رکھتے، وہ کافر ہیں - (۳۵/۲۲ ; ۲۴/۱۴)- انسانی ذات پر ایمان رکھنا مومن کی خصوصیت ہے -

قرآن کریم اسے بھی تسلیم کرتا ہے کہ اپنے نفع کا خیال رکھنا اور نقصان سے بچنا عقل کا تقاضا ہے - جو اپنا نفع نقصان نہ پہچانے اسے پاگل کہتے ہیں - چونکہ مومن کے نزدیک، انسانی ذات کا تحفظ، حیوانی زندگی کے تحفظ سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے اس لئے جب ان دونوں تقاضوں میں تصادم ہو جائے، تو اس کی عقل کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی قیمت کی شے (انسانی ذات) کی حفاظت کے لئے چھوٹی قیمت کی شے (حیوانی تقاضے) کو قربان کر دے - لہذا، صحیح عقل و فکر کے مالک مومن ہی ہوتے ہیں (۳/۱۸۹) - اس لئے وہ کہتا ہے کہ فَاتَّقُوا اللّٰہَ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۶۵/۱۰) - ''اے عقل والو، جو ایمان لائے ہو، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو'' - یعنی بلند اقدار کی خاطر پست اقدار کو قربان کر دینا تقاضائے عقل و ایمان ہے - قرآن کریم انسان میں کیریکٹر پیدا کرنے کے لئے خالی جذبات سے اپیل نہیں کرتا - وہ علم و بصیرت (Reason) سے اپیل کرتا ہے اور عقل کو سمجھاتا ہے کہ ایسا کرنا خود اس کے لئے کسقدر مفید ہے - یہی وجہ ہے کہ وہ خدا کیطرف علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہے (۱۲/۱۰۸) - اور مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وہ، اور تو اور، قوانین خداوندی کے سامنے بھی اندھے اور بہرے بن کر نہیں گر پڑتے - (۲۵/۷۳) - یہ ہے قرآن کریم کی رو سے تقویٰ - اور انہیں کہتے ہیں متقین -

و ک أ

تَوَكَّأَ عَلَى الشَّيْءِ - اس نے اس چیز پر سہارا لیا اور ٹیک لگائی - اَلتُّكَأَةُ - لاٹھی ، جس پر چلنے میں ٹیک لگائی جاتی ہے - بہت سہارا لینے والا آدمی* - سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے کہا هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا (۲۰/۱۸) - یہ میرا عصا ہے جس پر میں سہارا لیتا ہوں - (اس کے مجازی معنی لئے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ احکام و ضوابط مجھے ملے ہیں وہ میرے لئے عصائے زندگی ہیں جن کے سہارے میں سفر حیات طے کروں گا) - سورۃ طور میں ہے - مُتَّكِئِيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ (۵۲/۲۰) -

سورۃ یوسف میں (عزیز مصر کی بیوی کی ضیافت کے سلسلہ میں ہے) وَ أَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً (۱۲/۳۱) - زجاج نے کہا ہے کہ اس میں مُتَّكَأً کے معنے اس چیز کے ہیں جس پر کھانے پینے یا بات کرتے وقت ٹیک لگائی جائے - بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی خود کھانے (طعام) کے ہیں - چنانچہ کہتے ہیں اِتَّكَأْنَا عِنْدَ زَيْدٍ - ہم نے زید کے پاس کھانا کھایا* -

و ک د

اَلْوِكَادُ - وہ رسّی جس سے دودھ دوہتے وقت گائے کے پیروں کو باندھ دیتے ہیں - نیز تسمہ جس سے زین کستے ہیں - اَلتَّوَاكِيْدُ - اَلتَّآكِيْدُ - اَلْمِيَاكِيْدُ - وہ چمڑے کے تسمے جن سے زین کے اگلے یا پچھلے (حصے کو) کس کر باندھ دیا جاتا ہے - وَكَّدَ الرَّحْلَ - اس نے کجاوہ کو کس کر باندھ دیا - وَكَّدَ الْعَهْدَ وَ الْعَقْدَ وَ أَكَّدَهُمَا - اس نے عقد اور معاملہ کو بہت محکم اور موثق (پختہ) کر دیا - گرہ کو بہت سختی سے باندھ دیا** -

خلیل نے کہا ہے کہ أَكَّدْتُ قسموں کی پختگی کے لئے زیادہ مناسب ہے اور وَكَّدْتُ باتوں کی پختگی کے لئے*** - بعض نے کہا ہے کہ تَأْكِيْدٌ کی نسبت تَوْكِيْدٌ زیادہ فصیح ہے* - قرآن کریم میں ہے لَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا (۱۶/۹۱) - اپنی قسموں کو ان کی پختگی کے بعد مت توڑو -

*تاج و محیط - **تاج و محیط و راغب و ابن فارس - ***راغب -

و ک ز

اَلْوَكْزُ ۔ دھکا دینا ۔ گھونسہ مارنا ۔ ضرب لگانا ۔ ٹھوڑی پر مکا مارنا۔ وَكَزَهٗ بِالرُّمْحِ ۔ اس نے اس کے نیزہ گھونپا ۔ وَكَزْتُ اَنْفَهٗ میں نے اس کی ناک توڑ دی* ۔ سورۃ قصص میں ہے فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى (۲۸/۱۵) ۔ موسیٰ نے اسے گھونسا مارا ۔ (مفہوم مارنے کا ہے) ۔

و ک ل

رَجُلٌ وَكَلٌ یا مُوَاكِلٌ ۔ اس آدمی کو کہتے ہیں جو خود کمزور ہو اور ہر کام میں دوسروں کا سہارا تلاش کرے ۔ تَوَاكَلُوْا تَوَاكُلًا ۔ لوگوں نے اپنے کام ایک دوسرے پر ڈالنے شروع کر دئے ۔ اِتَّكَلَ عَلَيْهِ فِيْ اَمْرِهٖ ۔ اس نے اپنے معاملہ میں اس پر اعتماد کیا ۔ اَوْ كَلْتُ عَلٰى اَخِيْكَ الْعَمَلَ ۔ میں نے تمام کام تمہارے بھائی پر چھوڑ دیا ۔ اس کے سپرد کر دیا ۔ اَلْوَكِيْلُ ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے آدمی کے کام کی نگرانی اور دیکھ بھال کرے** ۔ نیز یہ كَفِيْلٌ کے معنی میں بھی آتا ہے ۔ یعنی کسی بات کا ذمہ دار*** ۔

ہمارے ہاں تَوَكَّل عَلَى اللّٰهِ کے معنی یہ لئے جاتے ہیں کہ انسان خود کچھ نہ کرے اور اس انتظار میں رہے کہ خدا اس کے لئے از خود سب کچھ کر دے گا ۔ توکل کا یہ مفہوم قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے جو ہر قدم پر سعی و عمل اور جد و جہد کی تاکید کرتا ہے ۔

آپ ایک آدمی کو سمندر میں پھینک دیجئے ۔ وہ تیرنا نہ جانتا ہو تو ڈوب کر مر جائے گا ۔ آپ لوہے کے ایک ٹکڑے کو پانی میں ڈال دیجئے، وہ جھٹ پانی کے نیچے چلا جائے گا ۔ لیکن اگر آپ اسی لوہے کی چادروں سے ایک خاص قاعدے کے مطابق ایک عظیم القدر جہاز بنا لیں تو وہ سینہ بحر پر بط کی طرح تیرتا چلا جائے گا ۔ اور اس میں اگر ہزار آدمی بھی سوار کر لیں تو بھی وہ نہیں ڈوبے گا ۔ (بشرطیکہ یہ وزن اس حد کے اندر ہو جسے وہ قاعدے کے مطابق اٹھا سکتا ہے) ۔

آپ جہاز کو سمندر میں کس اطمینان سے چلاتے رہتے ہیں ۔ اور کس اطمینان سے اس میں سوار ہو جاتے ہیں ۔ یہ اطمینان کس چیز سے پیدا ہوتا ہے؟

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔

اس ''ایمان'' سے کہ یہ جو قانون خداوندی ہے کہ اتنی جسامت کا جہاز اگر پانی میں چھوڑ دیا جائے تو وہ اس قدر وزن لے کر تیرتا رہیگا ، یہ قانون کبھی دھوکا نہیں دے گا۔ اس قانون پر پورا پورا اعتماد کیا جاسکتا ہے ۔ اس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے ۔ یہ راستے میں دھوکا نہیں دے گا۔ یہ آسرا ٹوٹے گا نہیں ۔ یہ سہارا دغا نہیں دے گا۔ اسی کو توکل کہتے ہیں ۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں قوانین خداوندی جاری و ساری ہیں جن پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے اسی طرح انسانوں کی تمدنی زندگی کے لئے جو قانون خدا نے عطا کیا ہے (جو قرآن کریم کے اندر ہے) اس کی نتیجہ خیزی پر بھی اسی طرح سے بھروسہ کیا جاسکتا ہے ۔ اگر تم اس کے مطابق چلو گے تو جس نتیجہ کا اس نے وعدہ کر رکھا ہے وہ یقیناً برآمد ہو کر رہے گا۔ اس کا نام تَوَکُّلْ عَلَى اللّٰہِ ہے ۔ اور انہی معنوں میں خدا اَلْوَکِیْلُ ہے ۔ یعنی جس کے قانون پر پورا پورا بھروسہ کیا جائے ۔ عزم (کسی کام کے کرنے کا محکم ارادہ) اس توکل کی لازمی شرط ہے (۳/۱۵۸)۔ جماعت مومنین وہ ہے جو اپنے عزم و ارادہ کے ساتھ قانون خداوندی کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ کرے ۔ انہی کو مُتَوَکِّلِیْنَ کہا گیا ہے (۳/۱۵۸)۔ جو اس کے قانون کے علاوہ کسی اور قانون پر بھروسہ کرے وہ مشرک ہے ۔ (۱۶/۹۹۔۱۰۰)۔

وَکَّلَ کے معنے ہیں معاملہ کسی کے سپرد کر دینا (۶/۹۰)۔ سورۃ سجدہ میں ہے وُکِّلَ بِکُمْ (۳۲/۱۱)۔ جس کے تم سپرد کئے گئے ہو۔

و ل ت

اَلْوَلْتُ ۔ کے معنے ہیں نقصان اور کم کرنا ۔ وَلَتَہٗ حَقَّہٗ یَلِتُہٗ ۔ اَوْلَتَہٗ اس نے اس کا حق کم کر دیا* ۔ قرآن کریم میں ہے لَا یَلِتْکُمْ مِنْ اَعْمَالِکُمْ (۴۹/۱۴) ۔ وہ تمہارے اعمال میں سے کچھ کم کر کے نہیں دے گا۔ سورۃ طور میں ہے مَا اَلَتْنٰھُمْ مِنْ عَمَلِھِمْ (۵۲/۲۱)۔ ان کے اعمال سے ہم کچھ کم نہیں کریں گے ۔

(اسے ل ۔ ی ۔ ت کے عنوان کے تحت بھی لکھا گیا ہے) ۔

و ل ج

وَلَجَ ۔ یَلِجُ ۔ داخل ہونا** ۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ اَلْوُلُوْجُ کسی تنگ جگہ میں داخل ہونے کو کہتے ہیں*** ۔ اور بعض کے نزدیک اس

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔

کے معنی آهسته آهسته داخل هونے کے هیں * ۔ اَلْوَلِیْجَةُ ۔ (واحد اور جمع دونوں کےلئے آتا هے) ۔ دلی دوست ۔ مخلص دوست ۔ وہ شخص جو تمہارے خاندان سے تو نه هو لیکن تم اسے بہت هی قابل اعتماد سمجھو (تمہارے اندر گھسا هوا) رازدار (۹/۱۶)۔ سورة سبا میں وَلَجَ کے بمقابله خَرَجَ آیا هے (۳۴/۲) ۔ دیگر مقامات پر هے یُوْلِجُ اللَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ یُوْلِجُ النَّهَارَ فِی اللَّیْلِ (۳/۲۶ و ۳۵/۱۳) ۔ اس میں یُوْلِجُ کے بجائے تُوْلِجُ هے)۔ وہ رات کو دن کے اندر داخل کر دیتا هے اور دن کو رات کے اندر۔

و ل د

اَلْوَلَدُ ۔ جسے کسی نے جنا هو۔ (مذکر۔ مونث ۔ واحد ، تثنیه ، جمع ۔ سب کے لئے یه لفظ آتا هے ۔ نیز جمع کے لئے اَوْلَادٌ ۔ وِلْدَةٌ ۔ اور وُلْدٌ بھی مستعمل هیں)**۔ لیکن یه لفظ بچه کے لئے اس وقت بھی بولا جاتا هے جب وہ ابھی رحم مادر میں هو***۔ اَلْوَلِیْدُ۔ جب تک بچه چھوٹا رهے ، نیز غلام یا ملازم (جمع وِلْدَانٌ) ۔ اَلْوَالِدُ ۔ باپ ۔ اَلْوَالِدَةُ ۔ ماں ۔ اَلْوَالِدَانِ ۔ ماں باپ ۔ مَوْلِدٌ ۔ ولادت کا مقام اور وقت ۔ مِیْلَادٌ۔ ولادت کا وقت** ۔ صاحب محیط نے لکھا هے که اَلتَّوَلُّدُ کے معنی هیں بغیر ماں باپ کے کسی جاندار کا وجود پذیر هو جانا جیسے گرمی کے موسم میں بند پانی میں جراثیم (یا اور ذی حیات) پیدا هو جاتے هیں***۔ (یه غالباً اس زمانے کی اصطلاح هے جب جراثیم کے متعلق صحیح معلومات بہم نہیں پہنچی تھیں ورنه یه جراثیم بھی بغیر ''ماں باپ'' کے پیدا نہیں هوتے ۔ اگرچه ان کی پیدائش کا طریق۔ عمل تَوْلِیْد سے مختلف هوتا هے) ۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق متعدد مقامات پر هے که اس کا وَلَدٌ نہیں (۴/۱۷۱) ۔ اس سے صرف عیسائیوں کے اس عقیده هی کی تردید مقصود نہیں جس کی رُو سے وہ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے هیں ۔ اس سے مقصود یه کہنا بھی هے که خدا نے کائنات کو تَوْلِیْدٌ کے سلسله سے پیدا نہیں کیا (جس طرح ماں باپ کے هاں اولاد پیدا هوتی هے) بلکه اس نے اسے تخلیقاً پیدا کیا ۔ تولید (Pro - creation) میں ، پیدا کرنے والے (وَالِدٌ) کا ایک جزو ، مَوْلُوْدٌ (جو جنا گیا هو اس) میں شامل هوتا هے ۔ اور والد میں اتنے حصے کی کمی آ جاتی هے ۔ لیکن تخلیق (Creation) میں پیدا کرنے والے (خالق) کی ذات کا کوئی جزو اس کی مخلوق میں نہیں آتا ۔ اس لئے عمل

*غریب القرآن مرزا ابو الفضل ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

تخلیق سے اس کی ذات میں کوئی کمی (Deficiency) واقع نہیں ہوتی۔ خدا خالق ہے اور وہ انسانوں سے بھی تخلیق چاہتا ہے۔ باقی رہا عملِ تولید، سو یہ ایک حیاتیاتی عمل (Biological Action) ہے جس میں حیوان اور انسان دونوں شامل ہیں۔ آدمی، انسانیت کی سطح پر عملِ تخلیق سے آتا ہے اور صرف تولید (اولاد پیدا کرنے) سے وہ حیوانی سطح پر رہتا ہے (اگرچہ افزائشِ نسل کے لئے یہ بھی ضروری ہے۔ جس طرح تحفظ خویش کے لئے کھانا، پینا ضروری ہے)۔ لہذا، انسان کو دیکھنا یہ چاہئے کہ اس نے "تخلیق" کس قدر کی ہے۔ نہ یہ کہ اس نے "تولید" کتنی کی ہے۔ کتنے بچے پیدا کئے ہیں۔ تخلیق، فریضۂ انسانیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اللہ کے علاوہ اور خالقین کے وجود کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ وہ خدا کو اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ ($\frac{۲۳}{۱۴}$) کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی تمام خالقین میں سب سے بہتر خالق۔ وہ جس کی تخلیق حسن کی انتہائی شکل لئے ہو۔

صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ اَلْوَلَدُ کا استعمال بیٹے اور بیٹے کے بیٹے (وَلَدُ الْوَلَدِ۔ یعنی پوتے) سب کے لئے ہوتا ہے (لیکن اَلْمَوْلُوْدُ صرف اسے کہینگے جو براہ راست کسی کا بیٹا ہو)۔ قرآن کریم نے احکامِ وراثت کے ضمن میں کہا ہے یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ ($\frac{۴}{۱۱}$)۔ اَوْلَادٌ۔ وَلَدٌ کی جمع ہے۔ لہذا اس سے مراد صرف اپنے بیٹے اور بیٹیاں ہی نہیں بلکہ بیٹوں اور بیٹیوں کے بیٹے بیٹیاں بھی ہیں۔ اگر کسی متوفی کا بیٹا زندہ ہے تو وہ اس کا وَلَدٌ ہوگا۔ اور اگر بیٹا پہلے مر چکا ہے لیکن اس کا پوتا (بیٹے کا بیٹا) زندہ ہے تو وہ بھی اس کا وَلَدٌ ہوگا اور وہ دادا کی وراثت سے حصہ پائے گا۔ اسی طرح بیٹی کی اولاد بھی اَوْلَادٌ میں شامل ہوگی۔ اسی طرح والدین سے مراد صرف ماں باپ نہیں ہونگے بلکہ یہ سلسلہ اوپر تک چلا جائیگا۔ یعنی دادا۔ نانی وغیرہ۔

سورۃ بقرہ میں یہ کہا گیا ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو دو سال تک دودھ پلائیں۔ اس کے ساتھ طلاق کا بھی ذکر آرہا ہے۔ اس ضمن میں کہا کہ وَعَلَی الْمَوْلُوْدِ لَہٗ رِزْقُھُنَّ ($\frac{۲}{۲۳۳}$)۔ مطلب یہ ہے کہ بچے کی ماں کے کھانے پینے کی ذمہ داری بچے کے باپ پر ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے مَوْلُوْدٌ لَہٗ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یعنی وہ جس کے لئے اس عورت نے بچہ جنا تھا۔ اگر بچے کا باپ موجود ہے تو یہ الفاظ اس کے لئے ہونگے۔ اگر وہ نہیں تو اس کی جگہ جو اس کا (مذکر) وارث ہوگا یہ الفاظ اس کی طرف رجوع کر جائیں گے۔

و ل ی

الوَلْیُ - کے بنیادی معنی ھیں کسی کے قریب اور نزدیک ھونا - ابن فارس نے بھی یہی اس مادہ کے بنیادی معنی بتائے ھیں - دَارٌ وَلِیْہَۃٌ - قریب گھر*- قریب ھونے کے اعتبار سے اَلْوَلْیُ کے معنی ھوتے ھیں دوسری چیز کا پہلی چیز کے بعد بغیر فصل (ساتھ ھی) ھونا**- راغب نے کہا ھے کہ الوَلَاءُ والتَوَالِیْ کے معنے ھیں دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا اسطرح یکے بعد دیگرے آنا کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ آئے جو ان میں سے نہ ہو، اور اس جہت سے استعارۃ یہ قرب کے لئے استعمال ھوتا ھے***- وُلِیَتِ الاَرْضُ - زمین پر موسم بہار کی پہلی بارش کے بعد بارش برسی - اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی کے معنے ھیں خرابی اور تباھی تمہارے قریب پہنچ چکی ھے یا ساتھ ھی لگی ھوئی ھے - یہ زجرو وعید اور توبیخ کے موقع پر استعمال ھوتا ھے - ابن فارس نے بھی اس کی تائید کی ھے - ساتھ ھی یہ بھی لکھا ھے کہ یہ کلمہ ھاتھ سے نکل جانے والے فائدے پر افسوس دلانے کے لئے بولا جاتا ھے - ھُوَ اَوْلٰی بِکَذَا - وہ اس کا زیادہ حق دار ھے، زیادہ لائق و مستحق ھے* (۳۳/۶) -

قرب کے اعتبار سے اَلْوَلِیُّ دوست اور مددگار کو کہتے ھیں - اَلْمُوَالَاۃُ - ایک دوسرے سے محبت اور دوستی کرنا - معاھدہ کرنا - ایک دوسرے کے قریب ھونا - لگاتار و مسلسل آنا - نیز اس کے معنے دو لڑنے جھگڑنے والوں کے درمیان صلح و صفائی کے لئے دخل اندازی کرنا بھی ھیں - لیکن اِسْتَوْلٰی عَلَی الشَّیْءِ کے معنے ھیں کسی چیز کو اپنے قبضہ قدرت میں لے لینا - اور اِسْتَوْلٰی عَلَی الاَمْرِ - کسی معاملہ پر غالب آجانا *- اسی لئے الوِلَایَۃُ - سلطنت اور حکومت کو کہتے ھیں** - اور وَالٍ - نگران و ناظم اور حاکم کو - اَوْلَیْتُہُ الاَمْرَ - میں نے اسے معاملہ کا ناظم و نگران بنا دیا - الوَلِیُّ بھی نگران و ناظم اور حاکم کو کہتے ھیں *- تَوَلَّاہُ (۲/۲۵۷) - اسکو ولی بنا لیا - تَوَلَّی الاَمْرَ - اس نے معاملہ کی ذمہ داری اٹھا لی -

وَلّٰی کے متضاد معنی آتے ھیں - کسی کی طرف رجوع کرنا بھی اور کسی سے اعراض کرنا بھی - وَلّٰی ھَارِباً - پیٹھ موڑ کر بھاگا - اور فَوَلِّ وَجْھَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے معنی ھیں تو مسجد حرام کی طرف اپنا رخ کر - تَوَلّٰی عَنْہُ - اس سے اعراض کیا *- تَوَلَّاہُ کے معنی اسکی پیروی کرنا اور اسے اختیار کرنا بھی ھیں *- (۲/۱۰۰)

* تاج - ** محیط - ***راغب -

قرآن مجید میں یہ مادہ ان تمام مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ کسی کی طرف رخ کرنا (۲/۱۱۵) اور رو گردانی کرنا (۲/۱۴۲)۔ حاکم بن جاتا (۲/۲۰۵)۔ وَلَایَۃٌ بمعنی غلبہ و اقتدار (۱۸/۴۴)۔ وَلِیٌّ۔ مدد گار۔ حمایتی (۷/۱۹۶) وَلِیٌّ بمعنی وارث (۱۷/۳۳ ; ۱۹/۵)۔ المَوَالِیُّ (دور کے) رشتہ دار (۱۹/۵ ; ۴/۳۳)۔

ایک راہ تو یہ ہے کہ انسان جس نظریہ یا تصور کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالے (اسے ایمان کہتے ہیں) اس کے سامنے بطیب خاطر جھک جائے اور اس کی پوری پوری اطاعت کرے۔ (اسے اسلام کہتے ہیں)۔ لیکن دوسری راہ یہ ہے کہ انسان اس سے گریز کی راہیں تلاش کرے۔ یہ اعراض ہے۔ اس کو تَوَلِّیٌ کہتے ہیں۔ چنانچہ (۲/۱۳۷) میں یہ لفظ ایمان کے مقابلہ میں آیا ہے۔ اور (۳/۱۹) میں آَسْلَمَ کے مقابلہ میں (نیز ۱۶/۸۱-۸۲ میں)۔ اور (۴/۸۰) میں یہ لفظ اِطَاعَتٌ کے مقابلہ میں آیا ہے۔ لہذا تَوَلِّیٌ کے معنی یہی نہیں کہ انسان ایک مذہب (یا نظام) کو چھوڑ کر دوسرا مذہب یا (نظام) اختیار کر لے۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے اسکی پوری پوری اطاعت نہ کرے بلکہ گریز کی راہیں نکالتا رہے۔ اسی لئے تَوَلّٰی بمقابلہ صَلّٰی آیا ہے (۷۵/۳۱-۳۲)۔ صلّٰی کے معنی پوری پوری اطاعت کرنا۔ کسی کے پیچھے پیچھے چلے جانا ہیں۔ صلّٰی کے مقابل میں تَوَلّٰی کی عام صورت یہ ہے کہ خدا کے دئے ہوئے دین (یا نظام اطاعت) کی جگہ انسان کی خود ساختہ شریعت کو دین قرار دیدیا جائے اور اسکی اتباع کو دین کی اطاعت بنا دیا جائے۔

قرآن کریم نے خدا اور انسان کا تعلق اس قسم کا قرار دیا ہے جسے ہم عام الفاظ میں رفاقت کا تعلق کہتے ہیں۔ اگر انسان قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے تو خدا خود اسکا رفیق (ولی) بن جاتا ہے۔ اور اس کے قانون کے حیات بخش نتائج اس کے شامل حال ہوتے ہیں۔ دوسری طرف، ان قوانین کی اطاعت سے انسان کے ہاتھوں خدا کے کائناتی پروگرام کی تکمیل ہوتی جاتی ہے (یعنی کائنات میں حسن اور نکھار پیدا ہوتا جاتا ہے)۔ اسطرح انسان خدا کا وَلِیٌّ بن جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے ایک طرف خدا کو مومنین کا ولی کہا ہے (۲/۲۵۷)۔ اور دوسری طرف مومنین کو اَوْلِیَاءُ اللّٰہِ کہا ہے (۱۰/۶۲)۔ اَوْلِیَاء وَلِیٌّ کی جمع ہے۔ یاد رہے کہ اَوْلِیَاءُ اللّٰہِ کا کوئی خاص گروہ نہیں۔ قرآن کریم کی رو سے ہر مومن وَلِیُّ اللّٰہِ ہے اور تمام مومنین اَوْلِیَاءُ اللّٰہِ ہیں۔ اس نے صاف الفاظ میں کہدیا ہے کہ اَوْلِیَاءُ اللّٰہِ وہ ہیں اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَ کَانُوْا یَتَّقُوْنَ (۱۰/۶۳)۔ جو لوگ قرآن کریم

پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں ۔ ان کی '' پہچان '' یہ بتا دی کہ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ (۱۰/۶۴) ۔ انہیں اس دنیا میں بھی زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی ۔ آخرت کی زندگی کو تو یہاں دیکھا نہیں جا سکتا لیکن یہاں کی زندگی تو ہر ایک کے سامنے ہوتی ہے ۔ لہذا اَوْلِيَاءُ اللهِ (جماعت مومنین) وہ ہیں جنہیں زندگی کی شادابیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوں اور وہ دنیا میں نظام خداوندی کو قائم کریں (کیونکہ دنیا اور آخرت کی سرفرازیاں صرف اسی نظام کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہیں) ۔ انہی کو قرآن کریم نے حِزْبُ اللهِ (۵۸/۲۲) کہا ہے ۔ اور ان کے مقابلہ میں غیر خدائی نظام کے تابع زندگی بسر کرنے والوں کو حِزْبُ الشَّيْطَانِ (۵۸/۱۹) ۔ اس تصور کے علاوہ اَوْلِيَاءُ اللهِ کا جو تصور بھی ہے وہ غیر قرآنی ہے اور دوسروں سے مستعار لیا ہوا ۔

سورہ محمد میں سلسلہ کلام یوں چلا آرہا ہے کہ تم اقوام سابقہ کے احوال و کوائف پر غور کرو اور دیکھو کہ جن لوگوں نے وحی کے بتائے ہوئے راستے سے سرکشی برتی ان کا انجام کیا ہوا ۔ جو انجام ان کا ہوا وہی انجام دور حاضر کے مخالفین کا بھی ہوگا ۔ اس کے بعد ہے ذٰلِكَ بِاَنَّ اللهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكَافِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (۴۷/۱۱) ۔ '' یہ اس لئے کہ جو لوگ وحی کے بتائے ہوئے راستے پر ایمان رکھتے ہیں ان کا مولیٰ (دوست ۔ رفیق ۔ کارساز) اللہ ہے ۔ اور جو اس راستے کی مخالفت کرتے ہیں ان کا کوئی مولیٰ نہیں ہو سکتا '' ۔ یعنی جو شخص یا قوم قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرے اسے اسکی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے کوئی نہیں بچا سکتا ۔ ظاہر ہے کہ ان معنوں میں اللہ کے سوا کوئی کسی کا مولیٰ نہیں ہو سکتا ۔ یہی وہ مفہوم ہے جس کی رو سے جماعت مومنین کا اعلان ہوتا ہے کہ اَنْتَ مَوْلٰنَا (۲/۲۸۶) ۔ '' تو ہمارا مولیٰ ہے '' ۔ لیکن اس کے ساتھ سورہ تحریم میں (نبی اکرمؐ کے سلسلہ میں) فرمایا کہ فَاِنَّ اللهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۶۶/۴) ۔ '' اس کا مولیٰ اللہ ہے ۔ اور جبریل ۔ اور صالح مومنین ہیں ۔ ظاہر ہے کہ جس مفہوم میں اللہ مولیٰ ہو سکتا ہے اس میں اللہ کے سوا کوئی اور مولیٰ نہیں ہو سکتا ۔ لہذا اللہ ۔ جبریل ۔ اور مومنین کی '' مولائیت '' کی نوعیت الگ الگ ہے ۔ انہیں ایک سطح کا مولیٰ سمجھنا غلط ہے ۔ قوانین خداوندی کے خلاف کسی کی مولائیت کام نہیں آسکتی ۔ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا (۴۴/۴۱) ۔ '' جسدن کوئی دوست کسی دوست کے کام نہیں آسکیگا '' اس پر شاہد ہے ۔

قرآن کریم نے اس حقیقت کو بتاکید دھرایا ، اور بار بار دھرایا ہے کہ مومنین ایک دوسرے کے اولیاء ھو سکتے ھیں اور مومن کسی غیر مومن (کافر) کا ولی نہیں ھو سکتا ۔ بات بالکل واضح ہے ۔ دنیا میں ایک دوسرے کے دوست رفیق ، ھمراز ، ھم نوا وھی ھو سکتے ھیں جن کی منزل مقصود اور اس تک پہنچنے کا راستہ ایک ھو ۔ جن کی منزلیں مختلف اور راستے الگ الگ ھوں ، وہ ایک دوسرے کے دمساز اور ھمراز کیسے ھو سکتے ھیں ؟ غیر مومنین سے اچھے کاموں میں تعاون کیا جا سکتا ہے ۔ انہیں اپنا ھمراز اور دمساز نہیں بنایا جا سکتا (اس ضمن میں حسب ذیل آیات دیکھئے ۔ (۳/۲۷ - ۳/۱۱۷ - ۴/۸۹ - ۴/۱۳۹ - ۴/۱۴۴ - ۵/۵۱-۵۵ - ۸/۷۳ - ۹/۱۰۰-۷۱-۲۳-۲۷ - ۴۷/۱۲-۱۳ - ۵۸/۲۲ - ٦۰/۱-۴) -

و ن ی

اَلْوَنیٰ ۔ تکان ۔ درماندگی ۔ وَنیٰ ۔ یَنِیْ ۔ وَنْیًا ۔ سستی کرنا ۔ تھک جانا ، کمزور اور ضعیف ھو جانا ۔ نَاقَۃٌ وَانِیَۃٌ ۔ تھکی ھوئی اونٹنی ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے کمزوری اور ضعف بتائے ھیں ۔

اَلْمِیْنَا وَ الْمِیْنَاءُ ۔ بندرگاہ ، جہاں پہنچ کر جہاز دم لیتے ھیں ۔ نیز اَلْمِیْنَا (بغیر ھمزہ کے) ان پتھر کے ٹکڑوں کو بھی کہتے ھیں جس سے کانچ بنایا جاتا ہے* ۔

سورۃ طٰہٰ میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ھارونؑ سے کہا گیا ہے کہ فرعون کی طرف جاؤ ۔ وَلَا تَنِیَا فِیْ ذِکْرِیْ (۲۰/۴۲) ۔ اور دیکھو اس کشمکش میں ضابطۂ خداوندی کو آگے بڑھانے میں ذرا بھی سستی نہ کرنا ۔ اس مقصد کے لئے تمہاری تگ و تاز میں ذرا بھی کمی نہ آنے پائے ۔

و ھ ب

وَھَبَ یَھَبُ وَھْبًا ۔ ھِبَۃً ۔ عطا کرنا ۔ دینا ۔ اَلْھِبَۃُ ۔ وہ عطیہ جو نہ کسی چیز کے عوض دیا گیا ھو نہ ھی اس میں دینے والے کی اپنی غرض وابستہ ھو ۔ اَلْمَوْھِبَۃُ ۔ وہ بادل جو جہاں واقع ھو وھاں ھی برس جائے ۔ اَوْھَبْتُ لِاَمْرِ کَذَا ۔ میں فلاں امر پر قادر ھوگیا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے الفاظ بغیر قیاس کے آئے ھیں ۔

سورۃ احزاب میں ہے اِنْ وَھَبَتْ نَفْسَھَا (۳۳/۵۰) ۔ اگر وہ اپنے آپ کو نبی کے حوالے کردے ۔ سورۃ مریم میں ہے قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَھَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا (۱۹/۱۹) ۔ اس نے کہا کہ میں تیرے

---

*تاج ۔ **تاج و محیط ۔

رب کا یہ پیغام لے کر آیا ہوں کہ "میں (خدا) تجھے ایک پاکیزہ اورنشوو نما یافتہ بچہ عطا کروں گا"۔ سورۃ شعراء میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے کہا فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا . . . (۲۶/۲۱) ۔ اللہ نے مجھے قوت فیصلہ اور نبوت عطا فرمائی ۔ نبوت ایک ایسا علم ہے جو خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتا ہے ۔ کسب و ہنر سے حاصل نہیں کیا جاسکتا ۔ خدا کی صفت اَلْوَهَّابُ ہے (۳/۷) ۔ یعنی بلا مزد و معاوضہ بہت زیادہ عطا کرنے والا ۔ سورۃ صؔ میں یہ لفظ واپس دینے کے معنوں میں بھی آیا ہے وَ وَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ . . . (۳۸/۴۳)۔ مطلب عطا کرنے سے ہی ہے ۔ کھوئے ہؤں کا واپس مل جانا بھی تو عطا ہے ۔

و ہ ج

وَهَجَتِ النَّارُ ۔ وَهْجًا ۔ آگ کا روشن ہونا ، جلنا اور بھڑکنا ۔ اَلْوَهَجُ ۔ آفتاب اور آگ کی حرارت ۔ تَوَهَّجَ الْجَوْهَرُ ۔ جوہر چمک اٹھا* ۔

قرآن کریم میں ہے وَ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا (۷۸/۱۳) ۔ ہم نے (سورج کو) چراغ بنایا جو بافراط روشنی اور حرارت دینے والا ہے ۔

و ہ ن

اَلْوَهْنُ ۔ کسی کام یا معاملہ میں یا جسمانی طور پر کمزور ہونا ۔ لیث نے کہا ہے کہ وَاهِنٌ اس آدمی کو کہتے ہیں جو کام اور معاملہ میں کمزور ہو ۔ اور مَوْهُوْنٌ ۔ اُسے جو بدنی لحاظ سے کمزور ہو**۔ سورۃ آل عمران میں وَهْنٌ کے ساتھ ضعف اور استکانت کے الفاظ آئے ہیں (۳/۱۴۵) ۔ اس سے اس کے مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ وَهَنَ ۔ کمزور و ضعیف ہوا۔ اَوْهَنَ کمزور اور ضعیف بنایا۔ سورۃ انفال میں ہے اَنَّ اللّٰہَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكَافِرِيْنَ (۸/۱۸) ۔ اللہ مخالفین، کفار کے منصوبوں کو کمزور (ناکام) بنا دیگا ۔ مسلمانوں سے کہا گیا ہے وَلَا تَهِنُوْا (۳/۱۳۸) ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم میں کسی قسم کی بھی کمزوری نہیں ہونی چاہئے ۔ نہ جسمانی کمزوری (جس میں مادی اسباب بھی شامل ہیں) اور نہ ہی عقل و فکر اور علم و بصیرت کی کمزوری، کیونکہ قرآن کریم نے قیادت کے لئے جسمانی اور علمی دونوں صلاحیتوں کو ضروری قرار دیا ہے (۲/۲۴۷) ۔ نہ ہی سیرت و کردار میں کسی قسم کی کمزوری۔ اس طرح ایمان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (۳/۱۳۸) ۔ تم سب سے بلند ہو جاؤ گے ۔

---

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔

و ھ ی

اَلْوَھْیُ ۔ کسی چیز میں شگاف ھونا ۔ کسی چیز کی بندشوں کا ڈھیلا پڑ جانا ۔ اَوْھَاہُ ۔ اس نے اسے کمزور کر دیا ۔ اَلْحَائِطُ یَھِیْ* ۔ دیوار گرا چاھتی ھے ۔ رَجُلٌ وَاہٍ ۔ بودا ۔ کمزور ۔ احمق آدمی ۔ ناقابل اعتماد ۔ حَدِیْثٌ وَاہٍ ۔ نہایت بودی بات* ۔

قرآن کریم میں ھے وَ انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَھِیَ یَوْمَئِذٍ وَّاھِیَۃٌ (۶۹/۱۶) ۔ آسمان پھٹ جائے گا اور اس دن اس کی بندشیں ڈھیلی پڑجائینگی ۔

وَیْ (حرف)

وَیْ ۔ تعجب و افسوس یا زجر و توبیخ یا پشیمانی اور تعجب کے لئے آتا ھے** ۔ قرآن کریم میں وَیْکَاَنَّ آیا ھے (۲۸/۸۲) ۔ (وَیْ + کَ + اَنَّ یا وَیْ + کَاَنَّ) ۔ ھائے افسوس ۔ یا جیسے ھم کہتے ھیں کہ ''ارے! ھم تو کچھ اور سمجھ رھے تھے اور معاملہ یوں نکلا!''

و ی ل

وَیْلٌ ۔ شر کا نازل ھونا ۔ یہ مصدر جامد ھے جس کا کوئی فعل نہیں*** ۔ اظہار درد و کرب کے موقع پر، نیز عذاب و تکلیف اور بد انجامی کے لئے یہ کلمہ استعمال ھوتا ھے ۔ اَلْوَیْلَۃُ ۔ رسوائی ۔ تباھی ۔ بربادی ۔ ھلاکت*** ۔

تباھی اور بربادی کے معنوں میں وَیْلٌ (۱۰۴/۱) میں آیا ھے ۔ حسرت اور افسوس کے لئے وَیْلَکَ (۴۶/۱۷) میں ۔ اور شرم اور تعجب کے ملے جلے جذبات کے لئے یٰوَیْلَتٰی (۱۱/۷۲) میں ۔

---

*تاج و راغب ۔ **تاج و راغب و محیط ۔ ***تاج ۔

ھ

ہٗ (ضمیر)

ہٗ ۔ یہ ضمیر منصوب متصل اور مجرور متصل ہے ۔ واحد مذکر غائب کے لئے آتی ہے ۔

منصوب متصل کی مثال ۔ یَنْصُرُوْنَہٗ (۲۸/۸۱) ۔ ''(جو) اس کی مدد کرے'' ۔ مجرور متصل کی مثال ۔ مَکَانَہٗ (۲۸/۸۲) ۔ ''اسکی جگہ'' ۔

[یہ ضمیر کبھی ہِ اور ہِ بھی پڑھی جاتی ہے مثلاً فِیْہِ ۔ بِہٖ ۔ اور کبھی یہ ساکن ہوکر محض وقف کے لئے بڑھا دی جاتی ہے مثلاً مَا ھِیَہْ ۔ اور کِتَابِیَہْ] ۔

ھَا (ضمیر)

ھا ۔ ضمیر منصوب متصل اور مجرور متصل ہے ۔ واحد مؤنث غائب کے لئے آتی ہے ۔ منصوب متصل کی مثال ۔ اِنَّھَا (۲/۶۱) ۔

مجرور متصل کی مثال ۔ لَوْنُھَا (۲/۶۹) ۔

ھَا

ھَا ۔ خُذْ (پکڑو ۔ لو) کے معنے میں آتا ہے ۔ ھَاؤُمُ اقْرَءُوْا کِتٰبِیَہْ (۶۹/۱۹) لو ۔ میری کتاب پڑھو ۔ (اس میں جمع کے لئے اُمْ بڑھایا گیا ہے) ھَا ۔ تنبیہ کے لئے بھی آتا ہے ۔ ھَا اَنْتُمْ اُوْلَاءِ ۔ ہاں تم وہی تو ہو ۔

جب ھَا، اَیٌّ کے بعد آئے تو ندا (پکارنے) کے لئے آتا ہے ۔ جیسے اَیُّھَا الرَّجُلُ ۔ اے مرد ! اکثر اَیُّھَا سے پہلے یَا بڑھا کر یَا اَیُّھَا بولا جاتا ہے ۔ قرآن کریم میں ہے یَا اَیُّھَا النَّاسُ (۲/۲۱) اے لوگو !

[ھٰکَذَا کے لئے دیکھئے عنوان ھٰذَا] ۔

ھٰــؤُلَاءِ

ھٰـؤُ لَاءِ ۔ (ھَا + اُولَاءِ) ھٰـذَا اور ھٰذِہٖ دونوں کی جمع ہے ۔ ”یہ سب“ (مذکر و مؤنث)۔ مذکر کے لئے ھٰـاَنْتُمْ ھٰـؤُلَاءِ (۲/۶۵)۔ خبردار تم ہی وہ لوگ ہو۔ مؤنث کے لئے ھٰـؤُلَاءِ بَنَاتِیْ (۱۱/۷۸) یہ سب میری بیٹیاں ہیں ۔

ھَـاؤُمُ

دیکھئے عنوان ھَـا ۔

ھٰـذَا

ھٰـذَا ۔ (اسم اشارہ۔ واحد مذکر) ”یہ“۔ ھٰـذَانِ ھٰـذَیْنِ (مذکر۔ تثنیہ) ”یہ دونوں“ ۔ ھٰـذِہٖ (واحد مؤنث) ۔ ”یہ“ ۔ ھَاتَانِ ھَاتَیْنِ ۔ (تثنیہ مؤنث) ”یہ دونوں“۔ (ھٰـؤُلَاءِ ۔ جمع کے لئے آتا ہے) ۔ ”یہ سب“۔ ھٰکَـذَا ۔ (ھَا + کَ + ذَا)۔ ” اسی طرح ایسا ہی“ ۔ اَھٰکَـذَا عَـرْشُکِ (۲۷/۴۲) ۔ کیا تیرا تخت ایسا ہی تھا ؟

ھَـارُوْتُ

الـھَـرْتُ ۔ نیزہ گھونپنا ۔ کپڑے کو پھاڑنا اور چندی چندی کرنا ۔ اَلْھَـرَتُ ۔ منہ کی باچھوں کا کشادہ ہونا ۔ اَلْھَـرِبْتُ ۔ وہ شخص جس کی باچھیں وسیع ہوں ۔ رَجُـلٌ ھَـرِبْتٌ ۔ وہ آدمی جو فحش گوئی کے ساتھ کسی راز کو پوشیدہ نہ رکھے* ۔

ھَارُوْتُ ۔ افسانہ طرازوں نے حضرت سلیمانؑ کے متعلق جو طرح طرح کی چیستانیں مشہور کر رکھی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ بابل میں دو فرشتے تھے ۔ ہاروت اور ماروت ۔ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ قرآن کریم نے ان مزخرفات کی تردید کردی (۲/۱۰۲) ۔ یہ عجمی لفظ ہے ۔

(ماروت اور بابل کے عنوانات بھی دیکھئے) ۔

---

*تاج ۔

ھَارُوْنُ

ھَارُوْنُ - یہ عجمی نام ہے - حضرت موسیٰؑ کے بھائی اور بنی اسرائیل کے پیغمبر کا نام تھا - عربی میں اَلْھَیْرُوْنُ - عمدہ قسم کی کھجور کو کہتے ہیں* -

بعض لوگ اپنے اس (غلط) عقیدہ کی دلیل میں کہ نبی بغیر کتاب کے بھی آتے ہیں ، حضرت ھارونؑ کی مثال پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کو کتاب ملی تھی اور حضرت ھارونؑ ان کے ساتھ بغیر کتاب کے تھے - قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ کتاب ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ھارونؑ دونوں کو ملی تھی - وَ اٰتَیْنٰھُمَا الْکِتٰبَ الْمُسْتَبِیْنَ (۳۷/۱۱۷) - ''اور ہم نے دونوں کو واضح کتاب دی'' -

[مزید تفصیل کے لئے (ن - ب - أ) کا عنوان دیکھئے] -

ھَامَان

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو فرعون ، ھامان اور قارون کیطرف بھیجا تھا (۴۰/۲۳) - اور یہ تینوں ھلاک ھونیوالوں میں سے تھے(۲۹/۳۹) -

تاریخ انسانیت کے مختلف ادوار پر نگاہ ڈالئے - ھر جگہ بادشاھت کے غلبہ و استیلاء سے کہیں زیادہ عمیق و شدید ، '' پیشوائیت '' (Priesthood) کا تسلط نظر آئیگا - بادشاہ تو خیر بادشاھی کرتا تھا ، برھمن (مذھبی پیشوا) خدائی کرتا تھا - ایسی خدائی جس میں ، سچ پوچھئے تو بادشاہ بھی اسکی رعایا میں سے ھوتا تھا - مصر میں آمن رع (سورج کا دیوتا) سب سے بڑا دیوتا سمجھا جاتا تھا - اس مندر کا بڑا پجاری ، شوکت و ثروت کے بلند ترین مقام پر فائز ھوتا تھا - ڈاکٹر سٹینڈروف ، اپنی کتاب '' قدیم مصریوں کا مذھب '' میں لکھتا ہے -

''آمن دیوتا کے سردار کاھن کو نبی اول کہتے تھے - وہ محکمہ تعمیرات** کا بھی افسر تھا - مندر کی عالی شان عمارات اور ان کی زیبائش و آرائش کا انتظام اس کی تفویض میں تھا - یہی دیوتاؤں کی فوج یعنی مندر کی سپاہ کا جرنیل بھی تھا - خزانہ کی نگرانی اور نظم و نسق کا بھی یہی ذمہ دار تھا - نہ صرف آمن کا مندر اور اس کے پجاری اس کے دائرہ حکومت میں تھے بلکہ تھیبس اور شمالی اور

*تاج - ** غالباً مذھبی عمارات مراد ھیں-

مغربی مصر کے تمام مندروں کے پجاریوں کا افسر اعلیٰ بھی یہی تھا ۔ اگر حساب لگایا جائے تو صرف شہر تھیبس کے مندر کے قبضہ میں تمام مصر کی زمین کا دسواں حصہ تھا،، ۔ یہ تھی آمن دیوتا کے مندر کے سردار کاھن (Head Priest) کی وجاھت ۔ یہی آمن، قرآن کا ھامان ھے [جیسے تغیر لفظی سے آرون (Aoron) ھارون ھو گیا] انسائکلوپیڈیا برٹانیکا میں (مصر کے عنوان کے تحت) مذکور ھے کہ

> فراعنۂ مصر کے اٹھارھویں خاندان کے وقت سے مندر کے پجاریوں نے خاص اثر اور اھمیت اختیار کر لی تھی ۔ اس خاندان کے زمانہ میں آمن رع (واقع تھیبس) کے کاھن کے نام پر ایشیا کے مفتوح علاقے وقف ھو چکے تھے جنکی وجہ سے وہ بے حساب دولت اور قوت کا مالک سمجھا جاتا تھا ۔

ڈاکٹر (Breasted) نے بھی اپنی کتاب " تاریخ مصر" میں لکھا ھے کہ آمن کے سب سے بڑے پجاری کے ماتحت بہت بڑا مقامی لشکر ھوتا تھا ۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت سمجھ میں آسکتی ھے کہ قرآن کریم نے فرعون کے ساتھ ھامان کے لشکروں کا ذکر کیوں ضروری سمجھا (۲۸/۶) ۔ اور فرعون نے ھامان (محکمہ تعمیرات کے افسر اور نظام " روحانیت ،، کے سب سے بڑے رکن) سے کیوں کہا تھا کہ اس کے لئے ایک بلند عمارت یا برجی تعمیر کر دی جائے جس پر چڑھکر وہ (معاذ اللہ) حضرت موسیٰؑ کے خدا کو جھانک لے (۴۰/۳۶) ۔

حقیقت یہ ھے کہ آسمانی انقلاب کی آواز جب بھی اٹھی ھے اس کے مقابلہ کے لئے ملوکیت کبھی براہ راست سامنے نہیں آتی وہ ھمیشہ " پیشوائیت،، کو آگے بڑھاتی ھے اور خود اسکی سپر میں محفوظ رھتی ھے ۔ یہی فرعون نے کیا ۔ خود پیچھے رھا اور حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ کے لئے ھامان اور اس کے ساحرین کو آگے بڑھایا ۔ لیکن عصائے موسیٰؑ نے ان سب کی دسیسہ کاریوں کو نیست و نابود کر دیا ۔ فَاِذَا ھِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِکُوْنَ (۷/۱۱۷) ۔

ملوکیت ۔ پیشوائیت ۔ اور سرمایہ داری ، تینوں بلائیں انسانیت کے لئے ھلاکت آفریں ھیں ۔ قرآن کریم نے ، داستان بنی اسرائیل کے ضمن میں ان تینوں بلاؤں کا ذکر شرح و بسط سے کیا ھے ۔ فرعون ، استبداد ملوکیت کا مجسمہ ۔ ھارون، پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا نمائندہ ۔ اور قارون، سرمایہ داری

کی خون آشامیوں کا پیکر ۔ آسمانی انقلاب ، انسانیت کو ان تینوں بلاؤں سے نجات دلانے کے لئے آتا ہے ۔ اس کا علاج قرآنی نظام حکومت و معیشت میں ہے جس میں نہ کوئی کسی انسان کا بندہ اور غلام ہوتا ہے نہ محکوم اور محتاج ۔

ھ ب ط

هُبُوْطٌ ۔ اترنا ۔ راغب نے اس کے معنے دب کر مجبوراً اترنا لکھے ہیں***۔ هَبَطَ اَرْضَ کَذَا ۔ وہ فلاں زمین میں اترا*۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ هَبَطَ مِنْ مَوْضِعٍ اِلٰی مَوْضِعٍ کے معنی ہیں وہ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل ہو گیا**۔ قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے اهْبِطُوْا مِصْرًا ۔ ($\frac{2}{61}$) ۔ جس کے معانی ہیں تم اس بیابانی زندگی سے کسی شہر کی طرف منتقل ہو جاؤ۔ راغب نے لکھا ہے کہ جب لفظ هُبُوْطٌ انسان کے لئے بولا جائے تو اس میں استخفاف اور حقارت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ بخلاف اِنْزَالٌ کے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے بہت سے موقعوں پر باشرف چیزوں کے لئے بھی استعمال کیا ہے***۔ هَبَطَ الْمَرَضُ لَحْمَهٗ کے معنی ہیں بیماری نے اس کے گوشت کو کم کر دیا ۔ اسے لاغر کر دیا ۔ اَلْهَبْطَةُ ۔ نشیبی زمین کو کہتے ہیں ۔ اور اَلْهَبْطُ کے معنی نقصان کے ہیں، نیز یہ لفظ ذلت ، عاجزی اور شر میں پڑ جانے کے لئے بھی آتا ہے ۔ اَلْهَبِيْطُ ۔ لاغر اونٹ کو کہتے ہیں *۔ (ابن فارس) ۔

لہذا هُبُوْطٌ کے معنی ہیں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف تبدیلی جب کہ دوسری حالت میں پہلی حالت کے مقابلہ میں کچھ کمی ہو ۔ قرآن کریم میں قصہ آدم میں ہے کہ اگر انسان وحی کی راہ نمائی میں امۃ واحدہ بنکر رہیں تو یہ زندگی شرف انسانیت کی زندگی ہے لیکن اگر وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں تو یہ اُس مقام سے پستی کی طرف تبدیلی (ہبوط) ہے ۔ فَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ($\frac{2}{36}$) ۔ " ہم نے کہا کہ تم (اس) مقام بلند سے پستی کی طرف جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے"۔ اس هُبُوْطٌ سے ، بلند مقام آدمیت کیطرف تبدیلی اسی صورت میں ہوسکتی ہے جب انسان وحی کے مطابق زندگی بسر کریں ($\frac{2}{38}$) ۔ تفصیل ان امور کی (ا ۔ د ۔ م) اور (ش ۔ ج ۔ ر) کے عنوانات میں ملیگی ۔

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

ھ ب و

اَلْھَبَاءُ ۔ غبار ۔ بہت باریک غبار جو فضا میں بالکل دھوئیں جیسا نظر آئے ۔ یا وہ باریک غبار کہ جب کسی تاریک کوٹھڑی میں ، روشندان سے دھوپ کی کوئی کرن آرہی ہو تو اس میں جو چھوٹے چھوٹے ذرے نظر آتے ہیں ۔ گھوڑے کے سموں سے اڑنے والے غبار کو بھی کہتے ہیں ۔*
اَلْھَبْوَۃُ ۔ غبار ۔ ھَبَا الْغُبَارُ ۔ گرد اڑی*۔

جَاءَ یَتَھَبَّی کے معنی ہوتے ہیں وہ خالی ہاتھ ، خاک اڑاتا ہوا آیا ۔
اَلْھَابِیُّ ۔ قبر میں گرنے والی مٹی کو کہتے ہیں *۔

قرآن کریم میں ہے کہ مکافات عمل کی میزان میں مجرمین کے اعمال بالکل بے وزن ہونگے ۔ ان کا کوئی منفعت بخش نتیجہ مرتب نہیں ہوگا ۔ فَجَعَلْنٰہُ ھَبَاءً مَّنْثُوْرًا (۲۵/۲۳) ۔ پھر ہم اسے خاک پراگندہ کی طرح کر دینگے ۔

ھ ج د

اَلْھُجُوْدُ ۔ اَلتَّھَجُّدُ ۔ سونے اور جاگنے دونوں کے لئے آتا ہے **۔ (اضداد میں سے ہے ۔ لطائف اللغۃ) ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْھَاجِدُ سونے والے کو کہتے ہیں ۔ لیکن ھَجَّدْتُہٗ فَتَھَجَّدَ کے معنی ہیں "میں نے اسکی نیند کو دور کر دیا ۔ پس وہ جاگ گیا" ۔ (جیسے مَرَّضْتُہٗ کے معنی ہوتے ہیں میں نے اس کے مرض کو دور کیا ۔ یا تیمارداری کی) ***۔

قرآن کریم میں ہے وَمِنَ اللَّیْلِ فَتَھَجَّدْ بِہٖ (۱۷/۷۹) ۔ رات کے کچھ حصے میں (قرآن کریم کے ساتھ) جاگو ۔ یہ وہی چیز ہے جسے دوسری جگہ یوں کہا گیا ہے کہ قُمِ اللَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا (۷۳/۲) ۔ " رات کو قیام کر مگر تھوڑے حصے کو چھوڑ کر" ۔ قرآنی انقلاب کے اولین مراحل میں پروگرام اسقدر طویل اور سخت ہوتا ہے کہ اس کے لئے دن کے علاوہ ، راتوں کو بھی کام کرنا پڑتا ہے ۔

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ ھُجُوْدٌ دن میں سونے کو کہتے ہیں اور ھُجُوْعٌ رات میں سونے کو ****۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی مقام پر ٹھہرنے کے ہیں ۔

*تاج و راغب و محیط ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔ ****محیط ۔

ھ ج ر

اَلْھَجْرُ ۔ الْھِجْرَانُ ۔ کسی چیز کو چھوڑ دینا ۔ ترک کر دینا ۔ الگ ہو جانا ۔ کاٹ دینا ۔ جدا کردینا ۔ قطع تعلق کر لینا ۔ نیز اعراض برتنا ۔ راغب نے اس کے معنے دوسرے سے جدا ہونے کے بتائے ہیں خواہ یہ جدائی زبانی ہو یا قلبی یا بدنی ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) قطع و جدائی اور (۲) کسی کرباندھنا بتائے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَاھْجُرْھُمْ ھَجْرًا جَمِیْلًا (۱۰/۷۳) ۔ نہایت خوبصورتی سے ان سے الگ ہٹ کر (اپنی جماعت کی تنظیم میں مشغول ہوجا) ۔ یعنی فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ (۸۵/۱۵)۔

ھَاجِرَاتٌ ۔ بری باتیں ۔ فحش باتیں ۔ رسوا کن باتیں ۔ ایسی باتیں جنہیں ترک کر دینا چاہئیے*۔ بِہٖ سٰمِرًا تَھْجُرُوْنَ (۶۷/۲۳) میں بعض کے نزدیک تَھْجُرُوْنَ کے معنے بکواس کرنا ہیں ۔

اَلْھِجْرَۃُ ۔ ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں کوچ کر جانا ۔ اس سے فعل ھَاجَرَ ہے ۔ ازہری نے کہا ہے کہ دراصل اہل عرب کے نزدیک بادیہ نشینوں کا شہر کی طرف منتقل ہو کر آ جانا ، اَلْمُھَاجَرَۃُ کہلاتا تھا، پھر اس شخص کو جو اپنے مقام رہائش کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جائے مُھَاجِرٌ کہہ دیتے ہیں* ۔ لیکن قرآن کریم نے اسے اپنے خاص معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ قرآن کریم کی رو سے ایک رسول یا مرد مومن کا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ وہ دنیا میں نظام خداوندی کے قیام کے لئے کوشش کرے ۔ وہ جس مقام میں رہتا ہے سب سے پہلے اپنی اس کوشش کو وہیں سے شروع کرتا ہے ۔ لیکن اگر وہ دیکھے کہ وہاں کی فضا اس نظامِ نو کے لئے سازگار نہیں ، تو اسے اپنے پاؤں توڑ کر وہیں نہیں بیٹھے رہنا چاہئیے ۔ اسے اس زمین کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف چلا جانا چاہئیے جہاں کی فضا اس کے مقصد کے حصول کے لئے زیادہ سازگار ہو ۔ مومن کسی خاص خطۂ زمین سے وابستہ نہیں رہ سکتا ۔ مومن کا جہان ہر کہیں ہے ۔ وہ کسی خاص زمین میں زندگی بسر کرکے وہیں مر جانے کے لئے پیدا نہیں ہوتا ۔ وہ خدا کی زمین میں خدا کا قانون نافذ کرنے کے لئے پیدا ہوتا ہے ۔ اس مقصد کے لئے اسے جو کچھ چھوڑنا پڑے بلا توقف چھوڑ دینا چاہئیے ۔ مال و دولت ۔ جھوٹی عزت اور قوت ۔ رشتہ دار ۔ وطن ۔ سب کچھ ۔ اس ''چھوڑ دینے'' کا نام ھِجْرَۃٌ ہے اور ایسا کرنے والے کو ''مہاجر'' کہتے ہیں ۔ لیکن صرف ''چھوڑ دینا''

*تاج ۔

ھی نہیں بلکہ اس کے بعد اپنے مقصد کے حصول کے لئے مسلسل جد و جہد کرنا بھی۔ اسی لئے قرآن کریم میں اکثر ھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا (۲/۲۱۸) ۔ اکٹھا آیا ھے ۔ ھَاجَرُوْا حصہ لا ھے اور اس کے بعد جَاھَدُوْا حصہ الا اگرچہ وہ چھوڑ دینا بھی درحقیقت اسی جد و جہد ھی کا ایک پہلو ھے ۔ ھجرت مشکلات سے فرار کا نام نہیں ۔ یہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے زیادہ مساعد ماحول کی طرف منتقل ھونے کا نام ھے ۔

مَھْجُوْرٌ ۔ قرآن کریم میں ھے وَقَالَ الرَّسُوْلُ یَا رَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا (۲۵/۳۰) ۔ اور رسول ، خدا کے حضور میں کہے گا کہ اے میرے نشو و نما دینے والے! میری قوم نے اس قرآن کریم کو مَھْجُوْر بنا دیا تھا ۔ اس کا عام مفہوم یہ لیا جاتا ھے کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا تھا ۔ لیکن مَھْجُوْرٌ کے معنی اس سے کہیں گہرے ھیں ۔ آپ نے دیکھا ھوگا کہ جو گائے یا بھینس دوڑ جاتی ھو اس کے پاؤں کے ساتھ ایک رسی باندھ دیتے ھیں اور رسی کا دوسرا سرا اس کے سینگ کے ساتھ (یا گلے میں) باندھ دیتے ھیں لیکن رسی اتنی چھوٹی رکھتے ھیں کہ جانور کا سر بہت جھکا رھتا ھے ۔ وہ اس طرح یوں جکڑا جاتا ھے کہ آزادی سے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا ۔ عرب گھوڑوں اور اونٹوں کو اسی طرح جکڑ کر باندھ دیتے تھے ۔ اس طرح بندھے ھوئے جانور کو مَھْجُوْرٌ کہا جاتا تھا ۔ اَلْھِجَارُ اس رسی کو کہتے تھے جس سے انہیں اس طرح جکڑا جاتا تھا* ۔ رسول اللہؐ خدا سے فریاد کریں گے کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کو اپنے خود ساختہ اعتقادات ، خیالات ، رسومات ، روایات ، قوانین ، تفاسیر ، وغیرہ کی رسیوں سے جکڑ کر مَھْجُوْرٌ بنا رکھا تھا جس سے وہ ایک قدم بھی آزادی سے نہیں اٹھا سکتا تھا ۔ انہوں نے قرآن کریم کو چھوڑا نہیں تھا ۔ سینوں سے لگا رکھا تھا۔ لیکن اس کی ساری آزادیاں سلب کر رکھی تھیں اور اسے اتنا ھی چلنے کی اجازت دے دی جاتی تھی جتنی ان کے خود ساختہ ''مذھب وشریعت،، کی رسی مناسب سمجھتی تھی ۔ یعنی یہ قرآن کے تابع نہیں تھے ، قرآن کریم ان کے تابع تھا ۔ یہ ھے مطلب قرآن کریم کو مَھْجُوْرٌ بنا دینے کا ۔

ابن قتیبہ نے ھُجْرٌ کے معنی ھذیان بکنے کے بھی لکھے ھیں** ۔ اس اعتبار سے مندرجہ بالا آیت کا مطلب یہ ھوگا کہ انہوں نے قرآن کریم کو محض منتر بنا رکھا تھا ۔

---

*تاج ۔ **القرطبی ج/۲ صفحہ ۲۹ ۔

ھ ج ع

اَلْھُجُوْعُ ۔ سونا خواہ کسی وقت بھی ہو۔ یا رات کو سونا ۔ کبھی یہ سوئے بغیر صرف لیٹنے اور آرام کرنے کو بھی کہتے ہیں ۔ اَلتَّھْجَاعُ ۔ ہلکی سی نیند ۔ رَجُلٌ ھُجَعَۃٌ ۔ بیوقوف ، لا ابالی اور غافل آدمی* ۔

قرآن کریم میں ہے کَانُوْا قَلِیْلاً مِّنَ اللَّیْلِ مَا یَھْجَعُوْنَ (۵۱/۱۷) ۔ وہ رات کو بہت کم سوتے تھے (جس انقلاب عظیم کی وہ تیاریاں کر رہے تھے اور جو کام انہوں نے اپنے ذمے لیے رکھے تھے ، ان کی تکمیل میں وہ دن رات مصروف رہتے تھے اور رات کا بہت کم حصہ سونے میں گذارتے تھے (۷۳/۲۰-۲) ۔

ھ د د

اَلْھَدُّ ۔ کسی چیز کو سختی سے زور کی آواز کے ساتھ گرا دینا ۔ منہدم کر دینا ۔ عمارت کو توڑ کر گرا دینا ۔ اَلْھَادُّ ۔ سمندر کی آواز جسے اہل ساحل سنتے ہیں اور جس میں ایک گونج سی معلوم ہوتی ہے ۔ اور کبھی یہ آواز زلزلہ کا پیش خیمہ بھی ہوتی ہے ۔ اَلْھَادَّۃُ ۔ گرج (بادلوں کی)** ۔ اَلْھَدَّۃُ کسی چیز کے گرنے کی آواز۔ ھَدَّتِ الْبَقَرَۃَ ۔ میں نے گائے کو ذبح کرنے کے لئے گرا دیا ۔ اَلْھَدُّ ۔ گری ہوئی چیز*** ۔ ھَدَّدَہٗ تَھْدِیْدًا ۔ اس نے اسے دھمکایا اور خوف دلایا ** ۔

سورۃ مریم میں ہے وَتَخِرُّ الْجِبَالُ ھَدًّا (۱۹/۹۰) ۔ پہاڑ سخت آواز کے ساتھ گر کر ریزہ ریزہ ہو جائیں ۔

اَلْھُدْھُدُ ۔ وہ کبوتر جو زیادہ غٹرغوں کرے ۔ نیز ہر وہ پرندہ جو کبوتر کی طرح زیادہ بولے ۔ ایک معین پرندہ کو بھی کہتے ہیں* ۔ لیکن قصہ حضرت سلیمانؑ میں جس ھُدْھُد (۲۷/۲۰) کا ذکر ہے وہ ان کی فوج کے ایک افسر کا نام تھا ۔ اُس زمانے میں پرندوں اور جانوروں کے ناموں پر قبائل اور افراد کے نام عام طور پر رکھتے تھے ۔ (انگریزوں کے ہاں یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے ۔ وہاں لوگوں کے نام (Fox) اور (Lamb) عام طور پر ملتے ہیں ۔ ہندوؤں میں بھی طوطا رام اور چوہامل جیسے نام پائے جاتے ہیں) ۔ توریت (کتاب اول سلاطین) میں یہ نام (ھد ھد) کئی بار آیا ہے ۔ لسان العرب میں ہے کہ ھَدَا ھِدُ یمن کے ایک قبیلہ کا نام تھا ۔ اور تاج العروس میں ہے کہ ھَدَدٌ ۔ حمیر کے ایک بادشاہ کا نام تھا جو حضرت سلیمانؑ کا ہم عصر تھا ۔

---

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج و محیط ۔ ***راغب ۔

قرآن کریم میں اَلْھُدْھُدَ (ال کے ساتھ) آیا ہے - اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ اس شخص کا نام نہیں تھا، بلکہ اپنے قبیلہ یا فوج کی نمائندگی کی جہت سے اسے اس طرح پکارا گیا ہے -

ھ د م

اَلْھَدْمُ - عمارت کو توڑ دینا اور گرا دینا - اَلتَّھْدِیْمُ کے بھی یہی معنے ہیں لیکن اس میں زیادہ شدت پائی جاتی ہے - اَلْھَدْمُ - کمر توڑ دینا - اَلْھُدَامُ - چکر جو کسی کو سمندری سفر میں آتے ہیں - اِنْھَدَمَ الْبِنَاءُ - عمارت گر پڑی* - تَھَدَّمَ الْبِنَاءُ - عمارت تھوڑی تھوڑی کرکے گر پڑی** - دِمَاؤُھُمْ ھَدَمٌ - ان کے خون رائیگاں گئے* -

سورۃ حج میں ہے لَھُدِّمَتْ صَوَامِعُ (۲۲/۴۰) - عبادت گاہیں گرا دی جاتیں - یہاں یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ ان عبادت گاہوں کی عزت وحرمت کا لحاظ نہ کیا جاتا -

ھ د ھ د

الھُدْھُدُ - دیکھئے عنوان (ھ - د - د) -

ھ د ی

ھَدَی - کے بنیادی معنی نمایاں اور روشن ہونا - آگے آگے ہونا - اور دوسروں کے آگے آگے چلنا ہیں - چنانچہ روشن ہونے کی وجہ سے دن کو ھُدًی کہا جاتا ہے - اور ھَادِیَۃٌ اس ابھری ہوئی چٹان کو کہتے ہیں جو پانی میں دور سے نظر آجائے*** - قرآن کریم میں ہے اَفَلَمْ یَھْدِ لَھُمْ (۲۰/۱۲۸) - جس کے معنی ہیں، کیا یہ امران پر واضح، نمایاں اور روشن نہیں کیا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) راستہ بتانے کے لئے آگے بڑھ جانا اور (۲) ھدیہ اور تحفہ بھیجنا -

ھَادِ (جو اصل میں ھَادِیٌ تھا) - ہر چیز کے اگلے حصے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ دور سے پہلے نظر آجاتا ہے - اس لئے جانور کی گردن پر اَلْھَادِیُ کا اطلاق کیا جاتا ہے کیونکہ وہ باقی بدن سے آگے ہوتی ہے - اس اعتبار سے ھَدْیٌ اور ھَدِیٌّ - اُس جانور کو کہتے تھے جو حج کے موقع پر بیت اللہ میں ذبح کرنے کے لئے لے جاتے تھے کیونکہ اُس جانور کو آگے آگے رکھا

---

*تاج و راغب - **محیط - ***تاج و محیط -

جاتا تھا۔ ھَدِیَّۃٌ۔ اُس تحفہ کو کہتے ھیں جو بغیر معاوضہ دیا جائے، اس لحاظ سے کہ وہ ضرورت پڑنے سے پہلے ھی دیدیا جاتا ھے۔

ھَدَیٰ کے معنی ھیں راستہ کو پہچنوا دینا۔ واضح کرنا۔ راہ نمائی کرنا*۔ بعض اوقات ھُدٰی کے معنی راہ نمائی کی بجائے راہ نما ھوتا ھے۔ مثلاً اَوْ اَجِدُ عَلَی النَّارِ ھُدًی (۲۰/۱۰) میں ھُدٰی (راہ نمائی) کا مطلب الھَادِیُ یعنی راہ نما ھے**۔ سورۂ بقرہ میں ھے حَتّٰی یَبْلُغَ الْھَدْیُ مَحِلَّہٗ (۲/۱۹۶)۔ اس سے مراد وہ جانور ھے جسے مکہ میں (حج کی تقریب) پر ذبح کیا جائے۔ نیز ھر قسم کا سامان اور مال (جو وھاں بھیجا جائے)۔ ھَدِیَّۃٌ (۲۷/۳۵) تحفہ۔ ھَادٍ (۱۳/۷) راستہ دکھانے والا۔ مُھْتَدٍ (۵۷/۲۶)۔ ھدایت پایا ھوا۔

دین کا مدار اس بنیادی حقیقت پر ھے کہ عقلِ انسانی، اُن مستقل اقدار کو نہ وضع کر سکتی ھے اور نہ ھی از خود ان کا انکشاف کر سکتی ھے جنکے مطابق انسانی زندگی اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتی ھے۔ یہ اقدار خدا کی طرف سے ملتی ھیں۔ اسے وحی کہا جاتا ھے جو آخری بار نبی اکرمؐ کو ملی اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ھے۔ عقلِ انسانی کو اس وحی کی اسی طرح ضرورت ھے جس طرح انسانی آنکھ کو (سورج کی) روشنی کی۔ جب انسانی عقل، وحی کی راھنمائی میں چلیگی تو یہ دنیا جنت بن جائے گی ورنہ فساد اور خون ریزیوں کا جہنم بنی رھے گی۔ وحی کی اسی راہ نمائی کو ھدایت خداوندی کہتے ھیں جو انسان کو زندگی کی توازن بدوش راہ کی طرف لے جاتی ھے۔ قرآن کریم کی رُو سے ھدایت (راہنمائی) صرف وحی ھے جو خدا کی طرف سے ملی ھے۔ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی (۲/۱۲۰)۔ اس کے مقابلہ میں انسانوں کی تجویز کردہ راھنمائی، ھدایت نہیں، ضلالت ھے (۲/۱۶)۔ یہی راہ سیدھی ھے۔ اس کے علاوہ ھر راستہ ٹیڑھا ھے (۳/۷)۔ رسول، اسی ھدایت خداوندی کو لیکر آتے تھے۔ لیکن ان کے ذمے اس ھدایت کو لوگوں تک پہنچا دینا تھا۔ اُنہیں اس راستہ پر چلا دینا نہیں تھا (۲/۲۷۲ و ۲۸/۵۶)۔ سیدھے راستہ پر انسان خود اپنی رضا و رغبت سے چل سکتا ھے۔ زبردستی کسی کے چلانے نہیں چل سکتا۔ اس لئے کہ دین میں اکراہ نہیں (۲/۲۵۶)۔ خود خدا نے بھی انسانوں کے لئے زندگی کی راھوں کو روشن اور واضح کیا ھے۔ انہیں ان راھوں پر چلنے کے لئے مجبور پیدا نہیں کیا۔ اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوْرًا (۷۶/۳)۔ ھم نے اس کے لئے راستہ واضح کر دیا ھے۔ اب وہ چاھے تو اسے اختیار کرلے

*تاج و محیط۔ **تاج۔

اور چاھے اس سے انکار کر دے''۔ حقیقت یہ ھے کہ خود لفظ ''ھدایت'' اس امر کی شہادت دے رہا ھے کہ اس میں جبر کا کوئی پہلو نہیں۔ راستہ اسی کو بتایا جاتا ھے جو منزل تک پہنچنے کے لئے سفر اختیار کرنا چاھے اور بھٹک جانے کی مصیبتوں سے بچنا چاھے۔ انہی کو مُتَّقِیْن کہا جاتا ھے۔ قرآن کریم نے انہی معنوں میں اپنے آپ کو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (۲/۲) کہا ھے۔ یعنی جو لوگ غلط راستے کے خطرات سے محفوظ رھنا چاھیں ان کےلئے صحیح راستے کیطرف راہ نمائی۔

ھ ر ب

ھَرَبَ۔ یَهْرُبُ۔ هَرَبًا۔ وہ بھاگ گیا۔ هَرَبَ فِی الْاَرْضِ وہ زمین میں دور چلا گیا۔ هَرَّبَهٗ۔ اس نے کسی دوسرے آدمی کو بھگا دیا۔ هَرَبَ مِنَ الْوَتَدِ نِصْفُهٗ۔ میخ آدھی گھس گئی۔ اَهْرَبَ فُلَانٌ۔ فلاں آدمی معاملہ میں منہمک ھوگیا۔ مستغرق ھوگیا۔ اَهْرَبَتِ الرِّیْحُ۔ ھوا نے خاک اڑائی*۔

هَرَبَ۔ یَهْرُبُ۔ وہ زمین میں دور تک چلا گیا**۔

قرآن کریم میں ھے وَّ اَنَّاظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا (۷۲/۱۲)۔ ''اور ھمارا گمان ھے کہ نہ تو ھم زمین میں (مقابلہ کرکے) اللہ کو عاجز کرسکتے (شکست دے سکتے) ھیں اور نہ ھی بھاگ کر ایسا کرسکتے ھیں''۔ یعنی یہ نہیں ھوسکتا کہ ھم بھاگ کر اس کے قانون مکافات کی زد سے نکل جائیں اور اسطرح اسے ھرا دیں۔

ھ ر ع

اَلْهَرَعُ۔ وَ الْاِهْرَاعُ۔ سختی سے ھانکنا۔ تیز دوڑانا*۔ هُرِعَ اِلَیْهِ۔ اضطراب اور تیزی سے اس کی طرف پہنچا۔ اَلْاِهْرَاعُ۔ شدت شوق۔ اَلْمُهْرِعُ۔ شیر کو کہتے ھیں**۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے حرکت و اضطراب بتائے ھیں اور اُهْرِعَ الرَّجُلُ کے معنے بتائے ھیں وہ خوف سے کانپا۔ اور هُمْ یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ کے معنے، وہ اس کی طرف کشاں کشاں آئے۔ قرآن کریم میں قوم لوط کے متعلق ھے وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ (۱۱/۷۸)۔ اس کی قوم اس کی طرف شدت شوق سے تیزی کے

*تاج و راغب۔ **محیط۔

ساتھ دوڑتی ہوئی آئی ۔ یُھْرَعُوْنَ میں شوق کی شدت اور مضطربانہ تیزی پائی جاتی ہے ۔ اس لئے اس ایک لفظ نے ان کی اس حرکت کی پوری تصویر کھینچ دی ہے ۔ یُھْرَعُوْنَ مجہول کا صیغہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جذبات انہیں ایسا کرنے پر ابھار رہے تھے ۔

ھ ز ء

ھَزِیءَ ۔ ھَزْواً ۔ (اور ھُزُوْءً ۔ اور ھُزُوًا) کے معنی ہیں مذاق اڑانا ۔ رَجُلٌ ھُزْاَۃٌ ۔ اُس شخص کو کہتے ہیں جسکا لوگ بہت مذاق اڑائیں ۔ اور مَفَازَۃٌ ھَازِئَۃٌ بِالرَّکْبِ ۔ ایسا لق و دق جنگل جو سواروں کا مذاق اڑائے ۔ (یعنی اسکی وسعت اور ہیبت سے سوار اپنے آپ کو خفیف محسوس کرنے لگ جائیں) * ۔ منافقین اپنی پارٹی کے سرغنوں سے خلوت میں جا کر کہتے تھے کہ ہم جو جماعت مومنین سے جا کر ملتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو ہم صرف مذاق کرتے ہیں ۔ نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَ (۲/۱۴) ۔ قرآن کریم نے اس کے جواب میں کہا کہ وہ کیا مذاق کرینگے ۔ خدا کے قانون مکافات کی رو سے خود ان کے ساتھ مذاق ہو رہا ہے ۔ یہ سراب کو حقیقت سمجھ کر اسکے حصول میں پوری جدوجہد کرتے ہیں اور بالآخر دیکھتے ہیں کہ ان کی ساری کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں ۔ ان کا خود اپنی نفسیاتی فریب انگیزیوں میں اسطرح مارے مارے پھرنا ان کے ساتھ عملی مذاق ہے ۔ خدا کا مہلت کا قانون ان کی جلدی گرفت نہیں کرتا بلکہ ان کی رسی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے جس سے یہ اپنی بے راہ روی میں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں اور حقیقت کی دنیا میں اپنا مذاق آپ اڑواتے ہیں ۔ اَللّٰہُ یَسْتَھْزِیءُ بِھِمْ وَیَمُدُّھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ (۲/۱۵) ۔

سورہ حجر میں ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کائنات میں خدا کے علاوہ کسی اور کا اقتدار و اختیار بھی ہے ۔ یہاں قانون خداوندی کے علاوہ کسی اور کا قانون بھی کارفرما ہے ۔ تو یہ لوگ درحقیقت خدا کے ساتھ مذاق کرتے ہیں ۔ اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَھْزِئِیْنَ الَّذِیْنَ یَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھاً اٰخَرَ (۱۵/۹۵-۹۶) ۔ ” ہم ان مذاق کرنے والوں کے لئے تیری طرف سے کافی ہیں ۔ یہ جو اللہ کے ساتھ اور معبود اختیار کرتے ہیں “ ۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کے ساتھ مذاق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو مقام خدا کا ہے اس میں کسی اور کو بھی شریک سمجھ لیا جائے ۔ یا خدا کے متعلق عقیدہ و تصور

*تاج ۔

کو یونہی (Lightly) لیا جائے - اور زندگی کے حقائق پر (Seriously) غور نہ کیا جائے -

سورہ بقرہ میں ہے قَالُوْا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا (۶۷/۲) - انہوں نے کہا کیا تو ہم سے مذاق کر رہا ہے ؟

ھ ز ز

هَزَّهٗ - يَهُزُّهٗ - هَزًّا - کسی چیز کو حرکت دینا (کھینچ کر، دھکا دیکر، یا دائیں بائیں ہلا کر) - راغب نے کہا ہے کہ هَزٌّ - شدت کے ساتھ حرکت دینے کو کہتے ہیں - یعنی زور سے ہلانا *- سورہ مریم میں ہے وَهُزِّىْ اِلَيْكِ (۲۵/۱۹) - اسے زور سے اپنی طرف حرکت دے -

هَزَّ الْحَادِىْ الْاِبِلَ هَزًّا - حدی خواں نے پنی حدی سے اونٹوں کو پرنشاط اور مست کر دیا چنانچہ وہ ہلکے پھلکے ہو کر چلنے لگے - اسی سے اَلْهِزَّةُ - نشاط اورمستی کو کہتے ہیں (جس میں انسان جھومنے لگ جاتا ہے) - اِهْتَزَّ النَّبَاتُ - پودے لہلہانے لگے (ہوا سے ہلنے اور جھومنے لگے)* - قرآن کریم میں ہے فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ (۵/۲۲) - جب ہم مینہ برساتے ہیں تو پودے لہلہانے لگتے ہیں - دوسری جگہ یہ لفظ خَاشِعَةً کے مقابلہ میں آیا ہے (۳۹/۴۱) جس کے معنی پژمردگی ہیں -

ھ ز ل

اَلْهَزْلُ - کسی معاملہ کو سنجیدگی کے ساتھ (Seriously) نہ لینا - یونہی مذاق کےطور پر لینا - هِزِّيْلٌ - بہت مذاق کرنے والا - اَلْهُزَالَةُ - مذاق - اَلْهُزَالُ - لاغری کو کہتے ہیں ** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کمزوری ہیں - راغب نے کہا ہے کہ اَلْهَزْلُ ہر اس بات کو کہتے ہیں جس کا کوئی فائدہ اور نتیجہ نہ ہو*** - قرآن کریم میں خود قرآن کریم کے متعلق ہے اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۱۴-۱۳/۸۶) - یہ ایک فیصلہ کن حقیقت ہے - یونہی مذاق کی بات نہیں - یہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے بحث کرتا ہے، سطحی جذبات کی تسکین کے لئے سرسری گفتگو نہیں کرتا - یہ " شاعری " نہیں - اسکے ایک ایک لفظ پر بڑی سنجیدگی سے (Most Seriously) غور کرنا چاہئے - یونہی (Lightly) نہیں لینا چاہئے - نہ ہی اس کےمتعلق یہ سمجھنا چاہئے کہ اس میں خالی پند و نصائح کے

*تاج و راغب - **تاج - ***راغب -

طور پر باتیں کہ دی گئی ہیں ۔ قرآن کریم ایک حقیقت ثابتہ ہے اور اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بطور حقیقت کہا گیا ہے نہ محض جھوٹ موٹ ڈرانے دھمکانے کی خاطر۔

ہ ز م

هَزْمٌ ۔ کسی سوکھی چیز کو اتنا دبانا کہ وہ ٹوٹ جائے *۔ پھر اس کے معنی محض توڑ دینے کے ہو گئے **۔ تَهَزَّمَتِ الْقَوْسُ ۔ کمان آواز کے ساتھ پھٹ گئی ۔ اَلْهَزِيْمُ گرج جسکی آواز میں کٹاؤ ہو۔ هَزَمَ الْعَدُوَّ ۔ دشمن کو شکست دیدی ** (۲/۲۵۱) ۔

جُنْدٌ ... مَهْزُوْمٌ ۔ (۳۸/۱۱) شکست خوردہ لشکر۔ سورہ قمر میں ہے سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ (۵۴/۴۵)۔ یہ جمعیت شکست کھا جائیگی۔

ہ ش ش

هَشٌّ حرکت دینا ۔ (یہ هَزٌّ کے قریب المعنی ہے)۔ اور عام طور پر نرم چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے ۔ جیسے پتوں وغیرہ کو حرکت دینا *۔ یہیں سے هَشٌّ الْوَرَقَ کے معنی ہیں درخت سے پتے جھاڑنا (ابن فارس) ۔

حرکت اور نرمی کے مفہوم کے اعتبار سے اس کے معنی خوش ہونے کے بھی آتے ہیں ۔ آتا ہے، هَشٌّ بَشٌّ ۔ میں اس کے ساتھ بہت خوش ہوں ۔ اسی سے هشاش بشاش ہے ۔ اَلْهَشِيْشُ ۔ وہ سخی شخص کہ جب اس سے مانگا جائے تو وہ بہت خوش ہو**۔

سورہ طٰہٰ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کو وحی کی راہ نمائی عطا ہوئی اور اللہ نے ان سے پوچھا کہ اس ضابطہ ہدایت کے متعلق ان کا کیا خیال ہے کہ اس سے کیا کام لیا جائیگا ، تو آپ نے کہا کہ یہ میرے لئے عمر بھر کا سہارا ہوگا ۔ اور أَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ (۲۰/۱۸)۔ میں اس سے اپنی بھیڑوں (بنی اسرائیل) کے لئے غذائے نفس پیدا کرونگا ۔ آیت کے لفظی معنی ہیں ”میں اس (عصا) سے اپنی بھیڑوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں “۔

ہ ش م

اَلْهَشْمُ ۔ خشک چیز کو توڑ دینا (یا ہر ایسی چیز کو جس کا توڑنا دشوار نہ ہو) ۔ اَلْهَشِيْمُ ٹوٹا ہوا ۔ وہ گھاس جو خشک ہو کر چورہ چورہ ہو گئی ہو ۔ خشک گھاس یا درخت ***۔ سورہ کہف میں ہے فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا (۱۸/۴۵) وہ خشک ہو کر چورا چورا ہو جاتی ہے ۔ سورہ القمر میں ہے

*راغب ۔ **تاج ۔ ***تاج و راغب و محیط ۔

فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ (۵۴/۳۱)۔ وہ ایسے ردی چورے کیطرح ہوگیا جو باڑ بنانے والے کی باڑ سے خستہ ہو کر گرتا ہے ۔ یعنی بالکل ناکارہ ، خستہ و تباہ ۔

تَهَشَّمَ النَّاقَةَ ۔ اس نے پورے ہاتھ سے اونٹنی کا دودھ دوہ لیا (اور اس کے تھنوں کو خشک کرکے یا نچوڑ کر رکھ دیا)۔ اسی سے هَاشِمٌ ۔ روٹی توڑنے یا اس کا چورا کرنے والے کو کہتے ہیں ۔ نیز یہ عمرو العلاء کا لقب تھا جو عبدالمطلب کا باپ تھا کیونکہ وہ حاجیوں کو ثرید بنا کر کھلایا کرتا تھا ۔ روٹی کو توڑ توڑ کر سالن میں ڈالتے ہیں ۔ اسے ثرید کہتے ہیں ۔ اَلْهَشِيْمُ ۔ سخی آدمی کو کہتے ہیں ۔ اور الهَشْمُ خشک اور نشیبی زمین کو*۔

ھ ض م

هَضْمٌ ۔ کے اصلی معنی ہیں کسی نرم چیز کو کچلنا یا توڑنا ۔ کسی چیز کو کم کرنا ۔ هَضَمَ فُلَانًا ۔ اس نے فلاں آدمی پر ظلم کیا ۔ اسے دبایا اور اسکا حق غصب کر لیا ۔ ہماری زبان میں بھی اس مفہوم کے لئے یہی کہتے ہیں کہ فلاں نے اس کی چیز ہضم کر لی ۔ اَلْهَضَّامُ ۔ شیر کو کہتے ہیں ۔ هَضَمَهُ حَقَّهُ اس نے اس کا حق کم کر دیا ۔ اَلْهَضِيْمُ ۔ نرم ۔ لطیف ۔ پختہ ۔ خوشگوار ۔ وہ چیز جسکا ایک حصہ دوسرے میں گھسا ہوا ہو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں ۔

سورہ طٰہٰ میں ہے فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (۲۰/۱۱۲)۔ اس (جنتی معاشرہ) میں نہ حق تلفی کا خوف ہوگا نہ غصب و نہب کا ۔ اس میں نہ استبداد ہوگا نہ ناجائز انتفاع یا استحصال (Exploitation) ۔ سورہ شعراء میں ہے ۔ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ۔ (۲۶/۱۴۸) جن کے شگوفے تہ بہ تہ جمے ہوئے اور ایک دوسرے میں گھسے ہوئے ہوں ۔

ھ ط ع

هَطَعَ هَطْعًا وهُطُوْعًا ۔ تیزی سے کسی چیز کی طرف ڈرتے ہوئے بڑھنا ۔ یا کسی چیز پر نگاہیں جمائے ہوئے آگے بڑھنا اور نگاہوں کو اس پر سے ادھر ادھر نہ ہٹانا ۔ اَهْطَعَ کے بھی یہی معنی ہیں ۔ چنانچہ کہتے ہیں

*تاج و محیط و راغب ۔

أَهْطَعَ الْبَعِيْرُ فِیْ سَیْرِہٖ ۔ اونٹ نے چلنے میں اپنے سر کو سیدھا اور گردن کو لمبا کیا *۔ قرآن کریم نے جنگ کی بدحواسی کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں کہا ہے کہ مُهْطِعِيْنَ (۱۴/۴۳) ۔ لوگ اسطرح بدحواس ہو کر بھاگ رہے ہونگے کہ انہیں این و آں کی کچھ خبر نہ ہوگی ۔ ڈر اور دہشت کے مارے سیدھا رخ کئے بھاگ رہے ہونگے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں کسی چیز کی طرف رخ کرنے ، اسکی طرف بڑھنے ، نیز اطاعت و انقیاد کا مفہوم ہوتا ہے ۔

هَلْ (حرف)

هَلْ (۱) استفہام کے لئے آتا ہے ۔ مثلاً هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِيْنَ أَعْمَالًا (۱۸/۱۰۳) ۔ "کیا ہم تمہیں بتائیں کہ وہ لوگ کون ہیں جن کے اعمال انہیں سخت خسارے میں رکھینگے ؟"

(۲) قَدْ ۔ (یقیناً) کے معنوں میں آتا ہے ۔ هَلْ أَتٰی عَلَی الْإِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ (۷۶/۱) "یقیناً انسان پر ایسا وقت بھی گذر چکا ہے" ....

(۳) کبھی ، بطور استفہام ، مَا نافیہ کے معنوں میں آتا ہے ۔ هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ (۵۵/۶۰) ۔ کیا احسان کا بدلہ احسان کے سوا بھی کچھ ہے ؟ (یعنی احسان کا بدلہ احسان کے سوا اور کچھ نہیں) ۔

ه ل ع

اَلْهَلَعُ ۔ گھبراہٹ ۔ بے صبری ۔ بہت زیادہ ، حد سے متجاوز اور بد ترین قسم کی گھبراہٹ ۔ رنج و حزن ۔ اَلْهَلُوْعُ ۔ حریص اور انتہائی بخیل ۔ تنگ دل ۔ بےصبری کا مظاہرہ کرنے والا ۔ هَلِعَ يَهْلَعُ ۔ وہ بھوکا ہوگیا **۔ جب بھوک اور حرص اکٹھی ہو جائیں تو ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ انسان جتنا ہی چاہے کھا جائے اسکی بھوک مٹتی ہی نہیں ، اور ہر وقت واویلا ("ہے نہیں ۔ ہے نہیں") کرتا رہتا ہے ۔ ابن السکیت نے کہا ہے کہ رَجُلٌ هُلَعَةٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت جلد گھبرا کر واویلا کرنے لگ جائے اور ہمت ہار دے ***۔

قرآن کریم میں ہے اِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (۷۰/۱۹) ۔ انسان کو اگر علی حالہ چھوڑ دیا جائے تو اسکی حرص کبھی ختم ہی نہیں ہوتی ۔ یہ تو صرف نظام صلوٰۃ ہے جو اس میں سیر چشمی پیدا کر دیتا ہے (۷۰/۲۲) اور اس کے واویلے کو ختم کر دیتا ہے ۔

---

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج و محیط ۔ ***ابن فارس ۔

ہ ل ک

هَلَكَ - يَهْلِكُ - کے معنی مر جانے کے ہیں ، اگرچہ عوام اس لفظ کو بری موت کے لئے بولتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ٹوٹنے اور گر پڑنے کے ہیں - راغب نے کہا ہے کہ هَلَاكٌ کے معنے عذاب ، خوف اور فقر کے بھی ہوتے ہیں**۔ اِسْتَهْلَكَ الْمَالَ - مال کو خرچ کرکے ختم کردیا - أَهْلَكَ الْمَالَ - اس نے مال کو فروخت کر دیا - اَلْهَلَكُ - قحط کے سال* - اَلْهُلَّاكُ - فقیر اور نادار لوگ - وہ مسافر جو امداد اور صلہ حاصل کرنے کے لئے جائیں اور راستہ بھول جائیں - اَلْهَالِكَةُ - حریص اور لالچی نفس - اَلتَّهْلُكَةُ - ہر وہ چیز جو بالآخر تباہی کی طرف لے جائے* - راغب نے کہا ہے کہ کسی چیز کا اپنے پاس نہ رہنا - کسی چیز کا خراب اور بدحال ہوجانا، مر جانا یا بالکل ضائع ہوجانا، سب کے لئے هَلَاكٌ کا لفظ بولا جاتا ہے** -

قرآن کریم میں قوموں کی ہلاکت کا ذکر متعدد بار آیا ہے - اس میں شبہ نہیں کہ زمانۂ قدیم میں ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ کوئی بستی کسی طبعی حادثہ (مثلاً زلزلہ یا کوہِ آتش فشاں کے پھٹنے) کی وجہ سے بالکل تباہ ہو جائے - لیکن عام طور پر قوموں کی ہلاکت سے مراد ان کی ذلت و رسوائی اور کمزوری و محکومی ہوتی ہے - یعنی اگر کسی قوم سے سروری و سرفرازی چھن جائے تو وہ اس کی ہلاکت ہے - یہی وہ ہلاکت ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ - وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ ($\frac{2}{195}$) - نظام خداوندی کے قیام کے لئے اپنے اموال کو کھلا رکھو - ایسا نہ کروگے تو تم اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لوگے - بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی ہنگامی حادثہ یا عارضی سبب سے کوئی قوم وقتی طور پر گر جاتی ہے لیکن حالات کے سدھرنے پر وہ پھر اٹھ کھڑی ہوتی ہے (یہ اس کی حیاتِ نو یا نَشْاَۃِ ثانیہ کہلاتی ہے)۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے قصہ میں کہا گیا ہے کہ ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِکُمْ ($\frac{2}{56}$)۔ ”ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں پھر اٹھا کھڑا کیا“ - لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ تباہی عارضی نہیں ہوتی بلکہ وہ قوم ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جاتی ہے - سورۃ بنی اسرائیل میں پہلی صورت کو عذاب سے اور دوسری کو ہلاکت سے تعبیر کیا گیا ہے ($\frac{17}{58}$) نیز ($\frac{21}{95}$) - لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں - اس میں بھی استثناء کی گنجائش ہوتی ہے -

سورۃ قصص میں ہے ”کُلُّ شَیْءٍ هَالِکٌ اِلَّا وَجْهَهٗ“ ($\frac{28}{88}$)۔ اس کے معنی یہ کئے جاتے ہیں کہ تمام کائنات فنا ہو جائے گی اور صرف خدا کی

*تاج و محیط - **راغب -

ذات باقی رہ جائے گی ۔ اس کی تائید میں سورۃ رحمان کی یہ آیت پیش کی جاتی ہے ۔ "کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ ۔ وَ یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ (۵۵/۲۶-۲۷) ۔ لیکن ان آیات کا صحیح مفہوم یہ نہیں ۔ پہلی آیت میں ھَالِکٌ اور دوسری میں فَانٍ دونوں اسم فاعل ہیں اور اسم فاعل کو جب تک خصوصیت سے مستقبل کے ساتھ مشروط نہ کردیا جائے اسکے معنی زمانہ حال کے ہوتے ہیں۔ مثلاً اِنِّیْ جَاعِلٌ کے معنی یہ نہیں کہ میں بناؤنگا۔ اس کے معنی ہیں میں بنا رہا ہوں ۔ لہذا ھَالِکٌ اور فَانٍ کے معنی یہ نہیں کہ یہ کائنات ایک دن فنا ہو جائیگی* ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیز (فنا اور ہلاکت) اب ہو رہی ہے ۔ کائنات کی ہر شے حالتِ فنا و ہلاکت سے گزر رہی ہے ۔ فنا کے معنی معدوم ہو جانا نہیں ۔ اس کے معنی ہیں تغیر پذیر ہو جانا ۔ ایک حال پر نہ رہنا ۔ اور ہلاکت کے معنے بھی قوت کے کم ہو جانے کے ہیں۔ لہذا ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی کوئی شے مستقل طور پر ایک حالت میں نہیں رہتی ۔ ہر شے میں ہر آن تغیرات نمودار ہوتے رہتے ہیں ۔ اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ۔ اس کی قوت میں کمزوری آتی رہتی ہے لیکن خدا کا وہ قانون (یا وہ راستہ) جو عالمگیر نشو و نما کی طرف لے جاتا ہے تغیر نا آشنا ہے ۔ وہ تغیرات کے اثر سے مامون رہتا ہے ۔ اسی کو مستقل قدر کہتے ہیں ۔ لہذا ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے تغیر پذیر یا روبہ انحطاط ہے ، بجز مستقل اقدار کے جو قوانین خداوندی کی رو سے متعین ہوتی ہیں اور جن کا نتیجہ خدا کی ربوبیت کبریٰ (عالمگیر نشو و نما) ہے ۔ لہذا وہی نظریہ زندگی ، وہی نظام حیات ، وہی قوم ، تغیرات اور انحطاط سے محفوظ رہ سکتی ہے جو اپنا دامن ان مستقل اقدار کے ساتھ باندھ لے ۔ جو قوم ایسا نہیں کرتی اس کا غلبہ و تسلط اور قوت و اثر آہستہ آہستہ ضائع ہوتا رہتا ہے اور ایک دن ختم ہو جاتا ہے ۔ اسی کے متعلق سورۃ اَلْحَاقَّۃ میں ہے کہ ھَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ (۶۹/۲۹) ۔ "میرا غلبہ مجھ سے جاتا رہا" ۔ قوتیں ضعف سے بدل گئیں ۔

آیات مندرجہ صدر میں "وجہ رب" کے معنی خود ذات خداوندی بھی ہوسکتے ہیں

*کائنات کا انجام کیا ہوگا ۔ یہ بھی اس قسم کا راز ہے جس قسم کا راز کائنات کا آغاز ہے ۔ یہ امور انسانی شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ میں نہیں آسکتے ۔ بہر حال ، کائنات خدا کی پیدا کردہ ہے ۔ اسی کے قانون کے مطابق قائم ہے ۔ اور اسی کے مطابق اس کا انجام ہوگا ۔ ابدی تو یہ بہرحال نہیں ۔ یعنی اُن معنوں میں ابدی جن معنوں میں خدا ابدی ہے ۔ ہمارے لئے یہ سوال بھی بیکار ہے کہ کائنات کا انجام کیا ہوتا ہے ۔ اس لئے کہ ہم نے تو بہر حال ایک دن موجودہ ارضی زندگی کو چھوڑنا ہے ۔ ہمارا کام یہ ہے کہ جب تک اس میں رہیں اس کے حسن میں اضافہ کرتے چلے جائیں ۔

ہ ل ل

اَهْلاَلٌ - کے اصلی معنی ہوتے ہیں آواز بلند کرنا* - راغب نے لکھا ہے کہ رویت ہلال کے موقع پر اونچی آواز نکالنے کے لئے بولا جاتا ہے ، بعد ازاں ہر آواز کے لئے بولا جانے لگا** - هَلَّ الرَّجُلُ - آدمی چیخا. اِسْتَهَلَّ الصَّبِيُّ - بچہ نے پیدا ہوتے ہی رونے کی آواز بلند کی - اَلْهِلاَلُ - مہینے کی پہلی اور دوسری تاریخ کا چاند - بعض نے کہا ہے کہ تیسری تاریخ بلکہ ساتویں تاریخ تک کے چاند کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے - (اسی طرح قمری مہینے کی چھبیس - ستائیس تاریخ کے چاند کو بھی کہتے ہیں)- هِلاَلٌ کو هِلاَلٌ اس لئے کہتے ہیں کہ لوگ جب اسے دیکھتے ہیں تو ایک دوسرے کو آواز دے کر بتاتے ہیں* - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے آواز بلند کرنا لکھے ہیں - اَهَلَّ الشَّهْرَ - مہینہ کا چاند دیکھ لیا* - اَلْهَلاَلُ اور اَلْهِلاَلُ - پہلی بارش کو بھی کہتے ہیں*- (لیکن اسی بارش کو جسکے برسنے کی آواز آئے) -

اَلْهَلَّلُ - ہاتھی کے مغز کو کہتے ہیں جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ زہر قاتل ہوتا ہے - یعنی زہر ہلاہل*- هَلَّلَ - یہودی اور نصرانی اس لفظ کو تسبیح پڑھنے کے لئے استعمال کرتے ہیں جو عبرانی اور سریانی زبان کا لفظ ہے** - ہمارے ہاں بھی تسبیح و تہلیل کہتے ہیں - هَلَّلَ کے معنی ہیں لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا** -

قرآن کریم میں (کھانے پینے کی حرام اشیاء کی فہرست میں) ہے وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ($\frac{۲}{۱۷۳}$)- یعنی وہ چیز جسے خدا کے سوا کسی دوسرے کے نام سے پکارا جائے - جو چیز بھی خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دی جائے وہ قرآن کریم کی رو سے حرام ہو جاتی ہے - مؤمن کے لئے خدا کے سوا کسی اور قوت کا تصور شرک ہے - '' منسوب ہونے '' - یا خدا کے علاوہ کسی دوسرے کے نام سے پکارے جانے کا مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے - مثلاً شاہ مدار کے نام پر بکرا چھوڑ دیا جاتا ہے - بکرا ویسے تو حلال جانور ہے لیکن چونکہ اسے اللہ کے سوا کسی اور کے نام سے پکارا گیا ہے ، یا اسے اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے ، اس لئے اس کا کھانا حرام ہو جائے گا - اسی طرح کھانا پکا کر کہدیا جائے کہ یہ فلاں پیر صاحب کی نیاز ہے تو اگرچہ وہ کھانا پاک اور صاف ، حلال اور طیب تھا لیکن غیر اللہ کی طرف نسبت سے وہ حرام

---

*تاج - **محیط - ***راغب -

ہوجائے گا ۔ اس لئے کہ اس نسبت میں شرک کا پہلو آجاتا ہے اور یہ توحید کے مناف ہے ۔ قرآن کریم انسان کے عقائد اور تصورات کو شرک کے شائبہ تک سے پاک رکھنا چاہتا ہے ۔ کیونکہ شرک وجہِ تذلیل انسانیت ہے ۔

ھَلُمَّ

ھَلُمَّ (۱) آؤ ۔ ھَلُمَّ اِلَیْنَا (۱۸/۳۳) ۔ ہماری طرف آؤ ۔

(۲) لاؤ ۔ ھَلُمَّ شُهَدَآءَ کُمْ (۱۵۱/۶) ۔ اپنے گواہ لاؤ ۔

ھُمْ

ھُمْ ۔ جمع مذکر غائب کی ضمیر مرفوع منفصل ہے ۔ ھُمْ رِجَالٌ وہ سب آدمی ہیں ۔ سورۃ منافقون میں ہے ھُمُ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ . . . (۷/۶۳) یہ وہ ہیں جو کہتے ہیں ۔

(۲) ھُمْ ضمیر منصوب متصل بھی ہے ۔ جمع مذکر غائب کے لئے آتی ہے ۔ ضَرَبَھُمْ ۔ اس نے ان سب کو مارا ۔ سورۃ بقرہ میں ہے ثُمَّ عَرَضَھُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ (۳۱/۲) ۔ پھر انہیں ملائکہ کے سامنے کیا ۔

(۳) نیز یہ ضمیر مجرور متصل کے طور پر بھی آتی ہے ۔ غُلَامُھُمْ ۔ ان سب کا غلام ۔

سورۃ طٰہٰ میں ہے حِبَالُھُمْ وَ عِصِیُّھُمْ . . . (۶۶/۲۰) ۔ ان کی رسیاں اوران کی لاٹھیاں . . .

ھُمَا (ضمیر)

ھُمَا ۔ تثنیہ غائب کی ضمیر مرفوع منفصل ہے ۔ اور مذکر و مؤنث دونوں کے لئے آتی ہے ۔ ھُمَا رَجُلَانِ ۔ وہ دونوں مرد ہیں ۔ ھُمَا اِمْرَاَتَانِ ۔ وہ دونوں عورتیں ہیں ۔ سورۃ توبہ میں ہے اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ (۴۰/۹) ۔ ”جب وہ دونوں غار میں تھے“ ۔

(۲) یہ ضمیر منصوب متصل کےطور پر بھی استعمال ہوتی ہے اورتثنیہ غائب کے لئےآتی ہے ۔ اور مذکر و مؤنث دونوں کے لئےیکساں طور پر آتی ہے ۔ ضَرَبَھُمَا ۔ اس نے ان دونوں کو مارا ۔ سورۃ بقرہ میں ہے ۔ فَاَزَلَّھُمَا الشَّیْطٰنُ . . . (۳۶/۲) ۔ پس شیطان نے ان دونوں کو پھسلا دیا ۔

(۳) نیز یہ ضمیر مجرور متصل کے طور پر بھی آتی ہے ۔ غُلَامُهُمَا ۔ ان دونوں کے غلام ۔ (مذکر و مؤنث دونوں کیلئے) ۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے بِسِحْرِهِمَا (۲۰/۶۳) ۔ (یہ دونوں) اپنے سحر کے زور سے . . .

ھ م د

اَلْهُمُوْدُ ۔ آگ کا بجھ جانا ۔ خَمَدَتِ النَّارُ اُسوقت کہتے ہیں جب اس کا شعلہ بیٹھ جائے ، اور هَمَدَتْ هُمُوْدًا اسوقت جب وہ بالکل ہی بجھ جائے ۔ اور جب وہ راکھ ہو جائے تو اس کے لئے هَبَا يَهْبُوْ کہتے ہیں ۔ اَلْهُمُوْدُ فِي الْاَرْضِ ۔ زمین میں زندگی کا باقی نہ رہنا ۔ یعنی نہ اس میں درخت و سبزہ ہو نہ اس پر بارش برسی ہو* ۔ قرآن کریم میں ہے وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً (۲۲/۵) ۔ تم زمین کو مردہ دیکھتے ہو جہاں سبزی کا نام و نشان تک نہیں ہوتا ۔

ھ م ر

هَمَرَ الْمَاءَ يَهْمِرُهُ ۔ اس نے پانی کو گرا دیا ۔ یا بہا دیا ۔ هَمَرَ الدَّمْعَ ۔ اس نے آنسو بہائے ۔ اِنْهَمَرَ الدَّمْعُ وَالْمَطَرُ ۔ آنسو اور بارش بہے ۔ اَلْهَمَّارُ ۔ خوب برسنے والا بادل ** ۔

قرآن کریم میں حضرت نوحؑ کے قصہ میں ہے فَفَتَحْنَا اَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُّنْهَمِرٍ (۵۴/۱۱) ۔ پھر ہم نے آسمان کے دروازے زور سے برسنے والے پانی سے کھول دیئے ۔

ھ م ز

اَلْهَمْزُ ۔ کچوکا دینا ۔ دھکا دینا ۔ اور مارنا ۔ کاٹ کھانا ۔ اَلْهَامِزُ کچوکے مارنے والا ۔ جماعت میں تفریق ڈالنے والا ۔ دوستوں میں جھگڑا ڈلوانے والا ۔ غیبت کرنے والا ۔ یہی معنی مبالغہ کے ساتھ اَلْهُمَزَةُ میں پائے جاتے ہیں ۔ اَلْمِهْمَزُ ۔ اَلْمِهْمَازُ ۔ لوہے کی نکیلی چیز (میخ سی) جو سوار کے جوتے میں لگی ہوتی ہے اور اس سے وہ جانور کو کچوکے مارتا جاتا ہے تاکہ وہ تیز بھاگے*** ۔ اسی کو ہماری زبان میں مہمیز (یا ایڑھ) لگانا کہتے ہیں ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْهَمْزُ نچوڑنے نیز غیبت کرنے کو کہتے ہیں **** ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی دبانے اور نچوڑنے کے لکھے ہیں ، اور هُمَزَةٌ وهَمَّازٌ کے معنی عیب چینی کرنے والا ۔

---

*تاج ۔ **تاج ، محیط و راغب ۔ *** تاج و محیط ۔ **** راغب ۔

سورہ مومنون میں ھَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ (۲۳/۹۷) آیا ہے۔ سرکش مخالفین کی تمام وہ تدبیریں جن سے وہ جماعت مومنین میں تفرقہ انگیزی چاہتے ہوں۔ سورہ قلم میں ھَمَّازٍ (۶۸/۱۱) آیا ہے۔ سورہ ھُمَزَۃ میں ھُمَزَۃٍ (۱۰۴/۱) آیا ہے۔ معنی ہر جگہ ایک ہی ہیں۔ یعنی اپنی دسیسہ کاریوں سے جماعت میں تفریق پیدا کرنے والے۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں ایسا شخص جسے ہر جگہ خرابی ہی خرابی نظر آئے اور وہ ہر ایک کے کام میں نقص نکالتا رہے۔ وہ نہ کائنات کے حسن کی تحسین (Appreciation) کا جذبہ رکھتا ہو اور نہ ہی کسی کے اچھے کام کی تعریف کرے۔ یہ ذہنیت سرمایہ دار کی ہوتی ہے جو سمجھتا ہے کہ اس کے پاس جو اسقدر مال و دولت ہے تو اس سے دنیا بھر کی خوبیاں اس میں جمع ہو گئی ہیں۔ جس کے پاس دولت نہیں اس میں کوئی خوبی نہیں ہو سکتی۔ (المقام المحمود)۔

ہ م س

اَلْھَمْسُ۔ خفی آواز۔ قدموں کی مخفی ترین آہٹ۔ اَلْھَمِیْسُ۔ اونٹوں کے پاؤں کی آہٹ*۔ قرآن کریم میں ہے۔ لَا تَسْمَعُ اِلَّا ھَمْسًا۔ تو نہایت ہلکی سی آواز کے سوا کچھ نہیں سنے گا۔

اَلْھَمْسُ۔ منہ کو بند کرکے کھانے کو چبانا تاکہ آواز نہ نکلے۔ اَلْھَمْسُ۔ نچوڑنا۔ کوٹنا۔ اَلْمُھَامَسَۃُ۔ آپس میں راز داری کی باتیں کرنا*۔ سورہ طٰہٰ میں ہے فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا ھَمْسًا (۲۰/۱۰۸)۔ تو سوائے ہلکی سی آواز کے کچھ نہیں سنے گا۔

ہ م م

ھَمٌّ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پگھلنے، بہنے اور آہستہ آہستہ رینگنے کے ہوتے ہیں۔ اَلْھَمُّ۔ غم اور حزن۔ کیونکہ وہ آدمی کو پگھلا دیتا ہے۔ ھَمٌّ اور غَمٌّ میں فرق یہ ہے کہ غَمٌّ اس کرب کو کہتے ہیں جو کسی بات کے واقع ہو جانے کے بعد دل میں پیدا ہو۔ اور ھَمٌّ اس کرب کو کہتے ہیں جو کسی پیش آنے والی مصیبت کے خیال سے پیدا ہو رہا ہو**۔ ھَمَّہٗ وَ اَھَمَّہٗ۔ اسے غمگین اور بے چین کیا۔ سورہ آل عمران میں ہے وَطَآئِفَۃٌ قَدْ اَھَمَّتْھُمْ اَنْفُسُھُمْ (۳/۱۵۳)۔ ایک گروہ کو خود اسکی اپنی جانوں نے (اپنے خیالات کے وجہ سے) فکر مند کر رکھا تھا۔ یعنی وہ سچ مچ کسی مصیبت میں مبتلا نہیں تھے بلکہ موہوم خطرات کے تصور سے خواہ مخواہ مضطرب و بیقرار ہو رہے تھے۔

*تاج و محیط و راغب۔ **تاج۔

اَلْھَمُّ۔ کسی بات کی دل میں نیت کرنا۔ ارادہ کرنا*۔ ھَمَّ بِالشَّیْءِ۔ کسی چیز کا ارادہ و قصد کیا لیکن اسے کیا نہیں**۔ وَلَقَدْ ھَمَّتْ بِہٖ، وَھَمَّ بِھَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْھَانَ رَبِّہٖ (۱۲/۲۴)۔ عزیز کی بیوی نے اپنے دل میں ارادہ کر لیا (کہ یوسف کو اپنے دام ھوس میں پھانس کر چھوڑیگی) اور ھو سکتا تھا کہ یوسف بھی ایسی نیت کر لیتا اگر اس کے سامنے خدا کا واضح قانون نہ آچکا ھوتا*۔ یعنی عزیز کی بیوی چونکہ محض اپنے جذبات کے تابع چل رھی تھی اسلئے اسے اس ارادۂ بد سے روکنے والی کوئی چیز نہ تھی لیکن حضرت یوسفؑ کے سامنے خدا کا قانون تھا اسلئے وہ ایسا ارادہ کر ھی نہیں سکتے تھے۔ غور کیجئے قرآن کریم نے اس داستان کے اتنے سے ٹکڑے میں کیسی عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ھے۔ جب انسانی جذبات اور کسی مستقل اور بلند قدر میں (Tie) پڑ جائے تو مومن اس بلند قدر کے تحفظ کے لئے جذبات کے تقاضے کو قربان کر دیتا ھے۔ اسی کا نام بلند اقدار پر ایمان ھے۔

سورہ مومن میں ھے وَھَمَّتْ کُلُّ اُمَّةٍ بِرَسُوْلِھِمْ لِیَاْخُذُوْہُ (۴۰/۵)۔ ھر قوم نے اپنے رسول کے خلاف (نقصان پہنچانے کی) تدبیریں کیں یا اسکا ارادہ کیا۔ اَلْھِمَّةُ۔ جس کام کے کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا جائے۔ پختہ ارادہ۔ آغازِ ارادہ*۔ اَلْمُھِمَّاتُ مِنَ الْاُمُوْرِ۔ نہایت اھم امور*۔

ھُنَا

ھُنَا۔ ھٰھُنَا۔ یہاں۔ یہیں۔ اِنَّا ھٰھُنَا قَاعِدُوْنَ (۵/۲۴)۔ ھم یہاں بیٹھے ھیں (نیز ۳/۱۵۴)۔ ھُنَالِکَ۔ وھاں۔ ھُنَالِکَ دَعَا زَکَرِیَّا (۳/۳۸)۔ وھاں زکریا نے پکارا۔ ھُنَالِکَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ (۳۳/۱۱)۔ وھاں مومنوں کے ابتلاء کا وقت آیا۔

ھ ن أ

اَلْھَنِیْءُ۔ ھر وہ چیز جسکے حاصل کرنے میں کوئی مشقت نہ ھو اور جسکے نتیجہ میں کوئی برائی نہ ھو۔ یہ لفظ دراصل خوراک کے لئے بولا جاتا ھے، اگرچہ دوسری چیزوں کے لئے بھی استعمال کر لیا جاتا ھے***۔ طَعَامٌ ھَنِیْءٌ۔ خوشگوار کھانا۔ اَلتَّھْنِئَةُ۔ تعزیت کے خلاف ھے۔ مبارک باد دینا*۔ سورہ نساء میں ھے۔ فَکُلُوْہُ ھَنِیْٓــًٔا مَّرِیْٓــًٔا (۴/۴)۔ اسے خوشگواری سے کھاؤ (اپنے تصرف میں لاؤ)۔

*تاج۔ **محیط۔ ***راغب۔

ھُنَّ (ضمیر)

ھُنَّ - جمع مؤنث غائب کی مرفوع منفصل ضمیر ہے - ھُنَّ نِسْوَۃٌ وہ سب عورتیں ہیں -

(۲) ھُنَّ - ضمیر منصوب متصل بھی ہے - ضَرَبَھُنَّ - اس نے ان سب عورتوں کو مارا -

(۳) نیز یہ ضمیر مجرور متصل بھی ہے - غُلَامُھُنَّ - ان سب عورتوں کا غلام -

سورۃ بقرہ میں ہے ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ (۲/۱۸۷) ''وہ تمہارے لئے (بمنزلہ) لباس ہیں -

سورۃ نساء میں ہے فَانْکِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِھِنَّ وَ اٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ.... (۴/۲۵) ان کے مالکوں کی اجازت سے انہیں نکاح میں لاؤ اور ان کے مہر انہیں دے دو -

ھُوَ (ضمیر)

ھُوَ - واحد مذکر غائب کے لئے ضمیر مرفوع منفصل ہے - ھُوَ رَجُلٌ وہ ایک مرد ہے - ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ... (۵۹/۲۲) وہی اللہ ہے -

ھ و د

اَلْھَوْدُ - نرمی اور سہولت کے ساتھ حق کی طرف رجوع کرنا* - قرآن کریم میں ہے - اِنَّا ھُدْنَا اِلَیْکَ (۷/۱۵۶) - ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں - اَلْھَوْدُ - یہود* - ھَادَ - وہ یہودی ہوا - یَتَھَوَّدًا - حضرت یعقوب[ؑ] کے ایک بیٹے کا نام تھا* -

سورۃ بقرہ میں ہے اِلَّا مَنْ کَانَ ھُوْدًا.... (۲/۱۱۱) - سوائے ان کے جو یہودی ہوں - اور سورۃ مائدہ میں ہے وَ الَّذِیْنَ ھَادُوْا.... (۵/۶۹) - اور جو لوگ یہودی ہوئے - (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ''موسیٰ[ؑ]'') -

ھود علیہ السلام

قوم نوح کی جانشین، قوم عاد ہوئی (۷/۶۹) - تفصیل عنوان ''نوح[ؑ]'' میں دیکھئے - ان کی طرف ان کے بھائی، حضرت ھود[ؑ] مبعوث ہوئے - (۷/۶۵) - یہ لوگ جسمانی طور پر، مضبوط اور طاقتور تھے - بڑے ڈیل ڈول والے تھے -

*تاج و محیط و راغب -

(۷/۶۹)۔ اور ان کی زمینیں بڑی زرخیز تھیں (۲۶/۱۳۴)۔ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے بھی وہ قوم نوحؑ سے آگے تھے ۔ یہ بڑے بڑے مضبوط قلعے بناتے تھے (۲۶/۱۲۹)۔ اور پہاڑوں کی بلندیوں پر یادگاریں تعمیر کرتے تھے (۲۶/۱۲۸) ۔ اور علم و بصیرت بھی رکھتے تھے (۲۶/۲۹) ۔ لیکن بڑے مستبد اور جبار تھے ۔ غریبوں اور مظلوموں کو اپنے فولادی شکنجوں میں کس کر رکھتے تھے (۲۶/۱۳۰) ۔

حضرت ھودؑ نے انہیں خدا کا وہی پیغام دیا جو اس سے قبل حضرت نوحؑ اپنی قوم کو دے چکے تھے ۔ یعنی یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ۔ ۔ ۔ ۔ (۷/۶۵) ۔ اے میری قوم! اللہ کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا الٰہ اور کوئی نہیں ۔ حسب معمول ، سردارانِ قوم (مترفین کے طبقہ) کی طرف سے اس دعوت کی مخالفت ہوئی (۷/۶۶) ۔ اور وہ اس شدت مخالفت میں اس قدر اندھے ہوگئے کہ ان کا علم و بصیرت بھی ان کے کسی کام نہ آیا (۲۶/۲۹) ۔ اور تباہ کن آندھی نے انہیں برباد کرکے رکھدیا (۵۱/۴۱۔۴۲) ۔ اور ان کی جڑ کٹ گئی (۷/۷۲) ۔ قرآن کریم نے اس قوم کو ''عادِ اولیٰ'' بھی کہا ہے (۵۳/۵۰) ۔

(جو قومیں اس طرح ہلاک ہوئی تھیں، ان کے اعمال اور ان طبعی حوادث میں کیا تعلق تھا ، اس کے لئے میری کتاب ''جوئے نور'' میں عنوان ''حضرت نوحؑ'' دیکھئے) ۔

ھ و ر

ھَارَ الْبِنَاءَ ھَوْرًا ۔ اس نے عمارت کو منہدم کر دیا ۔ فَتَھَارَ ۔ پس وہ منہدم ہوگئی ۔ (لازم و متعدی) ۔ منہدم ہونے اور پھٹ کر گر پڑنے کے لئے اِنْھَارَ بھی آتا ہے ۔ وَ ھُوَ ھَائِرٌ وَ ھَارٍ (اسم فاعل) ۔ تَھَوَّرَ وہ منہدم ہوگیا ۔ تَھَوُّرٌ ۔ کسی چیز کا حوض کے کنارے یا کنویں کے دہانے سے حوض یا کنویں کے اندر گر پڑنا ۔ تَھَوَّرَ الرَّجُلُ ۔ آدمی معاملہ میں بلا سوچے سمجھے گھس گیا* ۔ یعنی اس میں اس طرح گر گیا جس طرح دریا کا کنارہ دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے ۔ اسے تَھَوُّرٌ کہتے ہیں* ۔ قرآن کریم میں ہے عَلٰی شَفَا جُرُفٍ ھَارٍ فَانْھَارَ بِہٖ (۹/۱۰۹) ۔ ایک گرنے والے کنارے کی بالکل آخری حد پر جو اسے لے کر نیچے گر جائے ۔

ھ و ن

ھَانَ ۔ یَھُوْنُ ۔ ھَوْنًا ۔ ذلیل ہونا اور ھَانَ ھَوْنًا سہل اور آسان ہونا ۔ یعنی نرمی اور سہولت اور ذلت و رسوائی دونوں کے لئے یہ مادہ آتا ہے** ۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سکون ۔ سکینت و اطمینان یا ذلت کے ہوتے ہیں ۔ راغب نے لکھا ہے کہ جب انسان اپنے مزاج میں خود ہی ایسی نرمی اور جھکاؤ پیدا کرلے جس میں اسکی سبکی نہ ہوتی ہو تو یہ نرمی اور جھکاؤ محمود ہوتا ہے لیکن اگر کوئی مستبد قوت کسی میں نرمی اور جھکاؤ پیدا کرے جس میں اسکی ذلت و رسوائی کا پہلو ہو تو یہ مذموم ہوتا ہے **۔ هَوَّنَ الشَّیْءَ وَاَهَانَهٗ ۔ کسی چیز کو حقیر سمجھنا ۔ اسکی اہانت کرنا ۔ اَلْهَیِّنُ ۔ ذلیل نیز آسان و سہل ۔ اَلْهَوَانُ وَالْمَهَانَةُ ۔ ضعف اور کمزوری *۔ ذلت و حقارت ***۔

هَیِّنٌ ۔ ساکن اور مطمئن ۔ اِمْرَاَةٌ هَوْنَةٌ ۔ مطمئن اور سہولت کے ساتھ کام کرنے والی باوقار عورت ۔ سَارَ عَلٰی هِیْنَتِهٖ ۔ وہ اپنی عادت کے مطابق نرمی اور سہولت کے ساتھ چلا ۔

سورۃ نحل میں ہے کہ جب ان (بدؤوں) میں سے کسی کو لڑکی کی پیدائش کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر رنج و غم کی گھٹا چھا جاتی ہے اور وہ قوم سے چھپتا پھرتا ہے اور پھر سوچتا ہے کہ اَیُمْسِکُهٗ عَلٰی هُوْنٍ اَمْ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ (۱۶/۵۹) ۔ وہ (اس لڑکی کو جس کی پیدائش کی خبر ملی ہے) ذلت و رسوائی کی خاطر باقی رہنے دے یا اسے مٹی میں دبا دے ۔

سورۃ الفرقان میں جہنم کے متعلق ہے یَخْلُدْ فِیْهٖ مُهَانًا (۲۵/۶۹) ۔ اس میں ذلت و رسوائی کا مفہوم ہے ۔ سورۃ مریم میں ہے هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ (۱۹/۹)۔ یہ مجھ پر سہل اور آسان ہے ۔ سورۃ نور میں ہے تَحْسَبُوْنَهٗ هَیِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمٌ (۲۴/۱۵) ۔ تم اسے معمولی بات سمجھتے ہو حالانکہ قانون خداوندی کی رو سے وہ بہت بڑی بات ہے ۔

سورۃ الفجر میں تنگی رزق کی وجہ سے ذلیل اور کمزور کرنے کے لئے رَبِّیْٓ اَهَانَنِ (۸۹/۱۶) آیا ہے ۔

لہذا قرآن کریم میں جہاں عَذَابٌ مُّهِیْنٌ (۲/۹۰) آیا ہے تو اس کے معنی ہیں ایسی سزا جو ذلیل و رسوا بھی کر دے اور جس سے قوم کی قوت ٹوٹ کر اسمیں ضعف اور کمزوری آ جائے ۔ محکومیت میں یہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں ۔ نیز دوسروں کے آسروں پر جینے والی قوموں میں ۔

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** محیط ۔

سورۃ الفرقان میں عبادالرحمٰن کے متعلق ہے یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا (۲۵/۶۳) - وہ دنیا میں نہایت اطمینان و سکون سے چلتے پھرتے ہیں - نہ ان میں کسی قسم کی افراتفری ہوتی ہے نہ خوف اور گھبراہٹ - اس لئے کہ وہ کمزور اور ذلیل نہیں ہوتے- وہ اَعْلَوْنَ ہوتے ہیں (۳/۱۳۸) - سب پر غالب - اگر اس میں صرف رفتار کے انداز کا ذکر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ میانہ روی سے چلتے ہیں اور یونہی اکڑتے نہیں پھرتے (۳۱/۱۸، ۱۷/۳۷) اور اگر یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ کے معنی زمین میں غلبہ و حکومت ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی حکومت قہر اور استبداد کی حکومت نہیں ہوتی -

(جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) سورۃ الفجر میں ہے کہ جب انسان پر رزق کی تنگی کی وجہ سے ذلت و خواری کا عذاب آ جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ رَبِّیْ اَهَانَنِ (۸۹/۱۶) "میرے رب نے مجھے یونہی ذلیل کر دیا" - قرآن کریم کہتا ہے کہ خدا کسی کو یونہی ذلیل نہیں کیا کرتا - ہر شخص اپنے اعمال کی وجہ سے سرفراز ہوتا ہے اور اعمال ہی کی وجہ سے ذلیل ہوتا ہے- تم جو ذلیل ہوئے ہو تو اسکی وجہ یہ ہے کہ جب تمہارے پاس رزق کی فروانی تھی تو لَا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ - وَ لَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۸۹/۱۷-۱۸) - تم ان لوگوں کی جو معاشرہ میں تنہا رہ جاتے تھے عزت نہیں کرتے تھے اور جن کی چلتی گاڑی رک جاتی تھی ان کی روٹی کے انتظام کے لئے ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے تھے- تم وراثت کا مال سمیٹ کر کھا جاتے تھے اور چاروںطرف سے مال اکھٹا کرتے چلے جاتے تھے- (۸۹/۱۹-۲۰) - یہ تھا تمہارا وہ غلط معاشرہ جس کی وجہ سے تم پر رزق کی تنگی آئی اور تم ذلیل و خوار ہوگئے -

ھ و ی

هَوٰى - يَهْوِىْ - هَوِيًّا - اوپر سے نیچے گرنا - هَوَى الشَّيْئُ - چیز اوپر سے نیچے کی طرف گری - هَوَتِ الْعُقَابُ تَهْوِىْ هَوِيًّا - عقاب شکار پکڑنے کے لئے نیچے کی طرف جھپٹا - اَلْمَهْوَاةُ - جَوّ (فضا یا خلا) نیز دو پہاڑوں کے درمیانی نشیبی علاقے کو کہتے ہیں* - اَلْهَوِىُّ - کان میں بھن بھن کی آوازیں آنا** - هَوَاءٌ - ہر خالی چیز کو کہتے ہیں بالخصوص زمین و آسمان کے درمیان خالی فضا کو- نیز بزدل کو بھی کہتے ہیں* - الهَوٰى - انسانی جذبہ اورخواہش کو کہتے ہیں - یہیں سے هَوِيَهٗ -

*تاج - **محیط -

یَهْوَاهُ ۔ هَوِیٌ کے معنی چاھنے، محبت کرنے یا پسند کرنے کے آتے ھیں ۔ اِسْتَهْوٰى ۔ اِسْتِهْوَاءً ۔ (۶/۷۱) ۔ اس نے اسے گرانا چاھا ۔ اس کی عقل کو لے اڑا ۔ یا اس کی خواھش کو اس کے لئے مزین کیا ۔ هَوٰى صَدْرُهٗ یَهْوِیْ ۔ اس کا سینہ خالی ھو گیا* ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) خالی ھونا اور (۲) گرنا بتائے ھیں ۔

قرآن کریم میں ہے وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى (۵۳/۱) ۔ (طلوع ھونے والا) ستارہ اس پر شاھد ہے جبکہ وہ نیچے کی طرف جا رھا ھو ۔ سورۃ حج میں مشرک کے متعلق ہے ۔ اَوْ تَهْوِیْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ مَكَانٍ سَحِیْقٍ (۲۲/۳۱) ۔ اسے ھوا اڑا کر کسی دور دراز جگہ میں پھینک دے ۔ اس میں نیچے گرانا اور دور پھینک دینا، دونوں آجاتے ھیں ۔ سورۃ النجم میں ہے ۔ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ۔ (۵۳/۵۳) ۔ اس نے تباہ شدہ بستیوں کو خالی کر دیا ۔ یا نیچے گرا دیا ۔ سورۃ ابراھیم میں ہے ۔ وَاَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ (۱۴/۴۳) ۔ ان کے دل جرأت و بسالت سے خالی ھو رہے تھے ۔

سورۃ ابراھیم میں حضرت ابراھیمؑ کی دعا ہے ۔ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْ اِلَیْهِمْ (۱۴/۳۷) ۔ اور ایسا کردے کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ھو جائیں ۔ سورۃ بقرہ میں لَا تَهْوٰى اَنْفُسُكُمْ کے بعد ہے اسْتَكْبَرْتُمْ (۲/۸۷) ۔ یعنی جن رسولوں کو تمھارا دل پسند نہیں کرتا تھا تم ان سے انکار و سرکشی اختیار کرلیتے تھے ۔

سورۃ النجم میں وحی کے مقابلہ میں انسان کے ذاتی خیالات کو هَوٰى کہا ہے ۔ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى (۵۳/۳-۴) ۔ یہ قرآن کریم اس رسول کے ذاتی خیالات نہیں بلکہ وحی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے ۔ سورہ بقرہ میں ہے وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۔ ۔ ۔ (۲/۱۲۰) ۔ اس وحی کے بعد اگر تم ان لوگوں کے ذاتی خیالات کا اتباع کروگے تو ۔ ۔ ۔ ۔

اس سے ظاھر ہے کہ قرآن کریم انسانی جذبات و خواھشات کے خلاف نہیں (۳/۱۳) ۔ وہ ان جذبات و خواھشات کے خلاف ہے جو وحی کے تابع نہ رکھے جائیں ۔ وَاِنَّ كَثِیْرًا لَّیُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ (۶/۱۲۰) ۔ ان میں سے بیشتر وہ ھیں جو اپنے ذاتی خیالات کی بناء پر جنھیں وحی (علم) کی سند حاصل نہیں ھوتی، لوگوں کو صحیح راستے سے بھکا دیتے ھیں ۔

*تاج ۔

یہی وہ جذبات و خیالات ھیں جو انسان کو شرف انسانیت کی بلندیوں سے حیوانی سطح کی پستیوں کی طرف لے جاتے ھیں ۔ وَمَنْ يَحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِي فَقَدْ هَوَىٰ (۲۰/۸۱) ۔ اور جو غلط راستے پر چلکر ھمارے انعامات سے محروم رہ گیا وہ پستیوں میں جا گرا ۔ وحی کا مقصود یہ ھے کہ انسان کو بلندیوں کی طرف لے جائے ۔ لیکن انسان اس راستے کو چھوڑ کر اپنی انفرادی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگ جاتا ھے اوراس طرح ذلتوں کی پستیوں میں جا گرتا ھے ۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ (۷/۱۷٦) ۔ اگر وہ ھمارے قانون مشیت کے مطابق چلتا تو ھم اسے بلندیوں کی طرف لے جاتے ۔ لیکن وہ اپنی معاشی مفاد پرستیوں کے ساتھ چمٹ گیا ۔ یعنی (وحی کو چھوڑ کر) اپنے ذاتی خیالات و مفادات کے پیچھے لگ گیا ۔

یہی وہ پستیوں کی زندگی ھے جسے هَاوِيَةٌ کہا گیا ھے (۱۰۱/۹-۱۱) ۔ یعنی زندگی کی ایسی حالت جس میں انسان کا دل و دماغ کچھ کام نہ دے اور وہ پریشانیوں اور ذلتوں میں مارا مارا پھرے ۔ گری ھوئی حالت ۔ اور قرآن کریم کے الفاظ میں نَارٌ حَامِيَةٌ یعنی بھڑکتی آگ ۔

لہذا اگر انسانی جذبات وحی کے تابع چلیں تو اس کا نتیجہ جنت کی زندگی ھے ۔ اور اگر وہ سرکش و بے باک ھو جائیں (جسے شیطان کہتے ھیں) تو اس کا نتیجہ جہنم کی پستیاں ھیں ۔

اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاھئے کہ قرآن کریم کی رُو سے انسانی جذبات کوئی قابل نفرت چیز نہیں کہ جنہیں دبانے یا فنا کر دینے میں ''روحانی ترقی'' کا راز مضمر ھے ۔ بالکل نہیں ۔ قرآن کریم یہ کہتا ھے کہ جب انسان کی طبیعی زندگی کے کسی تقاضے (جذبہ) اور انسانی سطح زندگی کے تقاضے میں (Tie) آپڑے تو اس وقت اسے اس بلند تقاضے کی خاطر پست تقاضے کو قربان کر دینا چاھئے ۔ ''انسانی سطح زندگی کے تقاضے'' ان مستقل اقدار سے وابستہ ھیں جو وحی کی رُو سے ملتی ھیں ۔ انسانی جذبات کو وحی کی روشنی کے تابع رکھنا، یہ ھے وجہ بالیدگی شرف انسانیت ۔ یا انسانی ذات کی نشو و نما (Development) کا طریق ۔ جب دونوں میں تصادم (Clash) نہ ھو تو انسانی جذبات کی تسکین کوئی مذموم چیز نہیں ۔

ھی (ضمیر)

هِيَ ۔ واحد مؤنث غائب ضمیر مرفوع منفصل ھے ۔ هِيَ امْرَأَةٌ وہ ایک عورت ھے ۔ قرآن کریم میں ھے هِيَ حَيَّةٌ (۲۰/۲۰) ۔ وہ سانپ ھے ۔

ھ ی أ

ھَیَّأَ الْاَمْرَ تَھْیِئَۃً ۔ اس نے معاملہ کو درست کر دیا ۔ تیار کیا ، ھموار کیا *۔ سورہ کہف میں ہے وَھَیِّیْٔ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا (۱۸/۱۰) ۔ ھمارے لئے ھمارے معاملہ کی صحیح صورت مہیا کر دے ۔ اَلْھَیْئَۃُ ۔ کسی چیز کی حالت اور کیفیت ۔ شکل و صورت ***۔ راغب نے کہا ہے کہ ھیئت محسوس بھی ھو سکتی ہے (یعنی شکل و صورت) اور معقول بھی **۔ (یعنی کسی کی ذھنی ، قلبی یا دوسری کیفیت جو محسوس شکل میں سامنے نہ آئے لیکن ھم بہ چشم بصیرت اسے دیکھ سکیں) ۔ سورہ آل عمران میں ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اِنِّیْ اَخْلُقُ لَکُمْ مِنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ (۳/۴۸) ۔ اس کے لفظی معنی ھیں "میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی مانند شکل بنا دوں گا" ۔ اس کا مجازی مفہوم یہ ہے کہ میں تمہیں ایسی ترتیب نو عطا کرونگا جس سے تم اپنی موجودہ خاک نشینی سے ابھر کر فضا کی بلندیوں میں بال فشاں ھو جاؤ گے ۔ تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ھو جائیں گی ۔ یہاں ھیئت محسوس نہیں بلکہ معقول مراد ہے (یعنی جسے عقل کی آنکھ سے دیکھا جا سکے)۔

ھ ی ت

ھَیْتَ لَکَ ۔ فراء نے کہا کہ یہ حوران کا لغت ہے جو کسی طرح مکہ میں پہنچ گیا اور وھاں کے لوگ اسے بولنے لگ گئے ۔ بعض کے نزدیک یہ عبرانی ھَیْتَالَخْ سے معرب ہے ****۔ اس کے معنی ھیں ادھر آؤ ۔ جلدی آؤ ۔ ھَیْتَ کلمہ تعجب بھی ہے ۔ مجاھد نے کہا ہے کہ یہ اکسانے کے لئے بولا جاتا ہے *۔

اَلْھَیْتُ ۔ گہری نشیبی زمین*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی چیخنا اور ھَیَّتَ بِہٖ کے معنی اسے "چلا کر پکارا" لکھے ھیں ۔

سورہ بقرہ میں ہے ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ (۲/۱۱۱) ۔ اپنی دلیل پیش کرو ۔ جلدی سے سامنے لاؤ ۔ بعض اھل لغت نے ھَاتُوْا کو (ھ ۔ ت ۔ و) یا (ھ ۔ ت ۔ ی) کے تابع بھی لکھا ہے ۔ خلیل نے کہا ہے کہ ھَاتِ دراصل آتی یُؤْتِی سے ہے ۔ اس کے الف کو ھاء سے بدل لیا گیا ہے ۔ سورہ یوسف میں ہے ھَیْتَ لَکَ (۱۲/۲۳) ۔ ادھر آؤ ۔

*تاج ۔ **راغب ۔ ***محیط ۔ ****لین ۔ بحوالہ غریب القرآن میرزا ابوالفضل ۔ ۔

ھ ی ج

اَلْھَیْجُ - حرکت میں آنا - حرکت میں لانا - (لازم اور متعدی) ھَاجَ الْاِبِلَ - اس نے اونٹوں کو رات کے وقت (جب وہ سکون میں تھے) حرکت دی اور چلایا*- ھَاجَ الْبَحْرُ - سمندر میں اضطراب اور ھیجان پیدا ھو گیا**- ھَاجَتِ الْاِبِلُ - اونٹ پیاسے ھو گئے - یہیں سے ھَاجَ النَّبْتُ کے معنی ھیں سبزیاں خشک ھو گئیں **- ھَاجَ الْبَقْلُ - سبزی کا لمبا ھونا اور زرد پڑنا اور سوکھنا *- اَلْھَائِجَۃُ - وہ زمین جس کی سبزیاں زرد ھو گئی ھوں یاخشک ھو چکی ھوں*- قرآن کریم میں کھیتی کے متعلق ھے - ثُمَّ یَھِیْجُ ($\frac{۳۹}{۲۱}$) - پھر وہ خشک ھو جاتی ھیں - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) برانگیختہ ھونا اور (۲) پودوں کا خشک ھو جانا ھیں -

ھ ی ل

ھَالَ عَلَیْہِ التُّرَابَ ھَیْلًا وَّ ھَیَّلَہٗ وَاَھَالَہٗ - اس نے اس پر مٹی ڈالی - فَانْھَالَ وَ تَھَیَّلَ پس مٹی پڑ گئی ، اوپر سے نیچے گر گئی - رَمْلٌ ھَالٍ وَّ اَھْیَلُ - ریگ رواں - اَلْھَیْلُ وَالْھَالُ وہ ریت جو گر جائے - کَثِیْبٌ اَھْیَلُ - ریت کا وہ ٹیلہ جس کی ریت گر جائے - اَلْھَیُوْلُ وہ منتشر ذرات جو دوپہر کو روشندانوں میں اڑتے نظر آتے ھیں - اَلْھَالَۃُ چاند کے گرد حلقہ *-

ابن فارس نے کہا ھے کہ اس لفظ کے معنے کسی چیز کو جسے ناپا جاسکے بغیر ناپے دے دینے کے ھیں - یعنی اسے یونہی دھکیل دینا (جس طرح بہنے والی ریت یونہی آگے بڑھ جاتی ھے)-

قرآن کریم میں ھے یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَکَانَتِ الْجِبَالُ کَثِیْبًا مَّھِیْلًا ($\frac{۳}{۱۴}$) - جس دور (یا زمانے) میں زمین اور پہاڑ کانپ اٹھینگے - اور پہاڑ ایسے ھو جائینگے جیسے ریت کا وہ تودہ جو خود بخود ڈھیلا پڑ کر بہ گیا ھو - قرآنی انقلاب کے وقت بڑے بڑے سرداران قوم کی عظمت و اقتدار کے ختم ھو جانے کی کیسی عمدہ تشبیہ ھے - یعنی دکھائی تو وہ ایسے دینگے گویا محکم اور مضبوط پہاڑ ھیں ، لیکن درحقیقت ان کی قوت اور استحکام ختم ھو چکے ھوں گے - بس یوں سمجھئے جیسے دریا کے کنارے ریت کا تودہ جو خود بخود پھسل کر نیچے گرتا جا رھا ھو - غلط بنیادوں پر اٹھے ھوئے تمدن

*تاج - **محیط -

کی بھی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ زمانے کے تقاضے کے دھچکوں کو سہار نہیں سکتا اور جونہی صحیح انقلاب سے اس کا سامنا ہوتا ہے ریگ رواں کی طرح نیچے آگرتا ہے۔

ھ ی م

الھُیَامُ۔ سخت ترین پیاس۔ ایک بیماری جسکی وجہ سے اونٹ اس طرح پیاسا ہوتا ہے کہ اسے سیرابی نہیں ہوتی**۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی سخت پیاس کے لکھے ہیں۔

اَلْاَھْیَمُ۔ وہ اونٹ جسے پیاس کی بیماری لگ جائے اور کسی طرح اس کی تشنگی دور نہ ہو سکے۔ مؤنث ھَیْمَاءُ ہے۔ اور جمع ھِیْمٌ*۔ قرآن کریم میں ہے فَشَارِبُوْنَ شُرْبَ الْھِیْمِ۔ (۵۶/۵۵) "تم پیوگے جسطرح جھوٹی پیاس کے مارے ہوئے اونٹ پیتے ہیں"۔ رَجُلٌ ھَیْمَانُ۔ پیاسا آدمی۔ رَجُلٌ ھَائِمٌ۔ وَھَیُوْمٌ۔ متحیر اور حیران آدمی۔ ھَامَ فِی الْاَمْرِ یَھِیْمُ۔ وہ اس معاملہ میں حیران اور پریشان رہا۔ اَلْھَیَامُ۔ وہ ریت جسے ہاتھ میں لیا جائے تو وہ ٹھہرے نہیں بلکہ برابر نیچے کی طرف پھسلتی جائے*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی خشک ریت کے ہیں۔ اَلْھَیْمَاءُ۔ لق و دق صحرا جس میں پانی نہ ہو*۔

ھَامَتِ النَّاقَةُ تَھِیْمُ۔ اونٹنی چرنے کے لئے جدھر کو جی چاہا منہ اٹھا کر چلدی۔ لَیْلٌ اَھْیَمُ۔ وہ رات جسمیں ستارے نہ ہوں (اور اس لئے مسافروں کو راستہ نہ مل سکے)۔ اَلْھِیْمُ۔ ان ریتلے میدانوں کو بھی کہتے ہیں جو پانی کو پی جائیں**۔

ان معانی کو سامنے رکھئے اور پھر یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے شاعرانہ ذہنیت کے متعلق جو کچھ کہا ہے اسکا مفہوم کیا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ شاعری ایک پیام بر کے شایان شان نہیں ہوتی (۳۶/۶۸)۔ (دیکھئے عنوان ش۔ ع۔ ر)۔ ایک رسول، خدا کا انقلاب آفریں پیغام لیکر آتا ہے۔ اس کے سامنے ایک متعین منزل ہوتی ہے اور اسکا ہر قدم اُسی منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ وہ کبھی یہ نہیں کرتا کہ کبھی ادھر نکل گیا، کبھی اُدھر۔ وہ اپنے جذبات کے تابع نہیں چلتا بلکہ قانون خداوندی کے بتائے ہوئے راستے پر سیدھا چلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس شاعرانہ ذہنیت کے متعلق کہا کہ فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ (۲۶/۲۲۵)۔ وہ ایک ایسے اونٹ کیطرح جسے شدید پیاس کی

*تاج۔ **تاج و محیط و ابن فارس۔

بیماری مارے مارے پھرا رہی ہو ، کبھی جذبات کی ان وادیوں میں پھرتا ہے اور کبھی تخیلات کی ان جولا نگاہوں میں جانکلتا ہے ۔ اس کا یہ سارے مارے پھرنا جذبات کی پیاس کی وجہ سے ہوتا ہے جسے کبھی اور کہیں بھی سیرابی نصیب نہیں ہو سکتی ۔ وہ ساری عمر یونہی بھٹکتا پھرتا ہے ۔ یہ ہے فرق ایک پیامبر اور ایک شاعر میں ۔ شاعر ، جذبات کی وادیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے ، ایک پیاسے اونٹ کیطرح جسے پیاس کی بیماری کسی پہلو بھی چین نہیں لینے دیتی اور اسکی پیاس بجھتی ہی نہیں ۔ اس کے سفر کی راہیں تاریک ہوتی ہیں جن میں راستہ دکھانے والے ستارے کہیں نہیں ہوتے ۔ برعکس اس کے ایک پیغامبر ایک متعین منزل کی طرف واضح ، سیدھے اور توازن بدوش راستے پر نہایت جزم و یقین اور سکون و اطمینان کے ساتھ چلا جاتا ہے ۔ شاعری جذبات پرستی ہے اور رسالت حقائق کا اتباع ۔ مسلمان کے سپرد " رسالت " کا فریضہ ہوا تھا ۔ یعنی خدا کے دئے ہوئے پیغام پر خود بھی چلنا اور اسے دوسروں تک بھی پہنچانا ۔ لیکن یہ اس راستے کو چھوڑ کر اسطرح " شاعری " میں گم ہوا کہ اب اسے نہ راستے کا پتہ نشان ملتا ہے ، نہ منزل کا ۔ ایک پیاسے اونٹ کیطرح زندگی کے لق و دق صحرا میں مارا مارا پھر رہا ہے اور کہیں اپنی تشنگی کی سیرابی کا سامان نہیں پاتا ۔ اس لئے کہ اسکی پیاس بیماری ہوتی ہے ، سچی پیاس نہیں ہوتی ۔ کسقدر عبرت انگیز ہے یہ نقشہ اور کیسی افسوسناک ہے یہ روش ؟ اور طرفہ تماشا یہ کہ یہ اُمت (جو شاعروں کی قوم بنکر رہ گئی ہے) راستہ دکھانے والا ضابطہ حیات ہر وقت بغل میں دابے ہوئے ہے ۔ چشمۂ شیریں پاؤں کے نیچے اور تلاشِ آب ، صحراؤں کے سراب میں ۔ اب اُن کی پیاس کیسے بجھے ؟

ھ ی م ن

ھَیْمَنَ الطَّائِرُ عَلٰی فِرَاخِہٖ ۔ کے معنی ہوتے ہیں پرند نے اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے ان کے اوپر پروں کو پھیلایا ، اور لٹکایا ۔ ھَیْمَنَ عَلٰی کَذَا ۔ وہ اس کا محافظ و نگران ہوا *۔ اللہ تعالی نے قرآن کریم کو تمام کتب سابقہ کا مُھَیْمِنٌ کہا ہے ($\frac{۴۸}{۵}$) ۔ یعنی ان تمام صداقتوں کا محافظ جو کتب سابقہ میں بیان ہوئی تھیں ۔ خود اللہ تعالی بھی اَلْمُھَیْمِنُ ہے ($\frac{۵۹}{۲۳}$) ۔ یعنی جو کائنات کی اسطرح حفاظت کرتا ہے جسطرح بچوں کی ماں اپنے بچوں کی حفاظت کرتی ہے ۔

---

*تاج۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ ھاء - میم - نون کوئی مادہ نہیں ہے -
اَلْمُهَيْمِنُ دراصل آمَنَ سے ہے ، جس کا ہمزہ ھ سے بدل گیا ہے -

هَيْهَاتَ

اَلْهَيْهَةُ - وہ جسے اس کے میلے کچیلے کپڑوں کی وجہ سے ایک طرف ہٹا دیا جائے - هَيْهَاتَ - ایک کلمہ ہے جسکے معنی ''دور ہؤا'' کے ہوتے ہیں*۔ یہ اسم فعل ہے - یعنی ایسا اسم جسکے معنی ماضی کے (یا کبھی امر کے) ہوتے ہیں - اور ایسا فعل جس کی گردان نہیں ہوتی - قرآن کریم میں منکرین حیاتِ آخرت کی زبان سے کہا گیا ہے هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ ($\frac{۲۳}{۳۶}$) - کس قدر بعید (از قیاس) ہے وہ بات جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ (جس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ وہ ضرور واقع ہو کر رہیگی) - یعنی وہ اپنے ہم مشربوں سے کہتے ہیں کہ یہ جو رسول تم سے کہتا ہے کہ تم مرنے کے بعد پھر زندہ کئے جاؤ گے تو یہ کسقدر بعید از قیاس ہے !

---

*تاج - محیط و راغب -

ی

ی (ضمیر)

یِ۔ ضمیر مجرور متصل ہے۔ واحد متکلم (مذکر اور مؤنث دونوں) کیلئے آتی ہے۔ غُلَامِیْ۔ میرا غلام۔ نیز ضمیر منصوب متصل۔ جیسے یَعْبُدُنَنِیْ۔ کبھی یہ ی مفتوح بھی ہو جاتی ہے۔ جیسے نِعْمَتِیَ الَّتِیْ (۲/۴۰)۔ اور کبھی حذف بھی ہوجاتی ہے۔ مثلاً وَلِیَ دِیْنِ (۱۰۹/۶)۔ میرے لئے میرا دین (یہاں دِیْنِ کے بعد "ی" حذف ہوگئی اور "ن" پر صرف زیر رہ گیا۔)

یَا (حرف)

یَا۔ حرف نداء۔ پکارنے کے لئے آتا ہے۔ "اے" کے معنوں میں۔ یَا أَرْضُ ابْلَعِیْ (۱۱/۴۴) اے زمین تو نگل لے۔ یہ حرف نداء عموماً حذف بھی ہوجاتا ہے۔ جیسے رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا (۲۱/۸۹)۔ (اے) میرے رب مجھے تنہا نہ چھوڑیو۔ (یہاں رَبِّ سے پہلے یَا محذوف ہے) یَا کے بعد أَیُّهَا کا اضافہ بھی کر دیا جاتا ہے۔ جیسے یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا (۵/۲۸)۔ اے ایمان والو!۔

ی أ س

اَلْیَأْسُ۔ ناامید اور مایوس ہونا۔ یَئُوْسٌ۔ یَئُوْسٌ۔ ناامید ہوجانے والا۔ اِسْتَیْأَسَ۔ ناامید ہو گیا*۔ سورہ یوسف میں ہے فَلَمَّا اسْتَیْأَسُوْا مِنْهُ (۱۲/۸۰) "جب وہ اس سے مایوس ہو گئے"۔ اور وَلَا تَیْأَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِنَّهٗ لَا یَیْأَسُ ..... (۱۲/۸۷)۔ اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو۔ اس سے کافروں کے سوا کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

سورہ رعد میں ہے أَفَلَمْ یَیْأَسِ الَّذِیْنَ آمَنُوْا .... (۱۳/۳۱) اہل لغت نے کہا ہے کہ یہاں اسکے معنی أَفَلَمْ یَعْلَمْ کے ہیں۔ یعنی کیا

*تاج۔

انہوں نے اسبات کو جان نہیں لیا*۔ ابن فارس نے یہ معنی بھی بنیادی لکھے ہیں (یعنی جاننا) ۔ لیکن راغب کا کہنا ہے کہ یہ معنی مجازی ہیں**۔ سورہ ممتحنہ میں ہے قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ . . . . . (۶۰/۱۳) ۔ یہاں اس کے معنی انکار کرنے کے ہیں ۔ یعنی وہ انکار جو ناامیدی کا نتیجہ ہوتا ہے ۔

آپ سورہ یوسف کی اس آیت کو ایک بار پھر سامنے لائیے جو اوپر درج کی گئی ہے ۔ اس میں آپ کو قوموں کے عروج و زوال کے متعلق ایک عظیم اصول ملیگا ۔ آیت ہے وَلَا تَايْـئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۔ إِنَّهٗ لَا يَايْـئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (۱۲/۸۷)۔ ”اللہ کی رحمت سے نا امید مت ہو۔ کیونکہ اللہ کی رحمت سے سوائے کافروں کے کوئی ناامید نہیں ہوتا“ ۔ اسی کو دوسری جگہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (۳۹/۵۳) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (نیز ۴۱/۴۹)۔ اسلام کسی کو قنوطی (Pessimistic) نہیں بنانا چاہتا۔ مومن وہ ہے جو علی وجہ البصیرت خدا کے قوانین کی محکمیت ، نتیجہ خیزی اور صداقت پر یقین رکھتا ہے ۔ وہ اس یقین کے ساتھ اس راستے پر گامزن ہوتا ہے ۔ اگر اسے کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے ، یا اپنی کسی غلطی سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے تو اپنی روش کی صداقت اور محکمیت پر یقین اسے بددل نہیں ہونے دیتا ۔ وہ سنبھلتا ہے ۔ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے اور اپنی غلطی کا ازالہ کرکے ، پھر اسی راستے پر چل پڑتا ہے ۔ یہ ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونے کا مفہوم ۔ ناامید وہ ہوتا ہے جو کسی راستے کو قیاس اور گمان پر تجربۃً اختیار کرتا ہے ۔ جب اُسے ناکامی ہوتی ہے تو وہ وہیں رک جاتا ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے سے نا امید ہو جاتا ہے ۔ لیکن جسے راستے کی صحت پر یقین ہو وہ کبھی نا امید نہیں ہوتا ۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے نا امیدی اور ابلیسیت کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے ۔ (دیکھئے عنوان ب ۔ ل ۔ س) ۔ لیکن خدا کی رحمت یونہی بیٹھے بٹھائے نہیں مل جاتی ۔ اس کے لئے کہا ہے کہ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۔ تم دفع مضرت اور جلب منفعت ، دونوں صورتوں میں قوانین خداوندی کو آواز دو ۔ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۷/۵۶) ۔ یقین جانو کہ خدا کی رحمت ان کے قریب ہوتی ہے جو حسن کارانہ انداز سے توازن بدوش زندگی بسر کرتے ہیں ۔

اسی میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے ۔ ایک شخص مصائب کے ہجوم میں گھر جاتا ہے جہاں سے نکلنے کی کوئی راہ اسے نہیں ملتی ۔ لیکن

*تاج ۔ **راغب ۔

وہ ہمت نہیں ہارتا ۔ دل نہیں چھوڑتا ۔ وہ اسے محض طبعی حالات کی مجبوری سمجھتا ہے ۔ اپنے اندر شکست خوردگی کا احساس نہیں پیدا ہونے دیتا ۔ یہ شخص '' خدا کی رحمت '' سے مایوس نہیں ۔ لیکن اگر وہ ایسی مجبوری کے عالم میں (یا جونہی کوئی مشکل سامنے آئے اسوقت) فیصلہ کر لیتا ہے کہ میں اس قابل ہی نہیں کہ اس کا مقابلہ کر سکوں یا اسے برداشت کر سکوں ، تو اس پر مایوسی چھا جائیگی ۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی ذات پر ایمان رکھتا ہے ، جسے خود اعتمادی حاصل ہے ، وہ کبھی مایوسی کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیتا ۔ اسے اپنے آپ پر بھروسہ ہوتا ہے اور وہ اسی وجہ سے پرامید رہتا ہے ۔ لیکن جس شخص کا اپنی ذات پر ایمان نہیں رہتا ۔ جو اس سے انکار کر دیتا ہے ، وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے ۔ اس پر (Frustration) چھا جاتی ہے یہی چیز ہے جو بسا اوقات انسان کو خودکشی تک لے جاتی ہے ۔ خودکشی وہ کرتا ہے جس کی اپنی نظروں میں کوئی قیمت نہیں رہتی ۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرے زندہ رہنے میں میرا کچھ فائدہ نہیں ۔ وہ اپنی نظروں میں آپ گر جاتا ہے ۔ مادی نظریہ حیات (Materialistic concept of life) میں چونکہ سارا انحصار خارجی (مادی) اسباب و ذرائع پر ہوتا ہے اس لئے جب وہ اسباب ختم ہو جاتے ہیں تو انسان مایوس ہو جاتا ہے ۔ لیکن انسانی ذات کی ممکنات کی کوئی ۔
مقام پر بھی یہ نہیں کہتا کہ اس سے آگے میں کچھ کر سکنے کے قابل نہیں ۔ وہ یہ کہیگا کہ اس کے بعد سردست میرے پاس مادی وسائل نہیں رہے لیکن وہ اپنی ذات سے کبھی مایوس نہیں ہوگا ۔ کفر درحقیقت انسان کا اپنی ذات سے انکار — اور اس کے بعد مکمل ترین ذات خداوندی سے انکار ہے ۔ علاوہ بریں ، انسانی ذات پر ایمان سے انسان ، بلند اقدار کی ضرورت محسوس کرتا ہے جو اسے وحی سے ملتی ہیں ۔ اسی کی قوت سے وہ طبیعی مجبوریوں سے نہیں گھبراتا اور مایوسی کو کبھی اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیتا ۔ حتکہ موت کا سامنا کرتے وقت بھی نہیں گھبراتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ موت سے اس کا جسم فنا ہوجائیگا لیکن اس کی ذات پر کوئی آنچ نہیں آئیگی ۔

آپ نے غور فرمایا کہ مایوسی کیوں کفر ہے ۔

يَاجُوجَ وَمَاجُوجَ

وہ اقوام جن کی یورشوں سے حفاظت کے لئے ذوالقرنین نے دیوار بنا کر دی تھی (۹۴/۱۸) تفصیل عنوان (ا - ج - ج) کے تحت دیکھئے۔

یَاقُوْتٌ

اَلْیَاقُوْتُ۔ یہ فارسی لفظ ہے جو عربی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ سخت اور صاف شفاف جواہرات جن کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ عموماً سرخ رنگ مراد ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے کَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ (۵۵/۵۸)۔ گویا کہ وہ (مؤنث) یاقوت اور مرجان ہیں۔

یٰلَیْتَ

یہ حرفِ ندا (یا) اور لَیْتَ کا مجموعہ ہے۔ اس کے معنی ہیں "اے کاش" (دیکھئے یَا اور لَیْتَ)۔

ی ب س

یَبِسَ۔ کسی مرطوب چیز کا خشک ہو جانا۔ اَلْیَبْسُ۔ وہ چیز جو پہلے تر ہو اور پھر خشک ہو جائے۔ شَاةٌ یَبَسٌ۔ اس بکری کو کہتے ہیں جس کے تھن خشک ہو جائیں اور وہ دودھ دینا بند کر دے *۔ اَلْیَبَسُ۔ وہ جگہ جہاں پانی ہو اور پھر جاتا رہے۔ تورات میں اَلْیَابِسَۃُ خشکی کے لئے آیا ہے بمقابلہ بَحْرٌ کے **۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا (۲۰/۷۷)۔ بنی اسرائیل کو سمندر میں ایسے راستے سے لے جا جس پر پہلے پانی تھا لیکن جو اسوقت خشک ہے۔

سورۃ انعام میں ہے وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (۶/۵۹)۔ کائنات کی کوئی خشک و تر چیز ایسی نہیں (یا خشک و تر پھل ایسا نہیں) جس کے لئے ضروری قانون اور قاعدہ صحیفۂ فطرت (کائناتی قوانین کے ضابطہ) میں موجود نہ ہو۔

ی ت م

اَلْیُتْمُ۔ اکیلا اور تنہا رہ جانا۔ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ اصمعی نے کہا ہے کہ اَلْیَتِیْمُ اس ریتیلی زمین کو کہتے ہیں جو اپنے ارد گرد کی زمینوں سے الگ تھلگ ہو۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ اَلْمُیَتَّمُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو تنہا اور اکیلی ہو۔ راغب کے نزدیک ہر منفرد

---

* تاج۔ ** محیط۔

اور تنہا چیز یتیم کہلاتی ہے*۔ دُرَّةٌ يَتِيْمَةٌ ۔ اس موتی کو کہتے ہیں جو اپنی نوعیت کا ایک ہی ہو۔

بن باپ کے بچے کو بھی یَتِیْمٌ اسلئے کہتے ہیں کہ وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ حرالی نے کہا ہے کہ ضرورت کے وقت باپ کا نہ رہنا یُتْمٌ کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک بچہ جوان نہ ہو وہ یَتِیْمٌ کہلاتا ہے، لیکن جب وہ جوان ہو جائے تو اسے یَتِیْمٌ نہیں کہتے ۔ اس کے برعکس لڑکی اُسوقت تک یَتِیْمَةٌ کہلاتی ہے جب تک اسکی شادی نہ ہو جائے، خواہ وہ بالغ بھی کیوں نہ ہو چکی ہو۔ بہائم (حیوانات) میں یَتِیْمٌ ان بچوں کو کہتے ہیں جنکی ماں نہ رہے اسلئے کہ ان میں بچہ کی پرورش ماں کرتی ہے۔ باپ کی انہیں احتیاج نہیں ہوتی ۔ برعکس اس کے اگر انسانی بچہ کی ماں مر جائے تو اسے یَتِیْمٌ نہیں کہتے ۔ مُنْقَطِعٌ یا عَجِیٌّ کہتے ہیں ۔ اگر ماں باپ دونوں مرجائیں تو اسے لَطِیْمٌ کہتے ہیں ۔ (یَتِیْمٌ کی جمع اَیْتَامٌ اور یَتَامٰی دونوں آتی ہیں) ۔ اِمْرَاَةٌ مُوْتِمٌ ۔ اس عورت کو کہتے ہیں جس کے بچے یتیم ہو جائیں۔ یعنی جس کا شوہر مر جائے *۔ لسان العرب میں ہے کہ یَتِیْمٌ اس عورت کو کہتے ہیں جس کا خاوند نہ ہو۔ یعنی خواہ مر چکا ہو یا ویسے ہی اس کا خاوند نہ ہو۔ قرآن کریم میں یَتٰمَى النِّسَآءِ ($\frac{۴}{۱۲۷}$) ایسی ہی عورتوں کے لئے آیا ہے ۔

یَتَامٰی کے ان معانی کو سامنے رکھئے اور پھر سورہ نساء کی اس آیت کو دیکھئے جس میں کہا گیا ہے کہ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتَامٰی فَانْکِحُوْا مَاطَابَ لَکُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ . . . ($\frac{۴}{۳}$) ۔ اگر تم دیکھو (تمہیں اس کا خدشہ ہو) کہ تم " یتامٰی " کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہیں کر سکتے ۔ ان کے حقوق پورے نہیں ہو سکتے ۔ تو تم ان میں سے جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے دو۔ دو۔ تین تین ۔ چار چار تک سے شادی کر لو ۔

ظہور اسلام کے بعد مسلمانوں کی مختصر سی جماعت کو بے شمار لڑائیاں لڑنی پڑیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں بیوہ ہو گئیں ۔ بہت سے بچے لاوارث رہ گئے ۔ بہت سی بالغ لڑکیاں ایسی رہ گئیں جنہیں خاوند ہی نہیں مل سکتا تھا ۔ یہ ایک ایسی ہنگامی اور اجتماعی مشکل پیدا ہو گئی جس کا حل نہایت ضروری تھا ۔ یہ مشکل اس لئے تھی کہ

*تاج و محیط و راغب ۔

(۱) قرآن کریم کا عام قانون ایک عورت سے شادی کرنے کا تھا (فَوَاحِدَةً - ۴/۳)

(۲) مسلمان عورتیں نہ کفار سے شادی کر سکتی تھیں ، نہ مشرکین سے - نہ اہل کتاب سے - انہیں بہرحال مسلمان ہی سے شادی کرنی تھی - اور مسلمان مردوں کی تعداد اسقدر کم ہو گئی تھی -

اس ہنگامی مسئلہ کے حل کے لئے قرآن کریم نے وحدت زوج (Monogamy) کے قاعدے میں وقتی طور پر استثناء (Relaxation) کی اجازت دی اور کہا کہ ان عورتوں میں سے (اَلنِّسَآءَ - ۴/۳) جو اسطرح بے شوہر رہ گئی ہیں (خواہ بیوہ ہو کر - اورخواہ نا کتخدائی کی حالت میں جنہیں شوہر نہیں ملتا) - حسب پسند ، ایک سے زیادہ سے نکاح کرکے ان کی حفاظت کا سامان پیدا کر دو - یہی ان کے مسئلہ کا منصفانہ حل ہے - قرآن کریم میں بس یہی ایک آیت ہے جس میں تعدد ازدواج (Polygamy) کی اجازت ہے - اگر ایسے حالات پیدا نہ ہوں تو پھر قانون وہی ایک بیوی کا ہے -

يَتِمَ - يَتْماً کے معنی کمزور اور ضعیف ہو جانا - قاصر ہو جانا اور تھک جانا - درماندہ ہو جانا - بھی ہوتے ہیں - نیز يَتْمٌ کے معنی فکر و غم کے بھی آتے ہیں اور دیر کرنے اور غفلت کرنے کے بھی - اسلئے کہ یتیموں کی خبر گیری میں غفلت کی جاتی ہے اور انہیں مدد پہنچانے میں دیر لگائی جاتی ہے - اَلْيَتَمُ کے معنی حاجت اور ضرورت کے بھی ہوتے ہیں* -

قرآن کریم میں یتیموں کی نگہداشت کے متعلق بڑی تاکید آئی ہے ، اور سرمایہ داری کے نظام کی تباہی کا سبب یہ بتایا ہے کہ لَا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (۸۹/۱۷) - ان آیات میں يَتِيْمٌ سے مراد وہی نہیں جنکے باپ مر چکے ہوں - اس سے مراد تمام وہ لوگ ہیں جو معاشرہ میں تنہا رہ گئے ہوں - جو بے یار و مددگار ہوں - لہذا جس معاشرہ میں کسی فرد کو بھی یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ اکیلا ہے - اس کا کوئی مددگار نہیں - اسکی مصیبت تنہا اس کی مصیبت ہے - اسکا کوئی مونس و غمخوار اور کوئی یار و مددگار نہیں - وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے ، کیونکہ اس میں تنہا رہ جانے والے کو واجب التکریم نہیں سمجھا جاتا - قرآن کریم ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں کسی فرد کو اس کا احساس تک نہ ہونے پائے کہ وہ تنہا ہے - اس کا کوئی پناہ دینے والا نہیں - یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود نبی اکرمؐ

*تاج و محیط و راغب -

سے کہا کہ اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْماً فَاٰوٰی (۹۳/۶) ۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اس نے تجھے یتیم پایا اور پناہ کا سامان بہم پہنچا دیا ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یتیم وہ ہے جو پناہ سے محروم رہ جائے ۔ اور ایسے شخص کے لئے پناہ کا سامان بہم پہنچانا اس معاشرہ کا کام ہے جو خدا کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوا ہو ۔

یحییٰ علیہ السلام

قرآن کریم نے حضرت یحییٰؑ کو منجملہ انبیاء بنی اسرائیل بتایا ہے (۶/۸۵) ۔ آپ حضرت زکریاؑ کے بیٹے تھے (۱۹/۷) ۔ صاحب کتاب اور بچپن ہی سے عمدہ قوتِ فیصلہ کے مالک (۱۹/۱۲) اور صفاتِ حسنہ سے آراستہ (۱۹/۱۳-۱۵)۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انجیل میں جنہیں یوحنا کہکر پکارا گیا ہے وہ حضرت یحییٰؑ ہی ہیں۔ انجیل (لوقا) میں ''یوحنا'' کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے کہ

> وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا اور اسرائیل پر ظاہر ہونے تک جنگلوں میں رہا (۱/۸۰) ۔

انجیل متی میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے آپ کے متعلق فرمایا کہ

> میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورتوں سے پیدا ہوئے ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں ہوا ۔

رینان نے اپنی کتاب (Life of Jesus) میں لکھا ہے کہ ''یوحنا'' کی تعلیم کا مرکز (Judea) تھا لیکن اس کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا اور حضرت عیسیٰ ان سے آ کر ملے تھے ۔ اس کے بعد اس نے لکھا ہے کہ '' یوحنا '' اور حضرت عیسیٰؑ نے فلسطین کے صحرا میں ایک عجیب انقلاب انگیز نظام قائم کیا تا آنکہ ۲۹ء میں '' یوحنا '' کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے وطن کی طرف مراجعت فرمائی ۔

ی د ی

اَلْیَدُ ۔ ہاتھ کو کہتے ہیں ۔ مؤنث استعمال ہوتا ہے ۔ اسکی جمع اَیْدٍ ہے ۔ لیکن اس لفظ کا استعمال اسقدر متعدد معانی میں ہوتا ہے جنکی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں ۔ جیسے ہمارے ہاں '' ہاتھ'' کا استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً جاہ اور وقار ۔ قوت و اقتدار ۔ غلبہ و تسلط ۔ ملکیت ۔ مددگار ۔ امداد اور فریاد رسی۔ احسان و انعام ۔ حفاظت و صیانت ۔ حذاقت و مہارت ۔ دوسری طرف یہ لفظ

ندامت وشرمندگی۔ ذلت و انقیاد کے لئے بھی آتا ہے۔ قرآن کریم میں حضرات انبیاء کرام کے متعلق ہے کہ وہ اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ تھے (۳۸/۴۵)۔ یعنی قوت اور بصیرت دونوں کے مالک۔ دوسری طرف ان کے مخالفین کے متعلق کہا ہے کہ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ فَرَدُّوْا اَیْدِیَھُمْ فِیْ اَفْوَاھِھِمْ (۱۴/۹) انہیں بات کرنے سے روک دیا جائے۔ ابن قتیبہ نے ان معانی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ وہ غیظ و غضب میں اپنے ہاتھ کاٹنے لگتے ہیں***۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ آئیگا سیاق و سباق کے اعتبار سے اس کے معنی کئے جائینگے۔ قرآن کریم میں بَیْنَ یَدَیْہِ کا محاورہ متعدد بار آیا ہے۔ اسکے لفظی معنی ہیں اس کے دونوں ہاتھوں کے درمیان۔ یعنی سامنے*۔ قرآن کریم نے اپنے آپ کو مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ (۲/۹۷) کہا ہے۔ لہذا لِمَا بَیْنَ یَدَیْہِ کے معنی ہیں "جو اس کے سامنے ہے"۔ قرآن کریم نے اپنے آپ کو ان اخلاقی اقدار کا مصدق کہا ہے جو دنیا کے پاس اس سے پہلے آئی تھیں۔ اور ان میں سے بعض، نزول قرآن کے وقت بھی ان لوگوں کے پاس موجود تھیں۔ مثلاً جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ وغیرہ۔ قرآن کریم ان کی اس قسم کے اقدار کا مصدق تھا۔ وہ اہل کتاب کی کتابوں کی تصدیق نہیں کرتا تھا، وہ انہیں خود محرف قرار دیتا تھا۔"مصدق" کے صحیح مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان (ص د ق)۔

سورۂ ذاریات میں ہے وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰھَا بِاَیْدٍ (۵۱/۴۷)۔ ہم نے آسمان (فضائی کروں یا خارجی کائنات) کو قوت و اقتدار کے ساتھ بنایا ہے۔ [نیز دیکھئے عنوان ا ی د]

سورہ توبہ میں ہے کہ اہل کتاب اسلامی نظام میں جزیہ دیں عَنْ یَدٍ (۹/۲۹) اس نعمت و آسائش کے بدلے میں جو انہیں اطمینان و سکون کے ساتھ رہنے میں حاصل ہے**۔

سورہ فرقان میں ہے یَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیْہِ (۲۵/۲۷) اس کے معنی، غم و غصہ میں دانتوں سے ہاتھ چبانے کے ہیں۔ اعمال انسانی کے متعلق بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْھِمْ (۲/۹۵) کئی مقامات پر آیا ہے۔ یعنی جو کچھ ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی ہاتھ نہیں بلکہ خود

*تاج و محیط۔ **راغب۔ (بحوالہ غریب القرآن میرزا ابوالفضل)
***القرطین ج/۱ صفحہ ۲۳۵

انسان کے ہیں ۔ سورہ بقرہ میں ہے وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ (۲/۱۹۵) اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔ سورہ حجرات میں ہے لَا تُقَدِّمُوا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (۴۹/۱) اس سے مراد احکام اور فیصلے ہیں ۔

(سَارِقٌ کے قطع ید کے لئے دیکھئے عنوان ق ۔ ط ۔ ع ۔ اور یَدٌ بَیْضَاءُ کے لئے دیکھئے عنوان ب ۔ ی ۔ ض اور ض ۔ م ۔ م)۔

ی س ر

اَلْیَسَرُ ۔ اَلْیَسْرُ ۔ اَلْیُسْرُ ۔ نرمی ۔ سہولت ۔ آسانی ۔ فراخی ۔ کشائش آسودگی، تونگری ۔ معیشت کی طرف سے فارغ البالی ۔ بہتات ۔ (عُسْرٌ بمعنی تنگی کی ضد ہے)*۔ یَسَرَ و یَسُرَ الاَمْرُ ۔ معاملہ آسان اور سہل ہوا ۔ یَسَّرَ ۔ اس کام کو آسان یا سہل کر دیا ۔ تَیَسَّرَ واسْتَیْسَرَ ۔ آسان ہوا ۔ بآسانی مہیا ہوا * ۔ (۲/۱۹۶ ؛ ۳/۲۰ ؛ ۲/۱۹۳) ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کھل جانا اور ہلکا پھلکا ہونا لکھے ہیں۔ اَلْیَسَارُ ۔ بایاں ہاتھ ۔ بائیں جانب (یَمِیْنٌ کی ضد ہے) *۔ الیَسِیْرُ والمَیْسُوْرُ ۔ آسان ۔ سہل ۔ اَلْیَسِیْرُ ۔ تھوڑی چیز**۔ اَلْمَیْسَرَۃُ وَالْیَسَارُ ۔ تونگری ۔ آسودگی ۔ غنی** ۔ (۲/۲۸۰) ۔ اَلْمَیْسِرُ ۔ قمار ۔ جوا ۔ وہ اونٹ جو جوئے میں ہارا یا جیتا جاتا تھا *۔

قرآن کریم میں یُسْرٌ بمقابلہ عُسْرٌ آیا ہے (۲/۱۸۵) ۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے ۔ فَقُلْ لَّھُمْ قَوْلًا مَّیْسُوْرًا (۱۷/۲۸) ۔ ان سے نرمی سے بات کرو ۔ ایسی بات جو انہیں گراں نہ گذرے ۔ سورہ احزاب میں یَسِیْرًا (۳۳/۱۴) کے معنی ہیں کم از کم ۔ بہت تھوڑے ۔ قلیل تعداد میں ۔ ”کم وقت کے لئے یا کم تعداد میں“ دونوں معنی ہو سکتے ہیں ۔

سورہ بقرہ میں خَمْرٌ اور مَیْسِرٌ کے متعلق ہے فِیْھِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُھُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا (۲/۲۱۹) ۔ مَیْسِرٌ یُسْرٌ سے ہے جسکے بنیادی معنی آسانی ہیں ۔ اگرچہ عربوں میں مَیْسِرٌ ہر قسم کے جوئے کو کہتے ہیں ۔ اس جوئے کو بھی جو تیروں سے ایک خاص طریق سے کھیلا جاتا تھا اور جس میں اونٹ کے گوشت کے حصے بخرے کئے جاتے تھے ۔ لیکن اس کے مفہوم کو اسکے بنیادی معانی کے پیش نظر مقید نہ رکھا جائے تو ہر وہ مال جو انسان کو آسانی سے ہاتھ آجائے مَیْسِرٌ ہوگا ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔

اسکی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اگرچہ اس قسم کی دولت سے فائدے بھی حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اس سے انسانی طبیعت میں جو سستی اور کسل مندی، جو ضعف اور اضمحلال پیدا ہوتا ہے (دیکھئے عنوان ا۔ ث۔ م) اس کے نقصانات ان فوائد کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں جو اس روپے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس قسم کی دولت کو رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ کہکر اس سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ($\frac{۵}{۹۰}$)۔ اور اسے قرآن کریم کے نظام صلٰوۃ کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا موجب بتایا گیا ہے ($\frac{۵}{۹۱}$)۔ قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ انسان محنت اور کوشش سے کمائے اور جو کچھ اپنی ضروریات سے زائد ہو اسے نوع انسانی کی پرورش کے لئے عام کردے ($\frac{۲}{۲۱۹}$)۔ ظاہر ہے کہ جو دولت انسان کو آسانی سے بیٹھے بٹھائے ہاتھ آجائے وہ اسے محنت اور مشقت کا عادی نہیں رہنے دیگی اور اسطرح اس کی صلاحیتوں میں اضمحلال پیدا کرنے کا موجب بن جائیگی، جیسے ہر رئیس زادے کی حالت ہوتی ہے کہ وہ خود کمانے کا اہل ہی نہیں رہتا۔ اس طرح حاصل شدہ دولت سے انسان میں دولت کی ہوس اور زر پرستی کا جذبہ بڑھ جاتا ہے اور وہ دوسروں کو دینے کی بجائے زیادہ سے زیادہ اپنے لئے حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ جیسے ہر قمار باز کی کیفیت ہوتی ہے۔ لہذا ہر وہ دولت جو آسانی سے (بغیر محنت و مشقت) ہاتھ آجائے قرآنی تعلیم کی روح کے مطابق مَيْسِرٌ میں داخل ہے۔ بالخصوص عصر حاضر کی "تجارت" جو کہنے میں تجارت ہے لیکن درحقیقت میسر ہے۔ اور زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھئے تو سارا نظام سرمایہ داری ہی میسر ہے۔ اس میں ہر سرمایہ دار کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ محنت دوسرے کریں اور اس کا پھل یہ لے جائے۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ زندگی کی سہولتیں اور آسانیاں حاصل کرنا چاہتے ہو تو مشکلات کا سامنا کرو۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ($\frac{۹۴}{۵}$)۔ جو قوم (یا فرد) مشکلات کا سامنا کرنے سے گھبراتی ہے اسے وہ آسانیاں حاصل نہیں ہو سکتیں جو صحیح خوشگواریوں کا موجب بنتی ہیں۔ البتہ اسے وہ يُسْرٌ حاصل ہوجاتا ہے جو اثم (اضمحلال اور ضعف) کا موجب بنتا ہے اور تباہی و بربادی کی طرف لے جاتا ہے۔

یعقوب علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے حضرت اسحٰقؑ۔ اور حضرت اسحٰقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ تھے۔ اللہ تعالٰی نے آپ کا ذکر زمرۂ انبیائے کرامؑ میں

کیا ہے .... وَمَا أُنْزِلَ اِلٰی اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ .... (۲/۱۳۶) ۔ آپ کا لقب اِسْرَائِيْلُ (یعنی مردِ خدا) تھا ۔ اسی نسبت سے آپ کی اولاد (در اولاد) بنی اسرائیل کہلائی ۔ قرآن کریم نے بھی آپ کو اس لقب سے یاد کیا ہے ۔ مثلاً سورہ آل عمران میں ہے .... اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَائِيْلُ عَلٰی نَفْسِهٖ .... (۳/۹۲) ۔ "سوائے اس کے جسے اسرائیل نے اپنے آپ پر حرام قرار دے لیا تھا" ۔ اور سورہ مریم میں ہے مِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْرَائِيْلَ .... (۱۹/۵۸) ۔ ذریتِ ابراهیم اور اسرائیل سے" ۔

حضرت یوسفؑ آپ کے بیٹے تھے ۔

يَعُوْقُ

قوم نوح کا بت تھا (۷۱/۲۳) ۔ عرب کے لوگ اس بت کے نام سے بخوبی متعارف تھے ۔ چنانچہ قبیلہ بنو همدان اس نام کے ایک بت کی پرستش کیا کرتا تھا ۔

يَغُوْثُ

قوم نوح کا بت تھا (۷۱/۲۳) ۔ عرب کے لوگ اس بت کے نام سے بخوبی متعارف تھے ۔ چنانچہ خود عرب میں قبیلہ بنو مراد کے لوگ اس نام کے ایک بت کی پرستش کیا کرتے تھے ۔

يَقْطِيْن

اَلْيَقْطِيْنُ ۔ وہ بیل جو زمین پر پھیل جائے ۔ جیسے خربوزہ، تربوز، کدو کی بیلیں ۔ بعض نے کہا ہے کہ يَقْطِيْنٌ کدو کی بیل کو کہتے ہیں ۔ نیز اَلْيَقْطِيْنَةُ کدو کو کہتے ہیں *۔ صاحب تاج العروس نے یہ بھی کہا ہے کہ ہر وہ پودا جو ایک سال کے اندر ہی پیدا ہو کر ختم ہو جائے يَقْطِيْنٌ کہلائیگا ۔ نیز ہر بڑا پتہ يَقْطِيْنٌ کہلائیگا ۔ قرآن کریم میں شَجَرَةً مِنْ يَقْطِيْنٍ (۳۷/۱۴۶) آیا ہے ۔ اس سے مراد ہے چوڑے پتوں والا پودا جو سایہ دیتا ہو ۔

*تاج و راغب و محیط ۔

ی ق ظ

اَلْیَقَظَۃُ - بیداری - یہ نَوْمٌ (نیند) کی ضد ہے - اس میں ہوشیاری کا مفہوم بھی ہوتا ہے - رَجُلٌ یَقْظٌ وَ یَقِظٌ - بیدار آدمی - اسکی جمع اَیْقَاظٌ آتی ہے، بمقابلہ رُقُوْدٌ (۱۸/۱۸) - اَبُوالْیَقْظَانِ - مرغ کو کہتے ہیں *-

ی ق ن

یَقِنَ الاَمْرَ وَاَیْقَنَہٗ واسْتَیْقَنَہٗ وتَیَقَّنَہٗ - اس نے معاملہ کو جانا اور اسکی حقیقت معلوم کر لی - یَقْنٌ ویَقَنٌ - کسی بات کا واضح اور ثابت ہو جانا - یَقِیْنٌ - شَکٌّ کی ضد ہے - یعنی شک کا زائل ہو کر علم و تحقیق کے ساتھ کسی امر کا پایہ ثبوت تک پہنچ جانا *- مَوْتٌ کو بھی یَقِیْنٌ کہتے ہیں کیونکہ ہر مخلوق پر اس کا آنا یقینی ہے اور ٹھوس واقعات ہر روز اسکی شہادت دیتے ہیں *-

سورہ انعام میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق مذکور ہے کہ وہ کائناتی قوانین (مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) کے مشاہدہ کے بعد یَقِیْنٌ کے درجہ تک پہنچ گئے (۶/۷۵) - سورہ حجر میں جہاں فرمایا کہ وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ (۱۵/۹۹) - تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تو اپنے نشو و نما دینے والے کے قانون ربوبیت کا کامل اتباع کئے جا، حتکہ کہ تیرا دعوی (کہ اس نظام کے نتائج حیات بخش اور خوشگوار ہونگے) ایک ٹھوس واقعہ کی شکل میں سامنے آجائے (نیز ۷۴/۴۷) -

لہذا ایْمَانٌ کے معنی ہونگے کسی پر اعتماد کرکے اسکی بات کو صحیح مان لینا اور یَقِیْنٌ کے معنی ہونگے علم و تحقیق کے بعد اس بات کا ثابت ہو جانا اور اس کا ٹھوس واقعہ کی شکل میں سامنے آجانا - لَتَرَوُنَّھَا عَیْنَ الْیَقِیْنِ (۱۰۲/۷) - تم اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لوگے - قرآن کریم نے جب مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ آخرت (مستقبل) پر یقین رکھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی سعی و عمل کے ٹھوس نتائج ان کے سامنے آجاتے ہیں - یعنی پہلے وہ اپنے نظام کے ان دیکھے نتائج پر ایمان لاتے ہیں (۲/۳) - اس کے بعد جب وہ اس نظام کو قائم کر لیتے ہیں تو اس کے بدیہی نتائج مرئی اور محسوس شکل میں ان کے سامنے آجاتے ہیں - اس طرح ان کا ایمان، یقین میں بدل جاتا ہے (۲/۴) - یہ ہیں مستقبل پر یقین کے معنی - اسی

*تاج -

یقین سے انسان اس امر پر ایمان لے آتا ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی (آخرت) بھی ایک حقیقت ثابتہ ہے ۔

ہم نے '' ایمان'' اور '' یقین'' میں جو امتیازی خط کھینچا ہے وہ دونوں الفاظ کا الگ الگ مفہوم سمجھانے کے لئے ہے ۔ ورنہ ایمان ، خود یقین ہی کا نام ہے ۔ اور یقین ، ایمان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا ۔ یہ دونوں مرادف المعنی بھی ہو جاتے ہیں ۔ یا آپ کہہ سکتے ہیں کہ '' یقین '' '' ایمان '' کے نتائج کو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے ۔

ی م م

اَلْیَمَامُ ۔ قصد کرنا * ۔ اَلْیَمُّ ۔ دریا ۔ سمندر کو بھی کہتے ہیں* ۔ (۲۰/۳۹ ; ۲۸/۷ ; ۲۸/۴۰) ۔

اَلتَّیَمُّمُ ۔ کسی کام کا ارادہ کرنا ، قصد کرنا * ۔ (۲/۲۶۷ ; ۴/۴۳ ; ۵/۶) (دیکھئے عنوان م ۔ س ۔ ح)

ی م ن

اَلْیُمْنُ ۔ برکت ۔ اَلْمَیْمَنَةُ ۔ برکت ۔ دائیں جانب ۔ اَلْیَمَنُ ۔ دائیں جانب ۔ اَلْیَمِیْنُ ۔ دایاں ہاتھ ۔ دائیں جانب ۔ (یَسَارٌ کی ضد ہے) ۔ نیز اس کے معنی قوت کے ہیں ** ۔ یَمِیْنٌ ۔ جمع اَیْمَانٌ ۔ قسم ۔ اس لئے کہ عرب قسم کھاتے وقت اپنا دایاں ہاتھ دوسرے کے دائیں ہاتھ پر مارتے تھے* ۔

سورہ کہف میں ہے ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ (۱۸/۱۸) ۔ یعنی دائیں بائیں ۔ سورہ قصص میں ہے مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ (۲۸/۳۰) ۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ '' وادی کے دائیں کنارے سے '' اور یہ بھی کہ '' مبارک وادی کے کنارے سے '' ۔

قسم کے معنوں میں یہ لفظ (اَیْمَانُکُمْ) متعدد مقامات پر آیا ہے ۔ (مثلاً ۲/۲۲۴) ۔ نکاح کے لئے عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ کے الفاظ آئے ہیں (۴/۳۳) ۔ یعنی تمہارے عہد و پیمان بندھے اور مستحکم ہوئے ۔

برکت کے لئے اَصْحَابَ الْیَمِیْنِ (۵۶/۲۷) ۔ اور اَصْحَابُ الْمَیْمَنَةِ (۵۶/۸) آیا ہے ۔ لیکن اس کے معنی '' دائیں جانب والے '' بھی ہو سکتے ہیں ۔

*تاج و محیط ۔ **ابن قتیبہ ۔ (القرطین ج/۲ ۔ صفحہ ۱۸۰)

نیز اَلطُّوْرِ الْاَیْمَنِ (۵۲/۲۰) - زور اور قوت کے معنوں میں سورہ صٰفّٰت میں ہے فَرَاغَ عَلَیْهِمْ ضَرْبًا بِالْیَمِیْنِ (۹۳/۳۷) - (ابراھیمؑ) نے ان بتوں پر پوری قوت سے بھرپور وار کیا۔ اسی سورۃ میں ذرا پہلے ہے قَالُوْا اِنَّکُمْ کُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْیَمِیْنِ (۲۸/۳۷) - وہ کہینگے تم ہمارے پاس بڑی قوت اور زبردست ذرائع کے ساتھ آیا کرتے تھے - (اور اسطرح ہمیں حق کے راستے سے روک دیا کرتے تھے)۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے - مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ - اس کے لفظی معنی ہیں " جن کے مالک تمہارے دائیں ہاتھ ہو چکے " - بعض مقامات پر اس کے معنی ہیں وہ لوگ جو کسی کے ماتحت کام کریں - کسی کے تابع فرمان ہوں - (مثلاً ۳/۴ میں) - لیکن بعض مقامات پر اس کے معنی غلام اور لونڈیاں ہیں - سورہ نور میں ہے وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتَابَ مِمَّامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ (۳۳/۲۴) - تمہارے غلام اور لونڈیوں میں سے جو تم سے مکاتبت کریں - یعنی ایک معاہدہ کے تحت آزادی کی تحریر مانگیں -

اسلام سے پہلے عرب میں غلاموں اور لونڈیوں کا عام رواج تھا - غلام باھر کا کام کاج کیا کرتے تھے اور لونڈیوں کو وہ لوگ گھروں میں ڈال لیتے تھے - یہ وہ معاشرہ تھا جس میں اسلام نمودار ہوا - جب یہ لوگ مسلمان ہوئے تو ان کے ہاں غلام اور لونڈیاں موجود تھے - اسلام غلامی کو مٹانے کے لئے آیا تھا لیکن اگر وہ ان غلاموں اور لونڈیوں کو (جو اُسوقت موجود تھے) یک لخت آزاد کر دینے کا حکم دیتا تو اس سے معاشرہ کا توازن بگڑ جاتا - یہ جوان لونڈیاں (اتنی بڑی تعداد میں) جب خاوندوں کے بغیر آزاد کر دی جاتیں تو وہ معاشرہ کے لئے سخت خرابیوں کا موجب بن جاتیں - اسلام نے اس صورت حالات کو برقرار رہنے دیا اور آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند کر دیا - لیکن جو غلام اور لونڈیاں اس وقت موجود تھیں ان کے متعلق ایسے احکام دیئے کہ وہ رفتہ رفتہ آزاد ہو کر معاشرہ کا جزو بننے جائیں اور جب تک غلام رہیں ان سے انسانوں جیسا سلوک کیا جائے - مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ کے ماتحت لونڈی غلاموں کے متعلق قرآن کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ انہی لونڈی غلاموں کے متعلق ہے - ان کے بعد لونڈی غلاموں کا سلسلہ بھی بند ہو جانا تھا اسلئے یہ احکام بھی نافذ العمل نہیں رہنے تھے - البتہ اگر اس دور کے بعد کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے جس میں کوئی ایسی قوم مسلمان ہو جائے جن میں پہلے سے لونڈی غلام موجود ہوں تو ان غلاموں پر یہی احکام نافذ ہو جائینگے -

مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ" کی مندرجہ بالا تشریح کی روشنی میں قرآن کریم کے مختلف مقامات کو دیکھئے - بات صاف ہو جائے گی کہ یہ احکام اُسوقت کے لونڈی غلاموں کے متعلق ہیں - اور بس - مثلاً وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ - اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ (۲۹-۳۰/۲۳) - وہ لوگ جو اپنی پاکدامنی کی حفاظت کرتے ہیں اور صرف اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہیں یا ان لونڈیوں کے پاس جن کے وہ مالک بن چکے ہیں (قرآن کریم میں ہر جگہ یہ لفظ ماضی کے صیغے میں آیا ہے) - مزید تفصیل کے لئے عنوان (م - ل - ک) دیکھئے -

ہماری بدبختی کہ مسلمان سلاطین نے غلاموں اور لونڈیوں کا دروازہ کھول لیا اور قرآن کریم کی انہی آیات (اور موضوع روایات) کو اپنے عمل کے جواز کے لئے بطور سند پیش کر دیا - قرآن کریم پر اس سے بڑا اتہام اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس سے غلامی کا جواز ثابت کیا جائے -

ی ن ع

يَنَعَ الثَّمَرُ - يَيْنَعُ - يَنْعاً - پھل کا پک کر بالکل تیار اور توڑنے کے قابل ہو جانا - اَلْيَنِيْعُ - پوری طرح پکا ہوا پھل - اليانع - پختہ پھل - سرخ *- قرآن کریم میں ہے - وَيَنْعِهٖ (۶/۱۰۰) پھل کا پکنا - اس کا سرخ ہونا -

یہود

قوم بنی اسرائیل - تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان "موسےٰ" اور عنوان (ھ - و - د)

یوسف علیہ السلام

حضرت ابراھیم کے بیٹے حضرت اسحٰق - آپ کے بیٹے حضرت یعقوب اور ان کے بیٹے حضرت یوسف - قرآن کریم نے آپ کا تذکرہ جلیلہ ایک ہی سورۃ میں مسلسل بیان کیا ہے (اور کسی نبی کا تذکرہ اس طرح مسلسل بیان نہیں ہوا) - بچپن میں بھائیوں نے انہیں ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا (۱۲/۱۵) - جہاں سے اُنہیں ایک قافلے والے مصر لے گئے - وہاں آپ (مختلف مراحل طے کرنے کے بعد) ، مملکت کے اقتدار و اختیار کے مالک ہو گئے (۱۲/۵۶؛ ۱۲/۱۰۱)

---

*تاج و محیط و راغب

اور اپنے والدین اور دیگر اہل خاندان کو بھی وہیں بلا لیا ۔ اس طرح بنی اسرائیل (یعنی حضرت یعقوبؑ کی اولاد) کنعان سے مصر کی طرف منتقل ہو گئی ۔

سورہ انعام میں حضرت یوسفؑ کا نام انبیاء کرام کے زمرہ میں آیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْسُفَ وَ مُوْسٰی وَ ھٰرُوْنَ ۔ ۔ ۔ ۔ ($\frac{6}{85}$) ۔ اور سورہ مؤمن میں ، دربار فرعون کا مردِ مؤمن اپنی تقریر میں حضرت یوسفؑ کا ذکر ایک رسول کی حیثیت سے کرتا ہے ۔ ($\frac{40}{34}$) ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنا پیغام جو بینات پر مشتمل تھا قوم مصر تک پہنچایا تھا ۔

(حضرت یوسفؑ کے کوائف حیات اور ان کے حسنِ سیرت کی داستانِ نور پاش ، میری کتاب ''جوئے نور'' میں ملیگی) ۔

ی و م

یَوْمٌ ۔ دن ۔ طلوع آفتاب یا طلوع فجر صادق سے غروب آفتاب تک کا وقت ۔ یہ لفظ عربوں کے ہاں مطلقاً وقت اور زمانہ کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ دن اور رات کی اس میں کوئی قید نہیں ہوتی ۔ صبح اور شام کی گردش بھی یَوْمٌ ہے (یعنی ایک دن) ۔ سال بھی ۔ ایک صدی بھی ۔ ہزار سال اور پچاس ہزار سال بھی ۔ وَقْتٌ اور سَاعَۃٌ کی طرح یَوْمٌ کے بعد بھی اِذٍ بڑھا دیا جاتا ہے ۔ اور یَوْمَئِذٍ کے معنی تقریباً وہی ہوتے ہیں جو وَقْتَئِذٍ اور سَاعَتَئِذٍ کے ہوتے ہیں* ۔ گویا وَقْتٌ ۔ سَاعَۃٌ اور یَوْمٌ ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں ۔ یَوْمٌ کی جمع اَیَّامٌ ہے* ۔ ابن فارس نے یَوْمٌ کے معنے دن بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ استعارۃً یہ لفظ امر عظیم کے لئے بھی بولا جاتا ہے ۔

نیز اس کے معنی ہیں حکومت اور دولت اور زمانہ' ولایت** ۔ تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ ($\frac{3}{139}$) میں اَیَّامٌ کے معنی حکومت و سلطنت کے لئے گئے ہیں** ۔

اَیَّامٌ ۔ وقائع (یعنی تاریخ کے ناقابل فراموش واقعات یا معرکے) کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً اَیَّامُ الْعَرَبِ کے معنی وَقَائِعُ الْعَرَبِ ہیں** ۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں اَیَّامُ اللّٰہِ انہی معانی میں آیا ہے ۔ مثلاً وَذَکِّرْھُمْ بِاَیّٰمِ اللّٰہِ ($\frac{14}{5}$) ۔ حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے

---

*محیط ۔ **تاج ۔

معرکہ کے لئے آیا ہے ۔ یہ اَیّامُ اللّٰہِ اس لئے وقوع پذیر ہوتے ہیں لِیَجْزِیَ قَوْمًا بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۴۵/۱۴) ۔ تاکہ کسی قوم کو اس کے کئے کی سزا مل جائے ۔ اسی لئے بعض اہل لغت نے اَیّام کے معنے عقوبتیں اور سزائیں بھی کئے ہیں* ۔

کائنات میں خدا کا قانون ارتقاء جاری و ساری ہے ۔ اس کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ خدا اپنے امر (ابتدائی قانون مشیت ۔ دیکھئے عنوان ش ۔ ی ۔ أ) کے مطابق جب کسی اسکیم کو بروئے کار لانے کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے اس کا مکمل پلان اپنے عالم امر (السماء) میں مرتب کرتا ہے ۔ پھر اس پلان کو عملاً متشکل کرنے کے لئے اس کی ابتداء پست ترین نقطہ سے کرتا ہے ۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ۔ پھر وہ اسکیم اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اوپر کو اٹھتی ہے ۔ یہ منازل ایک ایک یَوْم میں طے ہوتے ہیں جو انسانی حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے ۔ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲/۵) ظاہر ہے کہ یہاں "یوم" سے مراد دور یا مدت یا زمانہ یا تدریجی مرحلہ ہے ۔ یہی دور بعض اوقات پچاس پچاس ہزار سال کا بھی ہوتا ہے (۷۰/۴) ۔ علمائے طبقات الارض یا محققین نظریہ ارتقاء اس کی شہادت دینگے کہ یہ تدریجی مراحل کتنے کتنے طویل المیعاد ہوتے ہیں ۔

لہذا قرآن کریم میں جہاں یَوْم کا لفظ آئے گا تو ہر جگہ اس کے معنے اس "دن" کے نہیں ہوں گے جو چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے ۔ اس کے معنی وقت (Time) یا دور (Period) یا زمانہ (Age) یا کسی خاص مدت یا حالت (Stage) کے ہوں گے ۔ مثلاً مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ (۱/۴) کے معنے ہونگے وہ دور جس میں تمام مخالف قوتیں شکست کھا جائیں اور غلبہ و اقتدار صرف قانون خداوندی کا رہ جائے ۔ یا وہ دور جس میں انسانی اعمال کے نتائج عدل و انصاف کی رو سے مرتب ہوں ۔ یا ظہور نتائج کا وقت ۔ وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (۸۲/۱۹) ۔ جس دور میں حکومت صرف خدا کے قانون کی ہوگی ۔ (مزید تصریح د ۔ ی ۔ ن کے عنوان میں دیکھئے) ۔

یونس علیہ السلام

حضرت یونس انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں ۔ ان کا عبرانی نام یوناہ تھا جو عربی میں آ کر یونس ہو گیا ۔ تورات میں ان کا نوشتہ "کتاب یوناہ"

*تاج ۔

کے نام سے موجود ہے ۔ ان کا زمانہ اندازاً ۷۰۰ ق ۔ م کا قیاس کیا جاتا ہے ۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۔ ۔ ۔ ۔ (۳۷/۱۳۹) ۔

تورات (صحیفہ یوناہ) میں آپ کے متعلق تفصیلی تذکرہ آیا ہے ۔ لیکن (تورات کے عام انداز کے مطابق) اس میں بہت کچھ ایسا بھی ہے جو خدا کے کسی رسول کے شایانِ شان نہیں ہو سکتا ۔ قرآن کریم نے اتنا ہی بتایا ہے کہ آپ اپنی قوم سے خشمناک ہو کر کسی دوسری طرف جانے کے ارادہ سے نکلے ۔ راستہ میں کشتی میں سوار ہو گئے ۔ کشتی طوفان میں پھنس گئی ۔ ملاحوں نے (غالباً) فیصلہ کیا کہ کچھ سواریوں کو دریا میں پھینک دیا جائے تاکہ کشتی کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور باقی مسافر محفوظ رہجائیں ۔ آپ کو بھی حوالۂ دریا کر دیا گیا جہاں آپ کو ایک بڑی مچھلی نے دبوچ لیا ۔ لیکن آپ صحیح و سلامت کنارے تک آپہنچے ۔ دیکھئے (۲۱/۸۷-۸۸ ; ۳۷/۱۳۹-۱۴۶) ۔

حضرات انبیاء کرام[ؑ] کا یہ عام طریق رہا ہے کہ جب وہ دیکھیں کہ ان کا اپنا وطن ان کے نظام کے لئے سازگار نہیں تو وہ وہاں سے ہجرت کر کے اس علاقے کیطرف چلے جاتے تھے جہاں کی فضا ان کے مشن کے لئے مساعد ہوتی تھی ۔ لیکن یہ ہجرت خدا کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق ہوتی تھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس[ؑ] نے اپنی قوم سے ، اپنے اجتہاد کے مطابق ، ہجرت کر لی اور ان کا یہ فیصلہ خدا کے پروگرام کے مطابق نہیں تھا ۔ قبل از وقت تھا ۔ اس لئے وہ بعد میں اس پر نادم ہوئے (۳۷/۱۴۲) ۔ نبی اکرم[ؐ] سے کہا گیا کہ آپ نے صاحب حوت کی طرح نہ ہو جانا (۶۸/۴۸) [نیز دیکھئے عنوان ا ۔ ب ۔ ق]

قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ جس بستی (نینوا) کیطرف آپ کو رسول بنا کر بھیجا گیا تھا اسکی آبادی ایک لاکھ سے بھی اوپر تھی ۔ (یعنی اس زمانہ کے اعتبار سے وہ بہت بڑا شہر تھا) (۳۷/۱۴۷) ۔ انہوں نے آپ کی دعوت سے انکار کیا لیکن قبل اس کے کہ ان پر عذاب آ جاتا ، وہ ایمان لے آئے اور اس طرح انہیں مہلت مل گئی (۳۷/۱۴۸) ۔ اہل نینوا اس وقت تو تباہی سے بچگئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد (قریب ۶۹۰ ق ۔ م میں) انہوں نے پھر وہی شیوہ اختیار کر لیا ۔ بنی اسرائیل کے ایک اور نبی نے (جن کا ذکر قرآن کریم نے نہیں کیا لیکن یہود کی روایات میں ان کا پتہ ملتا ہے) اُنہیں خدا کے عذاب سے متنبہ کیا ۔ وہ باز نہ آئے تو ایک طرف سے اہل بابل نے ان پر حملہ کیا اور دوسری طرف سے دریا میں سخت سیلاب آیا ۔ اور اس طرح نینوا کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ گیا ۔

قرآن کریم نے آپ کو ذَا النُّوْنِ (۲۱/۸۷) اور صَاحِبِ الْحُوْتِ (۶۸/۴۸) کہکر بھی پکارا ہے ۔

الحمد للہ

کہ

لغات القرآن کی چوتھی (اور آخری) جلد بھی مکمل ہو گئی۔ اس کے بعد اس کا تتمہ آپ کے سامنے آئیگا جس میں، پوری لغات پر نظر ثانی کے بعد، ضروری اضافے اور ترمیمات کی گئی ہیں۔

اللہ کا شکر ہے

کہ

اس لغات کی تکمیل سے میری عمر بھر کی محنت محفوظ ہو گئی۔ اب "مفہوم القرآن" کی طباعت کا سلسلہ شروع ہو گا۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ لغات القرآن اور مفہوم القرآن کی موجودگی میں، قرآن کریم کے سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہیگی۔

یہ بہرحال

ایک انسانی کوشش ہے جس میں سہو اور خطا کا ہر وقت امکان ہوتا ہے۔ مینے قرآن فہمی کے سلسلہ میں یہ ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ دیگر ارباب ذوق اور علم دوست حضرات، مزید غور و تدبر سے، اسے بہتر بنا سکتے ہیں۔ قرآن کریم میں غور و فکر کا سلسلہ تو کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس باب میں کسی انسان کا قول بھی حرف آخر نہیں کہلا سکتا۔ والسلام۔

پرویز